تاریخ سلطنتِ مسلمانانِ روس

مزمل یٰسین

انجمن ترقی اردو

بابائے اردو روڈ

کراچی۔۱

تاریخِ سلطنتِ مسلمانانِ روس

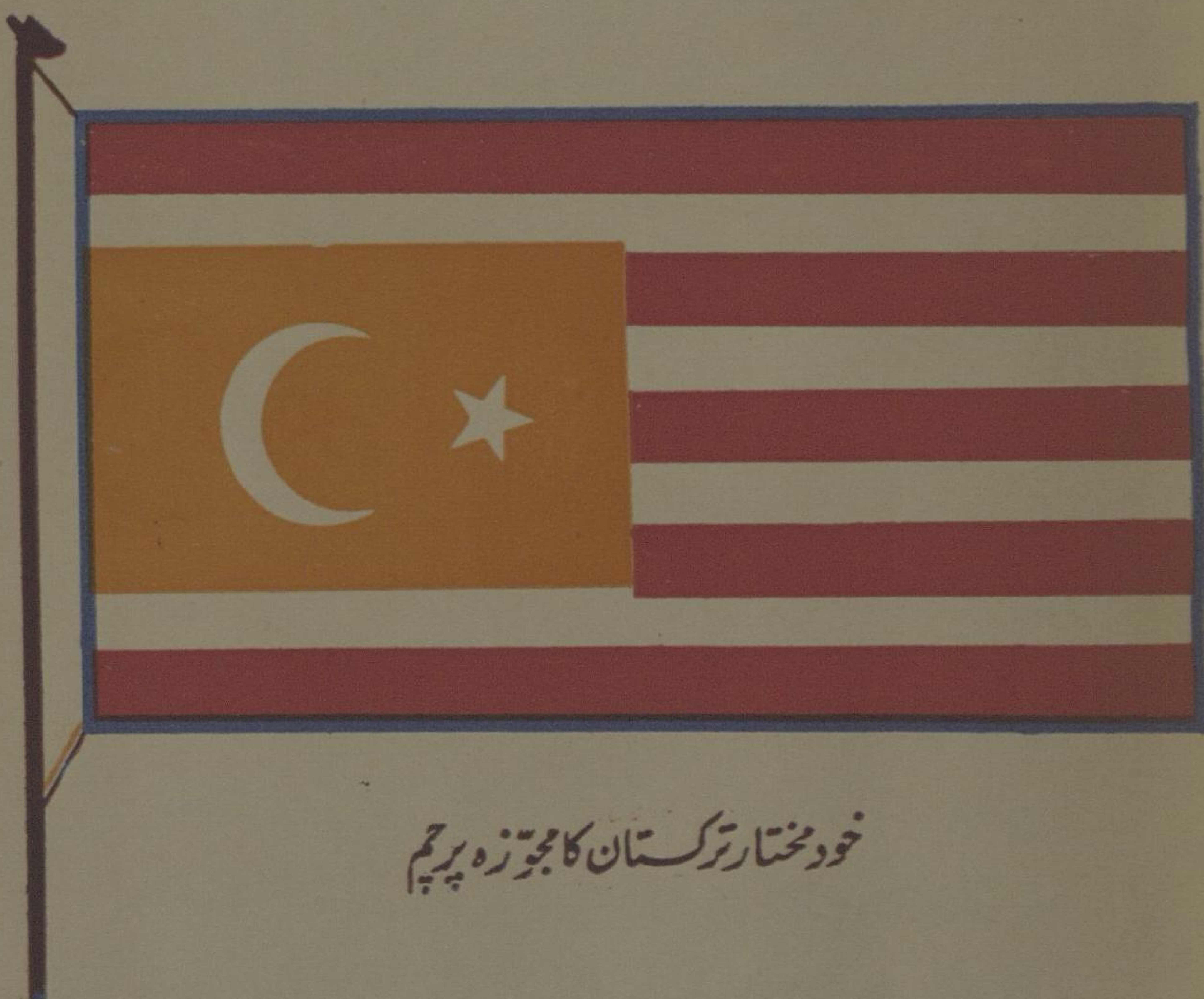
مزمّل یٰسین

انجمن ترقی اردو پاکستان
بابائے اردو روڈ۔ کراچی ۱

سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقی اردو ۳۳۱

اشاعت اوّل	۱۹۶۸ء
تعداد	چھ سو
طباعت	انجمن پریس کراچی

قیمت
دس روپے



خود مختار ترکستان کا مجوزہ پرچم

فہرست مضامین

تصویریں اور نقشے

تصویریں

نقشے

(یہ تینوں نقشے کتاب کے آخر میں شامل ہیں)

مقدمہ

سید حسام الدین راشدی

روسی مسلمانوں کی سیاسی تاریخ میں نے شروع سے آخر تک بغور پڑھی۔ بڑی محنت سے لکھی گئی ہے اور مطالب کا احاطہ پورے طور پر کیا گیا ہے۔ یہ تاریخ روسی علاقے میں جو ترک قبائل آباد ہیں، ان کی سیاسی جد وجہد اور نشاۃ ثانیہ کے حالات پر مشتمل ہے۔ انیسویں صدی سے لے کر ۱۹۱۷ء کے انقلاب تک کا نقشہ اس میں پیش کیا گیا ہے۔

زبان اور انداز بیان اتنا دلچسپ ہے کہ کتاب پڑھتے وقت ذہن پر بوجھ ڈالنے کی بجائے ناول کی سی کشش پیدا کرتی ہے۔ شروع سے آخر تک کتاب کی یہی کیفیت ہے۔ ایک مولف کے لئے اس سے زیادہ اور کیا کامیابی ہو سکتی ہے کہ وہ ٹھوس مضمون کو دلچسپ پیرائیہ بیان میں ادا کر جائے اور مطلب خبط ہونے نہ پائے۔

ہم پاکستانی مسلمان اپنے مطالعہ کو اس حد تک محدود کر چکے ہیں کہ سوائے چند مقامی موضوعات کے باقی دنیا کے حالات سے قطعی نابلد اور محروم ہیں۔ جس کا نتیجہ بڑا المناک نکلا ہے۔ یعنی ذہنی نشو ونما بند ہو چکی ہے۔ عام معلومات کا فقدان ہے۔ اس لئے تصنیف وتالیف کی قوتیں سلب ہوتے ہوتے اب ماند پڑ گئی ہیں ۔

ہماری مثال کھڑے پانی والے تالاب کی سی ہے۔ نیا پانی نہ آنے کی وجہ سے کھڑا پانی متعفن ہو چکا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہم نے پاکستانی دور کے انیس برس میں ایک کتاب بھی ایسی نہیں لکھی جو پائدار کہی جا سکے۔ ہم تاریخ اور دوسرے ٹھوس مضامین سے گھبراتے ہیں۔ ذہنی کاہلی کی وجہ سے آسان ادبی مضامین سے جی بہلاتے ہیں۔ اس نزاکت طبع نے اتنی علمی بے مائگی پیدا کر دی ہے کہ موجودہ دنیا کے علمی اجتماعات میں ہم شامل ہونے کے قابل نہیں رہے۔ ہم مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن اپنی مسلم برادری سے بیگانہ اور ان کے حالات سے قطعی بے خبر ہیں۔ ہم نہیں جانتے کہ دوسرے ممالک کے مسلمانوں کی نئی تاریخ کیا ہے۔ انہوں نے دنیا کے نئے انقلاب میں کیا حصہ لیا ہے انیسویں صدی اور بیسویں صدی کے نصف تک ان پر کیا گزری ہے۔ کن کن مشکلات سے وہ عہدہ برآ ہوئے ہیں اور ان انقلابات اور جد و جہد کے کڑے امتحانات سے گزرنے کے بعد ان کے ذہنی افکار و رجحان کس طرح ڈھلے ہیں۔ میرے خیال میں یہ ہماری سب سے بڑی بدقسمتی ہے۔ جب تک ایک دوسرے کے حالات و کیفیات سے قومیں بے خبر رہتی ہیں اس وقت تک ہم آہنگی اور یگانگی پیدا ہونا خلاف فطرت ہے۔

اردو زبان، اس وقت ہماری قومی زبان کہلائی جا رہی ہے لیکن ہم نے اس کو ایسے مضامین سے محروم کر رکھا ہے جن سے زبان میں استحکام و وسعت، پرمائگی اور آبرو بڑھتی ہے۔ ہم نے اسے بے مقصد اشعار، بے مقصد افسانوں اور بے معنی ادبی چیزوں سے، چھوئی موئی بنا دیا ہے۔ اگر یہی صورت حال رہی تو اس زبان کے پنپنے اور اس دنیا میں آبرومندانہ مقام پانے کا مسئلہ ناممکن نظر آتا ہے۔ ضرورت ہے کہ ہم کوشش کریں کہ کچھ عرصہ کے لئے دواوین اور ادبی مقالات کے پشتاروں کو پس پشت ڈال کر ذہنی بلندی اور افکار کی حیاتِ نو کے لئے ٹھوس اور صحت مندانہ موضوعات

پر کتابیں لکھیں اور چھپوائیں۔

زیرِ تبصرہ کتاب جدید تاریخ کی کتاب ہے اور بڑی ہی بالغ نظری سے لکھی گئی ہے اگر یہ شائع ہوئی تو میرے خیال میں مندرجہ بالا دونوں مقاصد کے حصول کی طرف ہمارا پہلا قدم ہوگا۔ یعنی معاصر مسلمانوں کے حالات اور تاریخ سے ہماری واقفیت بڑھے گی اور دوسرے یہ کہ اردو زبان میں ایک صحت مندانہ موضوع پر ٹھوس کتاب شائع ہوگی۔

میں نے اردو کے جدید دور میں یہ پہلی کتاب دیکھی ہے، اگر اس قسم کی کوئی دوسری کتابیں چھپی بھی ہیں تو وہ زیادہ تر سطحی معلومات پر مبنی ہیں اور اخباری انداز کی ہیں۔ اس کتاب کے پڑھنے کے بعد مطالعہ کنندہ اپنے آپ کو روسی مسلمانوں کی انیسویں صدی کی تاریخ سے اس طرح آشنا پاتا ہے کہ گویا وہ خود اس ساری جدوجہد اور معاملات میں ان کے ساتھ شامل ہے۔

میں مولف کو اس کتاب کی تالیف میں جو انہوں نے زحمت اٹھائی ہے اور جس طریقے سے مسائل کو کامیابی سے نباہا ہے اس پر صدقِ دل سے مبارک باد دیتا ہوں اور ان کی خدمت میں یہ عرض کرتا ہوں کہ وہ اپنی صلاحیتوں سے مزید کام لیں اور روسی مسلمانوں کی تاریخ کے بعد دیگر ممالک کے ترکوں کے متعلق بھی اس نوعیت کی کتاب لکھیں بلکہ اپنے آپ کو اس موضوع کا متخصص بنائیں۔



سمرقند میں امیر کا داخلہ



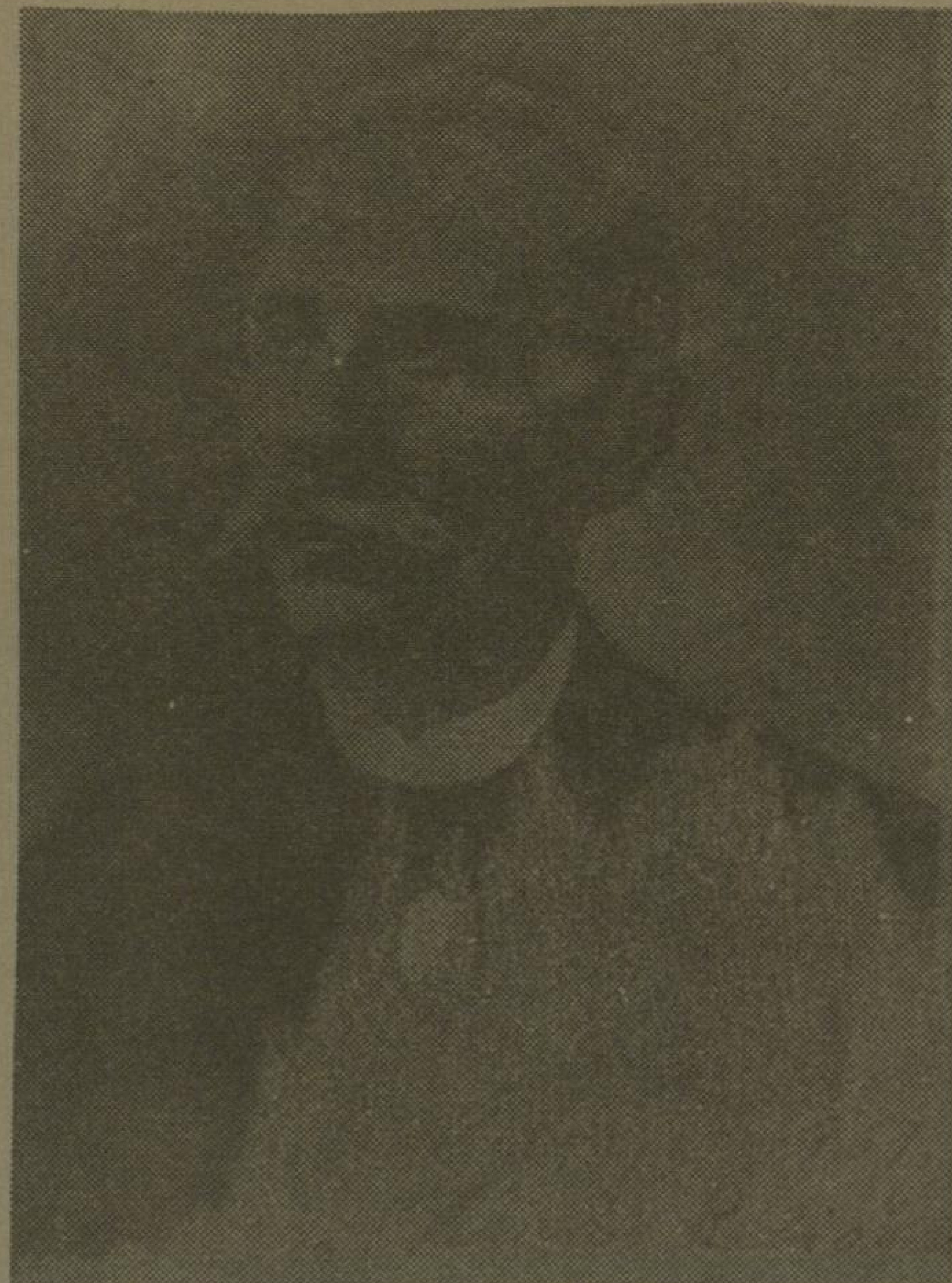
جنگلی سوروں پر حملہ



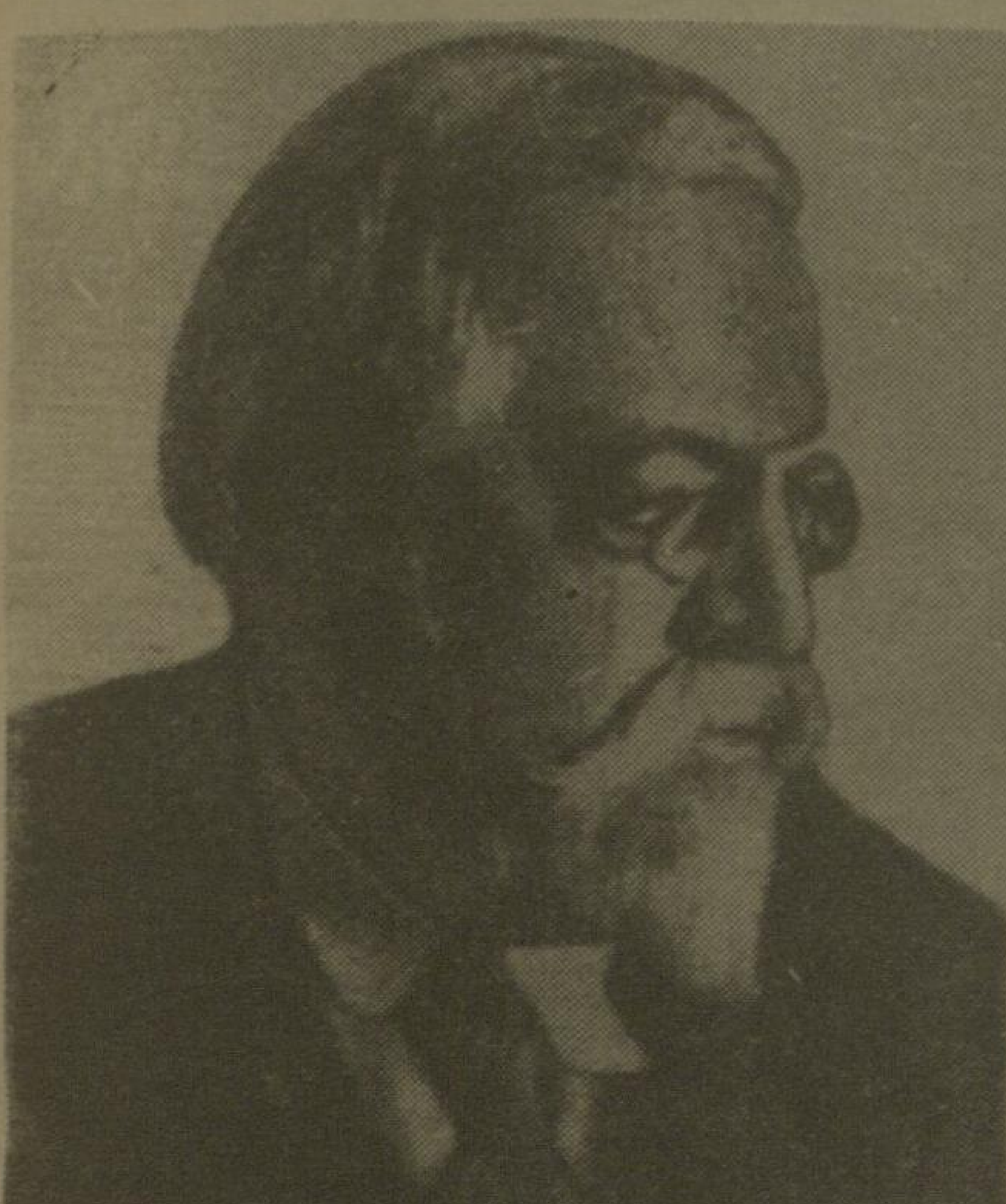
تاتاریوں کی تگ و دو، ایک دلہن کے لیے



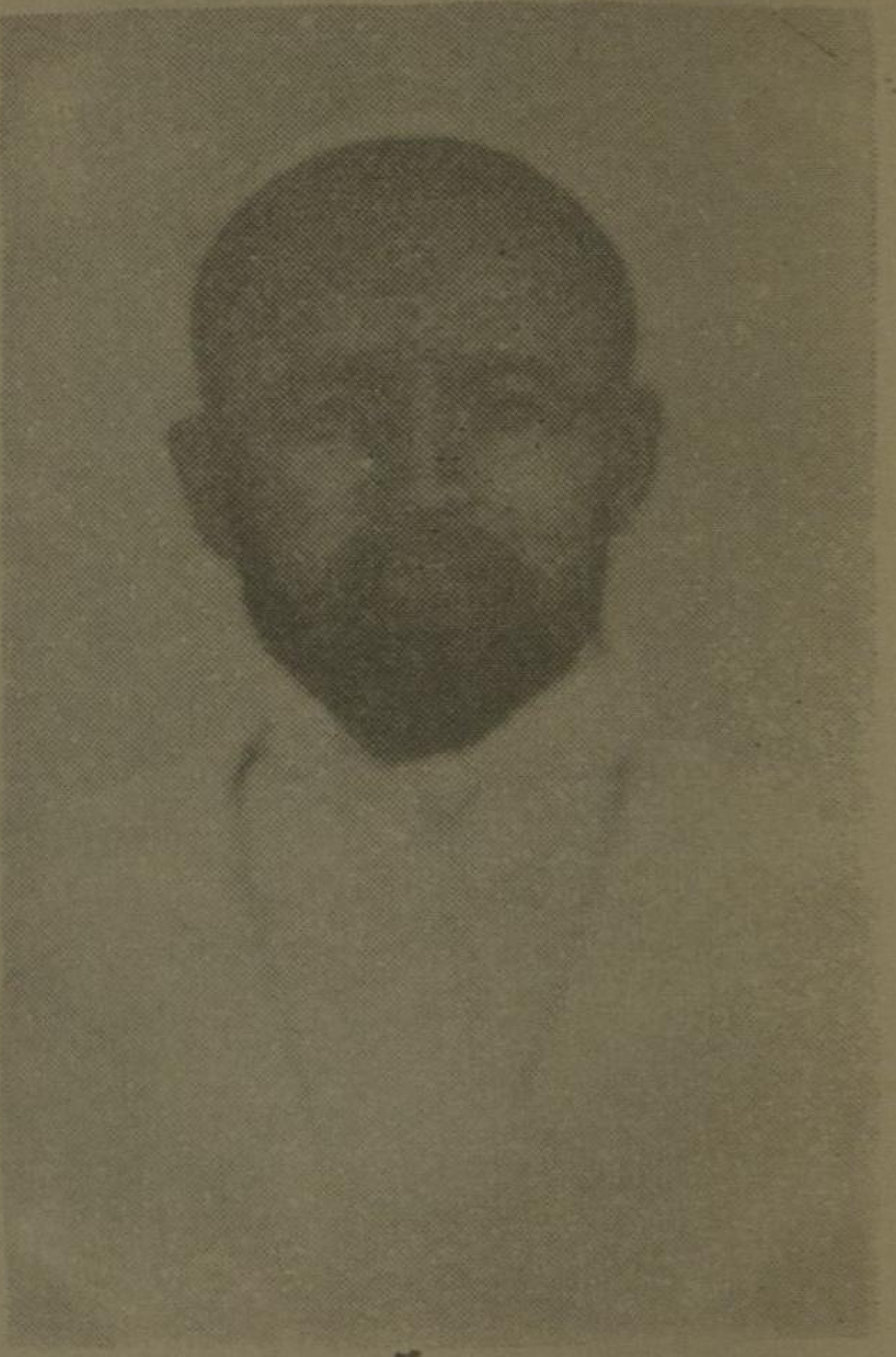
اُزبکوں کا بازار



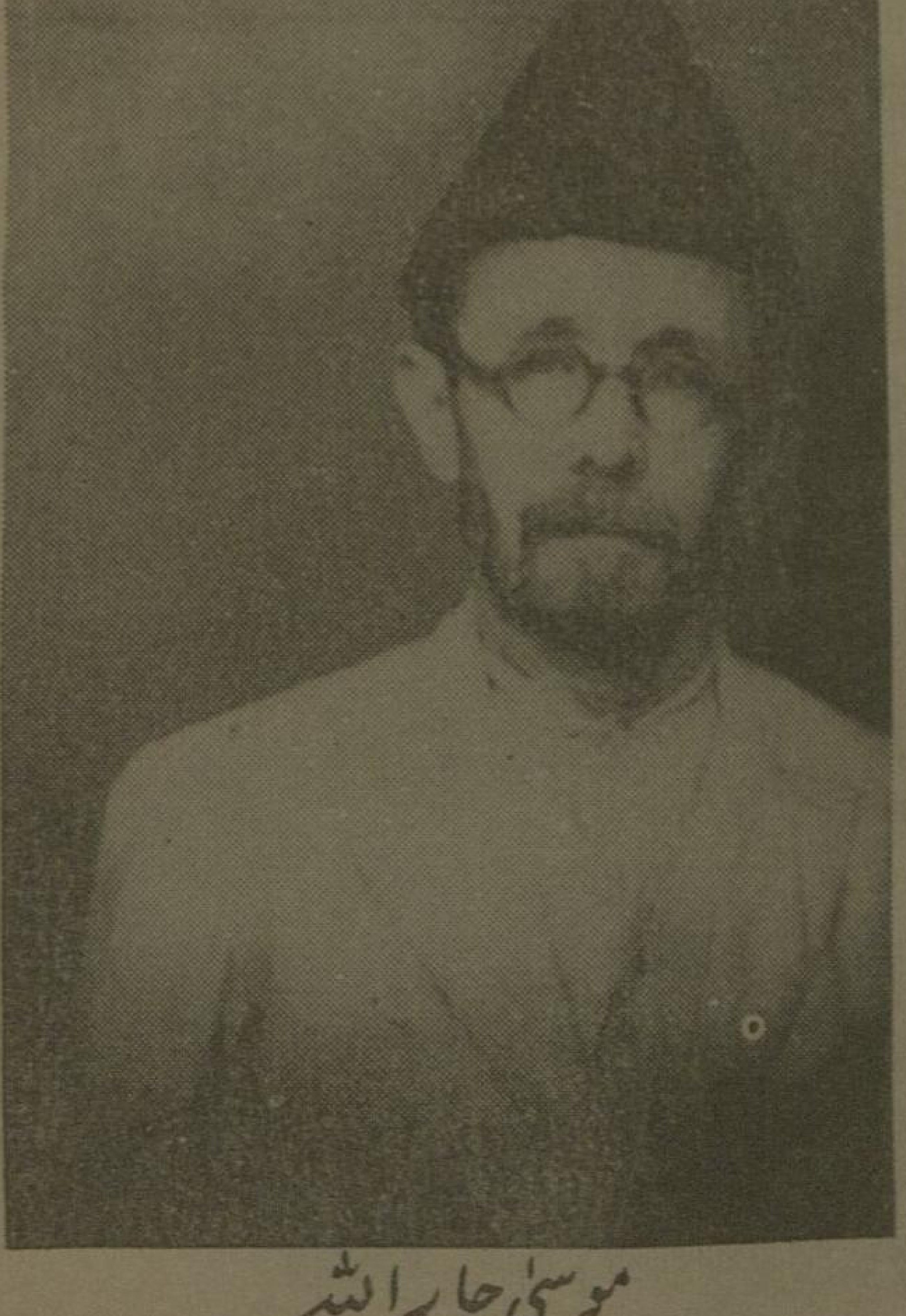
اسماعیل گیپرالی



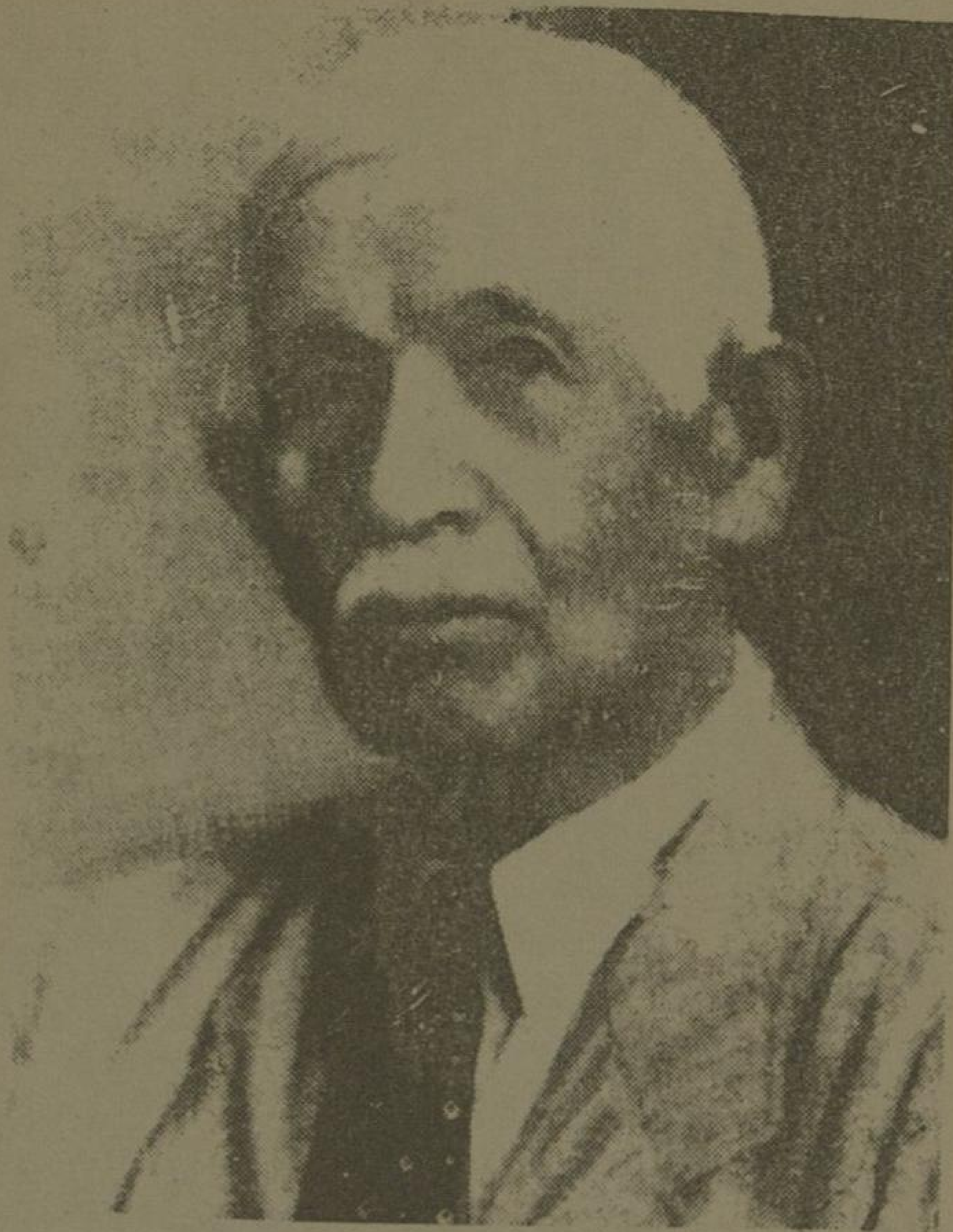
یوسف آقچورا



صدری مقصودی



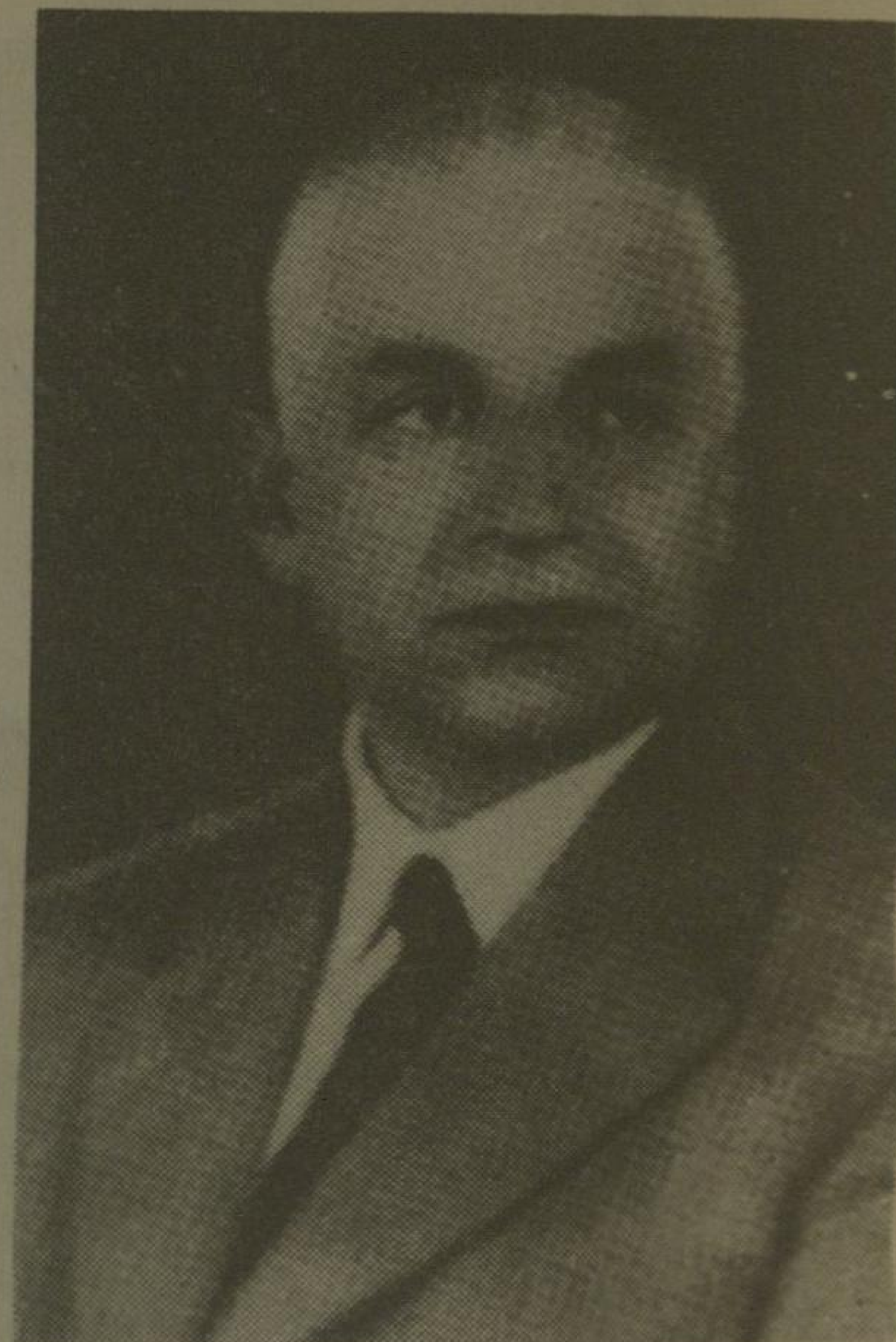
موسیٰ جار اللہ



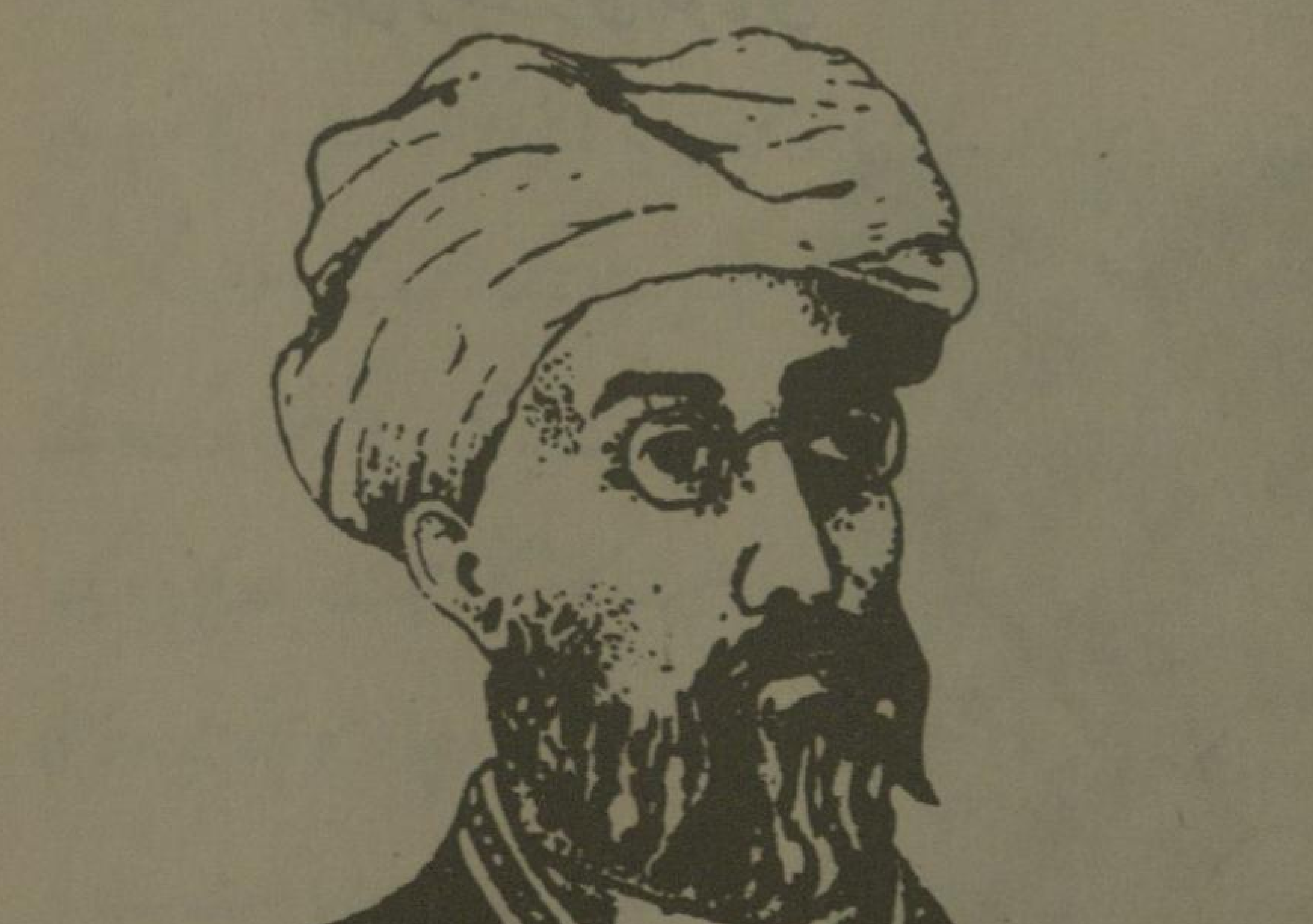
عیاض اسحاقی



شفیقہ خانم
(دُختر اسماعیل گیسپرالی)



سیّد جعفر



محمود بهبودی



ذکی ولیدی طوغان



ایک قزاق سردار

حرفِ اوّل

ہمارے برصغیر کے شمال میں وسطی ایشیا کا وسیع خطہ پھیلا ہوا ہے۔ اس سرزمین نے نئی نئی تہذیبوں اور بڑی بڑی سلطنتوں کو جنم دیا اور تاریخ عالم میں بڑا امتیاز کردار ادا کیا ہے۔ سمرقند و بخارا، بلخ و بدخشاں، فرغانہ اور غزنی جیسے نام آج بھی ہمارے ذہنوں میں عظمت رفتہ کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ اسی سرزمین سے چنگیز و تیمور اٹھے، اسی کے میدانوں سے نکل کر بابر نے ہندوستان کو زیرنگیں کیا اور یہیں کے رہنے والے عثمانی ترکوں نے مسلمانوں کی ایک عظیم الشان سلطنت قائم کی۔ ہماری اپنی تاریخ اور تہذیب و تمدن کے بنانے اور سنوارنے میں وسطی ایشیا کا بڑا ہاتھ ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہماری تہذیب و ثقافت کا سرچشمہ ہی وسطی ایشیا ہے لیکن اس کے باوجود گزشتہ سو سال سے ہم اس خطہ اور یہاں کے رہنے والوں سے بالکل بے تعلق ہو کر رہ گئے ہیں۔ ہماری طرح وسطی ایشیا کے عوام بھی بیرونی جارحیت کا شکار ہوئے اور پھر وہ بھی اسی سیاسی اور قومی ارتقا کے دور سے گذرے جن سے ہم بھی دوچار ہو چکے ہیں۔ وسطی ایشیا میں بسنے والے مسلمانوں کی تاریخ اور ہماری اپنی کہانی میں بڑی مماثلت ہے۔ ۱۹ ویں صدی کے وسط میں ان پر بھی ویسا ہی انحطاط طاری ہوا جس نے ہندوستان میں اسی دور میں مغلیہ شوکت و سطوت کو تباہ کر دیا تھا اور پھر مغربی تہذیب کی بڑھتی ہوئی طاقت نے ان کو مغلوب کر لیا۔ نئے انداز اور نئے اسلوب آگئے۔ قدامت اور روایات میں گرفتار مسلمان حیران و پریشان ہو گئے۔ ان کو نیست و نابود کرنے کی

کوششیں کی گئیں۔ ہماری اور ہمارے ان عم زادوں کی داستانیں کس قدر یکساں ہیں۔ یہاں سرسید (۱۸۹۸—۱۸۱۷) اور وہاں شہاب الدین مرجانی (۱۸۸۹۔ ۱۸۱۵ء) اور اسمٰعیل بے گیسپرالی (۱۹۱۴—۱۸۵۱) پیدا ہوئے۔ ہم دونوں ہی غلام تھے اور ہمارے اردگرد تاریکی وجہالت کا حصار تھا۔ وقت اور فاصلہ نے خون اور تمدن کے رشتوں کو بھلا دیا۔ ہم اپنی مصیبتوں میں مبتلا رہے اور ہمارے وسط ایشیائی بھائی اپنی غلامی کی زنجیریں کاٹتے رہے۔ کوششیں بار آور ہوئیں، ایثار و قربانی کا ثمرہ ملا، مگر جب ہم نے آزادی کے سورج کی روشنی میں آنکھیں کھولیں تو ایک دوسرے کو پہچان نہ سکے۔ آج جبکہ ہماری ملّت سنِ بلوغت کو پہونچ رہی ہے یہ اشد ضروری ہے کہ وہ اپنی برادری اور اپنے قرابت داروں سے رشتہ استوار کرے۔ یہ ضروری ہے کہ ہم اپنے ہم مذہب بھائیوں کی جدوجہد اور نشو ونما سے واقفیت حاصل کریں اور اپنے دلوں کو ایک مشترک جذبۂ ایمانی سے تازہ کریں۔

تزکِ بابری میں وسطی ایشیا کو ماوراء النہر کے نام سے پکارا گیا ہے، یہ عربوں کا دیا ہوا نام ہے۔ بابر نے ترکستان کا تذکرہ بہت کم کیا ہے اور اس سے اس کی مراد سردریا کا ایک چھوٹا سا علاقہ ہے۔ ماوراء النہر دریائے سیر (سیھون) اور آمو (جیھون) کے دوآبہ کے درمیان کا علاقہ ہے۔ آمو دریا کے جنوب سے ہندوکش تک کا علاقہ بلخ کہلاتا تھا اور اس سے پرے مشرق میں بدخشاں تھا۔ دریائے سیر کے شمال میں تاشقند کے اطراف وجوانب کا علاقہ شاش اور مغلستان کہلاتا تھا۔ شمالی ایران اور مغربی افغانستان کی سطح مرتفع خراسان کے نام سے جو آج تک رائج ہے مشہور تھی، مشرقی افغانستان اپنے خاص خاص شہروں کابل، قندھار اور غزنی کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ سیر دریا کی اوپری وادی کا نام فرغانہ تھا۔ آمو اور سیر دریا کے نشیبی علاقوں میں خوارزم کا مشہور علاقہ واقع تھا۔ ترکستان کے وسیع میدانوں کے لئے آمو اور سیر دریا

وہی درجہ رکھتے ہیں جو ہمارے برصغیر میں گنگا جمنا اور دریائے سندھ کا ہے لوگوں کی بود و باش اور معیشت پر ان کا بڑا اثر پڑا ہے۔

۱۳ ویں صدی میں چنگیز خاں نے ایران، چین اور ترکستان پر قبضہ کر لیا اور اس کے بعد چنگیز کی سلطنت اس کے جانشینوں میں منقسم ہو گئی۔ ہلاکو نے ایران اور عراق میں اپنی سلطنت قائم کر لی اور قبلائی خاں کی سلطنت چین میں قائم ہوئی چنانچہ خلیج فارس اور بحیرۂ چین کے درمیان تجارت کو فروغ ہوا۔ تجارتی کاروانوں کی جگہ سمندری جہازوں نے لے لی۔ مشرق و مغرب کے تجارتی راستے بند ہو گئے۔ سمندری راستوں نے میدانی راہوں پر فوقیت حاصل کر لی اور ترکستان سے تجارتی منڈیاں اٹھ گئیں۔ اب اس وسیع خطہ میں سوائے اسلام کے اور کوئی باہمی رابطہ باقی نہیں رہ گیا، جوں جوں ذرائع حمل و نقل مسدود ہوتے گئے یہ رابطہ بھی کمزور ہوتا گیا حتیٰ کہ ہر طرف نفسا نفسی پھیل گئی۔ ترکستان چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹ گیا، فرقہ پرست رقابتیں شروع ہو گئیں اور ہر سو انتشار پھیل گیا، عثمانیوں اور صفویوں کی چپقلش نے بھی مزید ہوا دی اور ترک نژاد اقوام کا شیرازہ بکھرنے لگا چنانچہ یورپی اور روسی اقتدار کے پھیلنے میں کوئی رکاوٹ نہ رہی اور ۱۹ ویں صدی کے آخر تک روسی اقتدار تمام تر وسطی ایشیا میں قائم ہو گیا۔ وولگا، یورال کی مسلمان ریاستوں پر روسی قبضہ صدیوں قبل ہو چکا تھا۔

اس صدی کے اوائل میں روس اور اس کے مقبوضہ علاقوں میں زاریت کے خلاف متعدد تحریکوں کا آغاز ہوا جن کا خاتمہ بالشویک قیام اقتدار کی شکل میں رونما ہوا۔ اس بست سالہ دور میں جبکہ ہر سو سیاسی اور قومی بیداری کی لہر پھیل گئی مملکت روس کے باشندوں نے بلا تفریق مذہب و ملت اپنی اپنی خواہشات اور امیدوں کا مظاہرہ کیا اور اپنی آزادی کے لئے جد و جہد کی۔ ان مختلف اور متعدد ملتوں میں ترک اقوام

دو خصوصی امتیاز رکھتی تھیں۔ اولاً ان کی بھاری اکثریت اسلام کی پیرو تھی اور دوم ان پر مغربی تہذیب اور افکار و نظریات کا بہت کم اثر پڑا تھا۔ یہ کہنا درست ہے کہ وسطی ایشیا کے مسلمانوں نے تمدنی اور ثقافتی طور پر تمام عالم اسلامی کو متاثر کیا ہے عہد قدیم میں امام بخاری، فارابی، بوعلی سینا اور البیرونی وغیرہ نے علم وہدایت کی وہ شمع روشن کی جس کی ضیا پاشی آج بھی آنکھوں کو خیرہ کرتی ہے۔ عہد جدید میں شہاب الدین مرجانی، اسمٰعیل بے، یوسف آقچورا اور قاضی عبدالرشید ابراہیم نے جس تدبیر اور عملی سیاست کا مظاہرہ کیا وہ ۲۰ ویں صدی کے انقلابی دور میں مراکو سے لے کر انڈونیشیا تک آباد مسلمانوں کے لئے سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس صدی میں عالم اسلام میں وسطی ایشیا اور مسلمانان روس کا لائحہ عمل جدوجہد آزادی میں اوّلین اور منفرد مقام رکھتا ہے۔ جس طرح صدیوں قبل ہمارے ان عم زادوں نے ترقی اور تہذیب و تمدن کی راہ دکھائی اسی طرح آج بھی انہوں نے نئے حالات اور نئے تقاضوں میں ہماری قیادت کی۔ دور جدید میں مسلمانوں کی سیاسی تاریخ کو سمجھنے کے لئے مسلمانان روس کی جدوجہد اور مساعی کو سمجھنا اور اس کا تجزیہ کرنا ہمارے لئے ناگزیر ہے۔ یہی نہیں بلکہ برصغیر ہند و پاک کی تاریخ کا بیشتر حصہ ترکوں کی تاریخ پر مشتمل ہے۔ ترک سلطان محمود غزنوی نے اس برصغیر میں مسلمانوں کی سلطنت کی بنیاد ڈالی اور پھر ترکستان کے مسلمانوں نے یہاں اسلامی سلطنت کا علم لہرایا۔ ایبک، التمش، بلبن، خلجی اور پھر بابر سب ہی ترکی النسل تھے۔ ہمارے علماء، شیوخ، بزرگانِ دین اور ادبا و شعرا کی بھی بڑی اکثریت وسطی ایشیا سے تعلق رکھتی تھی۔ بہادر شاہ ظفر کی قید اور موت نے ہمارے برصغیر سے ترکوں کے اثر کو دھندلا کر دیا۔ چنانچہ اپنی سیاسی اور ثقافتی تاریخ کو سمجھنے کے لئے بھی وسطی ایشیا کے ترک مسلمانوں کا مطالعہ اور جائزہ ازحد ضروری ہے۔

اردو ادب ابھی شعبۂ تاریخ میں اور خصوصاً اس خاص موضوع پر بہت ہی خام اور تشنہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ خامیوں اور کمزوریوں کے باوجود یہ کتاب مستقبل کے اردو مورخ کے لئے قیمتی مواد فراہم کرسکے گی کتاب کی فنی حیثیت کے متعلق چند باتیں واضح کرنا ضروری ہیں۔ اوّلاً ممکن ہے کہ تاریخ کے طالب علم تاریخوں میں ردّ و بدل محسوس کریں عہد زار میں گریگورین کیلنڈر (جو عام طور پر مستعمل ہے) استعمال نہیں ہوتا تھا۔ سوویٹ نظام قائم ہونے پر یکم فروری ۱۹۱۸ء موجودہ عالمگیر گریگورین کیلنڈر اختیار کیا گیا۔ چنانچہ ۳۱ دسمبر ۱۹۱۷ء تک کی تاریخیں پرانے کیلنڈر کے حساب سے اور یکم جنوری ۱۹۱۸ء سے نئی تاریخیں استعمال کی گئی ہیں۔ مختلف مورخین نے مختلف تاریخوں سے (لیکن یکم فروری سے قبل) نئے کیلنڈر کا استعمال کیا ہے۔ اس کی وجہ سے مختلف حوالہ جات میں ایک ہی واقعہ دس یا پندرہ دن کے فرق سے (تاریخ کے لحاظ سے) بیان ہوا ہے۔

دوسرا اہم مسئلہ آبادی کے اعداد و شمار سے متعلق ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ اس سلسلہ میں کوئی مستند اعداد مہیا نہ ہوسکے اور مختلف راویوں نے مختلف اعداد و شمار ذکر کیے ہیں۔ اعداد و شمار میں اختلاف کی بڑی وجوہات یہ ہیں کہ اوّلاً حکومت روس (زار اور سوویٹ) نے عمداً سیاسی مصلحت کی بنا پر اعداد و شمار کو مسخ کیا تاکہ بیرونی دنیا کو ان کے جور و استبداد کا صحیح اور کلی اندازہ نہ ہوسکے، دوئم یہ کہ مختلف علاقوں کی نسلی اور سرحدی شمار بندی کا آج تک صحیح اور غیر مشکوک تعین نہیں ہوسکا ہے جس کی وجہ سے ہر راوی اپنا تعین خود ہی کرلیتا ہے اور اسی حساب سے اعداد و شمار بیان کردیتا ہے۔

کتاب میں جو نام مذکور ہوئے ہیں وہ پاکستانیوں کے لئے قطعاً اجنبی نہیں ہیں، میں نے کوشش کی ہے کہ میں ان کو اسی طور سے لکھوں جس طرح وہ ترک زبانوں میں لکھے

جاتے ہیں، البتہ وہ نام جو اردو میں عام مستعمل ہیں اور اردو کے قارئین ان کے ہجوں اور تلفظ سے بخوبی واقف ہیں، ان کو میں نے بجنسہٖ چھوڑ دیا ہے[1]۔ اس ضمن میں کراچی یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ اسلامی اور ترکی زبان کے استاد ڈاکٹر محمد صابر صاحب اور ریڈیو پاکستان کے جناب اعظم ہاشمی کا بیحد ممنون ہوں کہ انہوں نے اس امر میں قیمتی معاونت کی اور جس کے بغیر میری کوششیں ناکام رہتیں۔ کتاب کے آخر میں چند ضمیمے بھی شامل کردیئے گئے ہیں، امید ہے کہ یہ مفید وکار آمد ثابت ہوں گے۔

آخر میں جناب اختر حسین صدر انجمن ترقی اردو کا بیحد ممنون ہوں جن کی حوصلہ افزائی سے یہ کتاب پایہ تکمیل کو پہنچی۔ ڈاکٹر صابر اور اعظم ہاشمی صاحب نے قیمتی وقت نکال کر مسودہ پر نظر ثانی کی اور جا بجا نہ صرف حقائق اور حوالہ جات کی درستگی جانچی بلکہ نیا مواد بھی مہیا کیا۔ پروفیسر عبداللہ المسدوسی نے مصروفیت کے باوجود میرے مسودہ کو ذوق وشوق سے پڑھا اور اپنی قیمتی رائے کا اظہار فرمایا اور بالآخر پیر حسام الدین راشدی صاحب نے انتہائی مصروفیت کے باوجود میری کتاب کو پڑھا۔ ان کی سرپرستی، شفقت خلوص اور توجہ وشوق نے میری محنت کو ٹھکانے لگادیا۔ اگر میں مستقبل میں اردو ادب کی مزید خدمت کرسکا تو یہ مربّی پیر حسام الدین راشدی صاحب کا فیضان ہوگا۔

میں اُن دوست واحباب کا بھی مشکور ہوں جنہوں نے گاہے بگاہے مجھے اُکسایا اور سرگرم عمل رکھا۔

---

[1] مثال کے طور پر تاشکند کو تاشقند ہی لکھا ہے۔

روس کے ترک[1]

پانچویں، چھٹی عیسوی میں ترکوں نے آلطائی پہاڑوں اور منگولیا سے نکل کر موجودہ قزاقستان اور مغربی وسط ایشیا پر قبضہ کر لیا۔ آہستہ آہستہ نقل وطن اور فتوحات کے ذریعہ گیارہویں صدی تک وہ ایران، قفقاسیہ[2]، جنوبی روس اور دوسرے بڑے بڑے علاقوں میں پھیل گئے۔ اسی صدی میں ایک ترکمان سردار سلجوق نے قبول اسلام کیا اور سلجوقی سلطنت کی بنیاد ڈالی جو ایران، عراق اور اناطولیہ تک پھیل گئی۔ ان ہی سلجوقیوں کے جانشین عثمانی ترکوں نے ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ پر قبضہ کرکے آئندہ کئی صدیوں کے لئے مغربی ایشیا اور جنوب مشرقی یورپ میں ایک عظیم الشان سلطنت قائم کی۔

لفظ "ترک" عموماً جمہوریہ ترکی کے باشندوں سے معنون کیا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان ترک باشندوں کے علاوہ ترکوں کے متعدد گروہ اور بھی ہیں جو دوسرے ممالک میں آباد ہیں۔ موجودہ زمانہ میں ترکوں کی کل آبادی ۵ ـــ ۱۰ کروڑ کے درمیان شمار کی جاتی ہے جن میں دو کروڑ سے اوپر جمہوریہ ترکی میں، ۲ ـــ ۵ کروڑ سوویٹ یونین میں اور ۱ ـ ۲ کروڑ چین کے صوبہ سنکیانگ (مشرقی ترکستان) افغانستان، ایران، عراق شام، قبرص اور بلقان میں آباد ہیں[3]۔

---

[1] ضمیمہ ۲ دیکھئے [2] قفقاز بھی مستعمل ہوتا ہے

[3] WHEELER: "ENCLY. BRITANNICA"
LORIMER: "THE POPULATION OF THE SOVIET UNION"
M.E. BUGRA: "MUSLIMS UNDER RUSSIAN & CHINESE DOMINATION" "USSR_QUESTION & ANSWER (MOSCOW. USSR)

سوویٹ روس میں ترک قوم اس کے وسیع مشرقی اور جنوب مشرقی علاقوں میں کثرت سے آباد ہے جن میں قزاقستان، وسطی ایشیا کے پہاڑی اور میدانی علاقے، وسطی والگا کا خطہ، کوہ یورال اور مشرقی سائبیریا میں دریے لینا کا دہانہ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے چھوٹے چھوٹے گروہ مشرقی روس اور مغربی سائبیریا میں بھی بستے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ روس کے ہر خطہ میں ترک موجود ہیں جہاں وہ یا تو مدت سے آباد ہیں یا حال میں کسب معاش کے لئے آئے ہیں۔

یہاں پر یہ بات قابل ذکر ہے کہ تقریباً تمام روسی مسلمان ترک ہیں اور نوے فیصد ترک مسلمان ہیں۔ روس کے ترکوں میں چواش اور یاقوت[1] عیسائی یا دوسرے مذاہب کے پیرو ہیں۔ ترکوں کے علاوہ لاکھوں تاجک[2] اور کوہ قاف کے باشندے بھی مسلمان ہیں۔ ترک مسلمانوں میں تاتار، ازبک، قزاق، ترکمان چند مشہور گروہ ہیں۔ ان میں ازبک اور تاتار سب سے ترقی یافتہ ہیں۔

ترکوں کا آبائی وطن منگولیا اور آلتائی کے پہاڑوں میں تھا۔ ۱۹ ویں صدی تک ترکوں کی مختلف زبانوں کو "تورانی" کہا جاتا تھا۔ ترکی زبان "تورانی" یا "یورال آلتائی" زبانوں کی اہم شاخ ہے۔ ترکی ادبی لہجوں میں چغتائی، عثمانی، تاتاری اور آذری قابل ذکر ہیں۔ گذشتہ صدی کے وسط تک ترک اقوام میں صرف دو لکھی جانے والی زبانیں عثمانی اور چغتائی رائج تھیں۔ چغتائی زبان ترکی لہجوں میں نہایت مشرقی سمجھی جاتی ہے اور وسطی ایشیا میں عام رائج ہے۔ لیکن علی شیر نوائی اور بابر نے اپنی زبان کو کبھی بھی چغتائی نہیں

---

[1] یاقوت سائبیریا اور ٹنڈرا کے علاقہ میں پھیلے ہوئے ہیں اور غیر مسلم ہیں۔

[2] اولاً ترک باپ اور ایرانی ماں کے بچوں کو تاجک کہا جاتا تھا۔ بعد ازاں مخلوط النسل ترکوں کے لئے یہ نام مستعمل ہونے لگا۔

کہا بلکہ ہمیشہ اس کو "ترکی" کہتے آئے ہیں۔ عثمانی لہجہ دراصل قدیم اناطولی ترکی ہے جو مغرب میں آذر بائیجان تک بولی جاتی تھی۔ عربی، فارسی الفاظ و تراکیب اور آریائی زبانوں کے اختلاط سے یہ زبان بہت ہی فصیح و بلیغ، لچکدار اور شیریں بن گئی۔ مولانا جلال الدین رومی کو پہلا سلجوقی شاعر سمجھا جاتا ہے کیوں کہ انہوں نے سب سے پہلے ترکی اشعار کہے ہیں۔ اس صدی کے شروع تک یہ زبانیں تقریباً مفقود ہوگئیں اور ان کی جگہ مختلف علاقائی زبانوں نے لے لی۔ بنیادی زبان ترکی ہی ہے صرف لہجہ اور محاوروں کا فرق ہے۔

روس کے ترک نژاد باشندوں میں قومی بیداری کا آغاز انیسویں صدی کے وسط میں ہوا، سیاسی شعور کی تاخیر کا بڑا سبب یہ تھا کہ ایشیا اور مشرقی یوروپ کے مسلمانوں نے اپنی سیاست کی بنیاد بجائے قومی یا نسلی بنیاد کے ہمیشہ اسلامی تہذیب و تمدن اور ثقافت پر رکھی۔ ۱۹۱۷ء کے انقلاب سے قبل وسطی ایشیا کا ترکی بولنے والا اور تاجکستان کا فارسی بولنے والا مسلمان ایک ہی قبیلہ اور ایک ہی گروہ کے فرد سمجھے جاتے تھے۔ اس کے برعکس وسطی ایشیا کا ترکی بولنے والا غیر مسلم اس حلقے اور برادری سے باہر شمار ہوتا تھا۔ یہ سیاسی تصور ایک عرصے تک ایران، ترکی، مملکت روس اور دیگر مسلمان ممالک میں مقبول رہا ہے اور آج بھی بڑی حد تک یہی ہے۔ حکومت زار کے عہد میں تمام روسی مسلمان خواہ وہ تاتار تھے یا قزاق یا تاجک صرف مسلمان تھے اور کسی قسم کی علاقائی یا لسانی تفریق نہیں تھی گزشتہ صدی کے اواخر میں حکومت نے تفریق کی کوشش کی لیکن عربی رسم الخط اور نسلی امتیازات کی بنیاد سے ناواقفیت کی وجہ سے زیادہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی، چنانچہ سلطنت زار میں بلا تفریق نسل و زبان ہر مسلمان "تاتار" کہا جانے لگا[1]۔ تاتاری

---

[1] تاتاریہ، باشقیریا، کریمیا، آذر بائیجان اور شمالی قفقاسیہ کے ترکوں کو "تاتار" کہا جاتا ہے (بقیہ اگلے صفحے پر)

زبان روسی مسلمانوں کی مقبول عام زبان تھی جو سرکاری مراسلات میں بھی استعمال کی جاتی تھی۔ اس صورت حال کی وجہ سے ترکی النسل باشندوں میں قومی شعور پیدا ہونے کے بجائے مذہبی یگانگت اور اتفاق کا جذبہ برقرار رہا۔ اسی جذبے نے قفقازیہ کے مسلمانوں کو تاتاریوں اور دوسرے مسلم قبائل سے منسلک رکھا۔ ۱۹۱۷ء میں ماسکو میں کل مسلمانان روس کی کانگریس کے صدر قفقاسیہ کے ایک شہری احمد سالک کو منتخب کیا گیا۔

روس میں اس مذہبی تصور اور اتحاد نے ایک خاص صورت حال پیدا کر دی تھی۔ انیسویں صدی میں ترکوں میں قومی بیداری سے قبل اسلامی تمدن کا احیا شروع ہوا، روسی ترکوں کا نسلی، قومی اور لسانی جذبۂ بیداری ۱۹۲۰ء تک اسلامی تمدن کی یکجہتی پر غالب نہ آسکا تھا کہ ترک کمیونسٹ بھی "مسلم انقلاب" اور مسلم تعلیمی مسائل کا تذکرہ کرتے تھے۔

مذہب کے غلبہ کے علاوہ قومی بیداری کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ ایک ایسی زبان کی غیر موجودگی تھی جو ترک باشندے ادب، تعلیم اور تجارت میں مشترکہ طور پر استعمال کر سکتے۔ مسلمانوں نے ہمیشہ عربی زبان مذہب کے لئے استعمال کی ہر اور جب انیسویں صدی کے اواخر میں یہ کوشش کی گئی کہ ترکی زبان نماز کے لئے استعمال کی جائے تو اس کفر و بدعت کے خلاف شدید احتجاج کیا گیا۔ ۱۹۰۸ء میں تاتاری علماء نے حکومت سے اس امر کی شکایت کی کہ ان کے چند انقلابی رفقا مسجدوں میں نماز کے لئے تاتاری زبان استعمال کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جس کی اسلام اجازت نہیں دیتا۔ ۱۹۱۲ء میں ایک ممتاز تاتار عالم نے اخبار کے ذریعے اس بات کی مخالفت

(حاشیہ بقیہ پچھلے صفحہ کا) ان کا لب و لہجہ اور خد و خال دوسری ترک اقوام سے منفرد ہیں۔

کی کہ قرآن کو تاتار جیسی کم مایہ زبان میں ترجمہ کیا جائے اور کہا کہ قرآن اور شریعت کی تعلیم تمام مسلم تعلیمی اداروں میں عربی میں دی جاتی ہے اور ترکی زبان اس کی جگہ نہیں لے سکتی۔[۵۱]

روس کے جنوبی صوبوں میں خصوصاً وسطی ایشیا اور ایران کے شمال میں فارسی کا بہت اثر تھا۔ ان علاقوں میں اکثر وبیشتر ادب فارسی میں تھا۔ مقامی ترکی زبان، ادب کے لئے غیر موزوں سمجھی جاتی تھی۔ بالشوک انقلاب تک آذر بائیجانی اور ازبک دانشور فارسی اور ترکی دونوں زبانوں پر دسترس رکھتے تھے۔ ۱۹۲۰ء تک فارسی بخارا کی سرکاری زبان تھی اور بیشتر سرکاری کاغذات روزنامچے اور کوائف فارسی زبان میں لکھے جاتے تھے جبکہ اکثریت کی زبان ازبکی تھی۔ وسطی ایشیا اور دوسرے قفقاسیہ کے شہروں میں عموماً دو زبانیں بولی جاتی تھیں۔ تعلیمیافتہ ترک عموماً یہ اقرار کرتے تھے کہ "فارسی تاتاری سے آسان اور بہتر ہے"۔ فارسی کا یہ اثر صرف روسی ترکوں ہی تک محدود نہیں تھا بلکہ عثمانی سلطنت میں بھی اس کا ادب اور شاعری پر بڑا اثر تھا۔ سلطنت عثمانیہ میں فارسی کا یہ اثر انیسویں صدی کے آخر میں "تنظیمات" کے بعد ختم ہوا جبکہ وہاں مغربی تہذیب کا رسوخ شروع ہوا۔

قزاق، ترکمان، قرغیز اور ازبک کے ترک قبائل کی قومی بیداری کی راہ میں ان کی خانہ بدوشی بھی ایک بڑی رکاوٹ تھی۔ دراصل ان لوگوں کو کسی خاص قوم کا فرد ہونے کا احساس ہی نہیں تھا۔ قبیلہ اور خاندان کا رشتہ قومی احساس سے برتر تھا۔ ان سب مشکلات اور رکاوٹوں کے باوجود آخری صدی کے خاتمے پر اور خصوصیت سے "انقلاب اکتوبر" سے قبل روسی ترکوں نے سلطنت کی معاشی اور سیاسی زندگی

---

[۵۱] اخبار "بیان الحق" شمارہ نمبر ۹۰۹، ۹۸۵ (۱۹۱۹) اور "یلدز" شمارہ نمبر ۷۷۶ (۱۹۱۲)

میں خاصی اہمیت حاصل کرلی تھی۔ اس کی وجوہات یہ تھیں کہ نسلی اور لسانی اعتبار سے ان کا تناسب بہت ہے۔ ترک سوویٹ یونین کی آبادی کا دس فیصد حصہ ہیں سلافی بولنے والوں کے بعد ترکی بولنے والوں کا سب سے بڑا گروہ ہے۔ دوسرے یہ کہ جیسا پہلے مذکور ہوچکا ہے ترک پورے یوریشیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ولنو سے یاقوتسک اور باکو سے دُوشنب (سابقہ اسٹالن آباد) تک ترک نظر آتے ہیں چنانچہ زندگی کے ہر شعبہ میں ان کا عمل دخل ہے اور تیسری بات یہ ہے کہ صدہا سال سے ترک اور روسی اقوام اکٹھی رہتی آئی ہیں چنانچہ ایک دوسرے پر اثر انداز ہونا لازمی امر تھا۔

تاتار

یوروپ کی تاریخ میں صدیوں قبل چوتھی صدی میں، دریائے والگا کے کناروں پر ترک قبائل ایشیا سے نمودار ہوئے اور روس کی سلافی قوم کو مفتوح کرکے وسیع اور سرسبز علاقوں پر قابض ہوگئے[۱]۔ تیرہویں صدی میں چنگیز خاں کے "سنہری غول[۲]" نے روس کو یوروپ سے بالکل علیحدہ کرکے لاکھوں روسی باشندوں کو غلام بنالیا۔ سترہویں صدی تک میں تاتاریوں نے دو لاکھ روسی غلام کریمیا اور اناطولیہ کے بازاروں میں فروخت کئے اور جب ۱۸۶۸ء میں روسیوں نے بخارا پر قبضہ کیا تو سینکڑوں روسی غلام جو ازبیک امرار کی ملک میں تھے، آزاد کئے گئے[۳]۔ پندرہویں صدی میں "سنہری غول" اور چنگیز خان کے جانشینوں کا زور ٹوٹ گیا اور روس کے سلافی باشندوں نے ان کی غلامی کا طوق اپنے گلے سے اتار ڈالا۔ اسی صدی میں یوروپ کا عروج شروع ہوا اور مغرب میں غرناطہ کی مسلم حکومت کا خاتمہ ہوگیا، ادھر مشرق میں "سنہری غول" کا نام و نشان مٹ گیا لیکن خانہ بدوش قبائل کی بڑی تعداد مشرقی یوروپ کے میدانوں میں بس چکی تھی جو آہستہ آہستہ زار کی حکمرانی میں آگئی ۱۴۳۹ء میں ایک تاتاری نواب قاسم نے اپنی خدمات نواب ماسکو کو پیش کیں جس کے صلے میں اس کو ماسکو کے جنوب

---

[۱] VERNADSKY: "HISTORY OF RUSSIA" (NEW HAVAN. 1949)

[۲] آلتون اوردو

[۳] SCHUYLER: "TURVINTON"

مشرق میں ایک چھوٹی سی جاگیر بخش گئی۔ روس میں یہ پہلی ترک ریاست تھی۔ تقریباً ۱۰۰ سال بعد ۱۵۵۲ء میں قازان پر اوان (IVAN) نے قبضہ کر لیا اور ۱۵۵۵ء میں یورال کے باشقیریوں[1] نے ماسکو کی اطاعت قبول کر لی۔ ۱۵۵۶ء میں دریائے والگا کے دہانے پر واقع استرخان پر روسیوں نے بلا مزاحمت قبضہ کر لیا اور اس طرح ان کی حکومت بحرۂ کیسپین کے کناروں تک پھیل گئی۔ اب تمام دریائے والگا پر روسیوں کا قبضہ ہو چکا تھا اور ایشیا کی فتح کے دروازے کھل چکے تھے۔

قازان کے الحاق اور روسی حکومت میں تاتاریوں کے بڑے گروہوں کی شمولیت نے روس اور ترک اقوام کے لئے ایک نمایاں صورت پیدا کر دی۔ سلطنت زار کے خاتمے تک تاتاری سب سے بڑی اور پُر اثر اقلیت تھے چنانچہ روس میں ترک اور مسلم مسائل کی بنیاد روسی، تاتاری تعلقات کی بنیاد پر قائم اور منحصر تھی۔ ۱۹۱۷ء تک معاشی قابلیت اور روسی زبان پر دسترس رکھنے کی وجہ سے تاتاریوں کو ترک اقوام میں ممتاز حیثیت حاصل تھی، بہت سے تاتاری روسی افواج اور انتظامیہ میں شامل تھے اور انہوں نے حکومت کے کاموں میں نمایاں حصہ لیا۔ اِوان (IVAN) زار روس کے زمانے سے تاتاریوں نے سیاسی اور ثقافتی سرگرمیوں میں اہم کردار ادا کئے۔

تاتاریوں کی نسلی تاریخ خاصی پیچیدہ ہے۔ دریائے والگا کے خطے میں قبل تاریخ سے قدیم ترین آبادی فن۔ اوغوری (FINNOUGRIC) قبائل کی ہے، یہ لوگ ابھی تک آباد ہیں۔ چوتھی صدی قبل مسیح میں جب ہون قبائل بڑے گروہوں میں ترک وطن کر کے جنوبی روس میں آباد ہوئے تو ان کے ساتھ بلغار ترکوں کا قبیلہ بھی آیا۔

---

[1] باشقیریا کو ترکی میں باش قُردستان (BASHQURDISTAN) کہتے ہیں

ان میں سے اکثر بلقان میں بس گئے اور وہیں سے بلغاریہ کا نام شروع ہوا۔ ساتویں صدی میں ان ہی بلغار[1] ترکوں کی ایک جماعت اوپری والگا میں دریائے کاما کے کناروں پر آباد ہوگئی اور والگا بلغر سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ ۹۲۲ء میں ایک بلغر بادشاہ نے اسلام قبول کرلیا۔ اور اس طرح شمالی ترین حصے میں اسلامی تہذیب وتمدن کی بنیاد پڑی۔ بلغر ترکوں کی دوسری جماعت نے جس نے اسلام نہیں قبول کیا اور جو چواُش (CHUVASH) کہلاتے ہیں، والگا کے کناروں پر ابھی تک آباد ہیں اور اپنے آبائی مذہب پر قائم ہیں۔

اولاً بلغار مسلمان آزاد تھے پھر چودھویں صدی کے خاتمے تک "سنہری غول" کے زیرِ حکومت رہے۔ منگولوں کے آخری حملے میں ان کے ساتھ ایک نیا منگول قبیلہ آیا جو والگا کے خانہ بدوش قبائل کے ساتھ گھل مل گیا۔ اس منگول قبیلہ "تاتار" کا نام ان ترک خانہ بدوشوں کے ساتھ وابستہ ہوگیا اور آج تک یہی نام عام ہے[2]۔ ۱۴۳۸ء میں "سنہری غول" کے ایک امیر اُلُغ محمد نے قازان خانیت کی بنیاد ڈالی، یہ حکومت والگا اور کاما دریاؤں کے اتصال پر قائم تھی جہاں پر پہلے بلغار مسلمانوں کا قبضہ تھا۔ وقت گذرنے کے ساتھ آہستہ آہستہ تمام مختلف قبائل، بلغار، فن، اوغوری اور ترک خانہ بدوش ایک ہی نسلی گروہ کا جز بن گئے اور "تاتار" کے نام سے پکارے جانے لگے۔

۱۵۵۲ء میں قازان کی فتح کے بعد روسیوں نے وسطی والگا کے میدانوں میں اپنی نوآبادیاں قائم کرنی شروع کردیں اور وہاں کی ترک آبادیوں کو روسی قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی روسی کسانوں کی بڑی جماعتیں والگا اور یورال کے غیر آباد

---

[1] ترکی میں "بولغار" بھی کہتے ہیں۔

[2] B.SPULER: "DIE GOLDENE HORDE." (LEIPZIG. 1943)

علاقوں میں آباد ہو گئیں اور سترہویں صدی تک یہ علاقے روسی نظر آنے لگے، آج والگا اور یورال کے علاقوں میں اکثریت روسیوں کی ہے۔ لیکن ترک قبائل کو روسی بنانے میں کوئی کامیابی نہ حاصل ہو سکی۔ اور چونکہ زیادہ تر تاتار مسلمان تھے جو اپنا مذہب اور تہذیب و تمدن چھوڑنے پر آمادہ نہ تھے اس لئے حکومت روس نے تبلیغ کی بڑی مہم شروع کی۔ ۱۵۵۵ء میں ایک روسی بشپ گوریس (GURIUS) نے قازان میں تبلیغ شروع کی۔ تاتاریوں کی شدید مخالفت کی وجہ سے یہ مہم نہ صرف تیز تر کردی گئی بلکہ متعدد انتظامی اقدام بھی اٹھائے گئے۔ ۱۵۵۶ء میں تاتاریوں کی بغاوت کے بعد مسلمانوں کو قازان شہر میں رہنے کی ممانعت کردی گئی اور شہر کی مساجد یا تو شہید یا بند کردی گئیں۔

ان سب باتوں کے باوجود تاتار اسلام پر سختی سے قائم رہے، مشکل سے ۱۰ فیصدی تاتاریوں نے مسیحیت قبول کی ہوگی[۵۱] اور ان میں سے بیشتر وہ قبائل تھے جو برائے نام ہی مسلمان تھے۔ اس کے برعکس فن۔ اوغوری اور دوسرے ملحد قبائل میں اسلام کا اثر پھیل رہا تھا۔ حکومت اس صورت حال کو تشویش سے دیکھ رہی تھی۔ چونکہ مساجد اسلامی تحریک کا مرکز تھیں اور یہیں سے مسیحی تبلیغ کے خلاف احکامات جاری ہوتے تھے اس لئے ۱۵۹۳ء میں حکومت نے حکم صادر کردیا کہ تمام مساجد شہید کردی جائیں اور روسی حکومت کی اجازت کے بغیر کوئی مسجد نہ بنائی جائے[۵۲]۔

سترہویں صدی کے دوران میں اسلام کی مخالفت کسی حد تک کم ہوگئی تھی لیکن

---

۵۱ ان میں حقیقتاً اکثریت ان قزاقوں کی تھی جو بدھ مذہب کے پیرو تھے۔ انقلاب روس کے دوران ان میں سے اکثریت کو پھر مسلمان کرلیا گیا۔ (تلفیق الاخبار)

۵۲ "ISTORIIA TATARII v DOKUMENTAKH i MATERIALAKH." (MOSCOW 1937)

مسلمانوں کے علاقے میں والگا اور کاما دریاؤں کے کنارے کنارے روسیوں کی نوآبادیاں قائم کی جاتی رہیں۔ مسلمان امرا اور رؤسا کو اس بات کی اجازت نہیں تھی کہ وہ روسی کاشتکار یا مزدور ملازم رکھیں۔ ۱۶۸۱ء میں کئی مسلمان تاتار امرا کی زمینیں اور جاگیریں ضبط کرلی گئیں۔ مسلمان کسانوں کی حالت قدرے بہتر تھی، ۵۰ فی صدی روسی کسان اپنے امرا کی غلامی میں تھے اس کے برعکس ۹۰ فی صد سے زیادہ مسلمان کسان آزاد تھے۔

پیٹر اعظم اور اس کے جانشینوں نے تبدیلی مذہب کے لئے پھر تاتاریوں پر دباؤ ڈالنا شروع کیا اور بہت سے عیسائی مبلغین ان علاقوں میں بھیجے گئے۔ جہاں انہوں نے اکثر جبراً اور روپئے سے لوگوں کو قبول مسیحیت پر آمادہ کرنا چاہا۔ ۱۷۴۰ء میں تبلیغ کی یہ مہم عروج پر پہنچ گئی اور حکومت نے تبلیغ کے لئے ایک محکمہ قائم کیا۔ تاتار بچوں کو جبراً مشنری اسکولوں میں بھیجا جانے لگا، نئی مساجد کی تعمیر ممنوع ہو گئی اور فوج میں بھی تبلیغ کے احکامات جاری کئے گئے، جن لوگوں نے مسیحیت قبول کی انہیں خاص مراعات بخشی گئیں۔ ۱۷۴۳ء میں تقریباً ۵۰۰ نئی پرانی مسجدیں اس بہانے سے شہید کردی گئیں کہ وہ بلا اجازت تعمیر ہوئی تھیں۔ روسی حکومت کی کوششوں کو دیکھتے ہوئے تبلیغ کو بہت کم کامیابی ہوئی۔ بہت سے تاتاری جو جبراً عیسائی ہو گئے تھے پس پردہ مسلمان رہے، ۱۸۲۸ء تک کل ۱۲۰۰۰ تاتاریوں نے اسلام ترک کیا تھا۔ جن میں سے اکثر و بیشتر موقع ملتے ہی پھر مسلمان ہو گئے۔ ایک روسی بشپ ریفسکی (RAIFSKY) نے اس بات کا اعتراف کیا کہ "مسلمان سخت کٹر ہیں اور ان میں سے کوئی بھی خود تبدیلی مذہب کے لئے تیار نہیں۔" ۱۷۰۸ء میں پرنس شربیتوف (PRINCE SHCHERBATOV) نے تبلیغ کے سلسلے میں شک و شبہ کا اظہار کیا اور لکھا کہ "نوجوان مسلمانوں کے تبدیلی مذہب کے لئے جو اسکول قائم کئے گئے ہیں وہ مسیحیت کو بجائے مقبول بنانے کے

ان کو اس سے متنفر کر رہے ہیں"۔ ۱۷۷۵ء میں تبلیغ کے خلاف عوام کے جذبات بالآخر بھڑک اٹھے اور پگاچوف (PUGACHEV) کی بغاوت میں، جو کہ صرف کسانوں کی بغاوت نہ تھی بلکہ مذہبی اقلیتوں کی بغاوت بھی تھی، بڑا کشت و خون ہوا اور مشنریوں کو اپنی حرکات کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ صرف قازان کے صوبے میں ۱۳۰ پادری ہلاک کر دیئے گئے۔

۱۷۶۶ء میں ملکہ کیتھرائن دوئم (CATHERINE) نے پیٹرزبرگ میں روسی ضابطۂ قانون کی ترتیب نو کے قانون ساز کمیشن کا اجلاس طلب کیا۔ اس کمیشن میں والگا۔یورال کے علاقے میں رہنے والے تاتار مسلمانوں کے نمائندے بھی شامل تھے ان نمائندوں نے کمیشن کو جو یادداشت پیش کی اس میں ان مذہبی اور اقتصادی رکاوٹوں اور مشکلات کا بھی تذکرہ تھا جو ایوان (IVAN) کے عہد حکومت سے ان کو درپیش تھیں۔ تاتاری نمائندوں نے مذہبی آزادی، تجارت پر سے پابندی اٹھانے اور تاتاری امراء اور شرفاء کی حیثیت بحال کرنے کا مطالبہ کیا۔ والگا اور قازان کے دورے کے دوران ۱۷۶۷ء میں کیتھرائن اس علاقے کے تاتاریوں کی جفاکشی اور حوصلے سے بہت متاثر ہوئی اور تاتاریوں کے ثقافتی اور قومی نمائندوں کو شرفِ باریابی بخشا۔ نمائندوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی شکایات عرضداشت کی شکل میں پیش کیں اور ملکہ نے ان کو فوری طور پر دو مسجدیں تعمیر کرنے کی اجازت دیدی۔ اپنی مسلمان رعایا کی مشکلات دور کرنے کے لئے کیتھرائن کا یہ پہلا قدم تھا۔ اس کے ساتھ ہی ملکہ نے اس قانون کو بھی منسوخ کر دیا جس کے تحت مسلمان قازان سے شہر بدر کر دیئے گئے تھے[۱۵]۔ فوراً ہی بعد کئی قانون اور

---

۱۵ ISKHAKOV: "IDEL URAL" (PARIS 1933)

ضابطے نافذ کئے گئے جس سے تاتاریوں کی مذہبی اور معاشی حیثیت بالکل تبدیل ہوگئی اور جس کی بنا پر اگلی صدی میں تاتاریوں کا احیا ممکن ہوا۔

۱۷۷۳ء میں ملکہ نے ایک شاہی فرمان جاری کیا جس نے نہ صرف مسجدوں کی تعمیر کے احکامات کی تصدیق کی بلکہ اسلام کے ساتھ رواداری کا بھی حکم دیا — پگاچوف (PUGACHEV) کی بغاوت کے بعد روس کے مشرقی علاقوں میں امن کی بحالی کا ایک بڑا مسئلہ ملکہ کے پیش نظر تھا۔ ۱۷۷۶ء میں ایک فرمان کے ذریعے تاتاری تاجروں پر سے بیشتر پابندیاں ہٹالی گئیں اور ۱۷۸۴ء میں ان تاتاری امرار اور شرفا کی، جنہوں نے بغاوت میں وفاداری کا ثبوت دیا تھا۔ حیثیت بحال کی گئی۔ بالآخر ۱۷۸۸ء میں کیتھرائن نے مسلمانوں کی دیکھ بھال کے لئے ایک خاص مذہبی ادارہ قائم کیا۔ اس نئے قانون کی بنا پر جو "ضابطۂ رواداری برائے مسلمانانِ روس" کے نام سے مشہور رہا، مسلمانوں کی دینی تعلیم، مساجد اور مذہبی اداروں کی تنظیم ہوئی۔ اس قانون کی بنیاد پر تاتاری مسلمانوں کی تنظیم ایک مفتی کے سپرد کی گئی۔ یہ مفتی حالیہ قائم شدہ مذہبی ادارے کا سربراہ بھی تھا۔ اس ادارے کا دفتر شروع میں اورن برگ (ORENBERG) اور بعد ازاں اوفا (UFA) میں قائم ہوا۔ ایک ممتاز عالم محمد جان حسین پہلے مفتی مقرر ہوئے۔ حکومت روس کی اس نئی حکمت عملی اور قوانین سے مسلمانوں کو مذہبی اور معاشرتی آزادی نصیب ہوئی اور اس سے تاتاریوں کی معاشی اور ثقافتی زندگی کو جلا ملی۔ درحقیقت یہ پالیسی اس قدر زود اثر ثابت ہوئی کہ اس نے تاتاری معاشرے کی اصلاح و ترقی کا رُخ موڑ دیا اور جس میں ۱۹۱۷ء کے انقلاب تک کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔

کیتھرائن دوئم کی روادارانہ پالیسی کے بعد اس علاقے کی فضا بڑی سازگار ہوگئی اور روس کی عملداری جب جنوب مشرق میں پھیلی تو تاتاریوں نے اس میں

نہ صرف برابر کا حصہ لیا بلکہ بڑا نمایاں کردار ادا کیا۔ انیسویں صدی میں جب روسیوں نے وسطی ایشیا میں اقتدار قائم کرنا شروع کیا تو تاتاری تاجروں کو نئی منڈیاں مل گئیں اور چونکہ لسانی اور نسلی اعتبار سے وہ وسطی ایشیا کے لوگوں سے تعلق رکھتے تھے لہٰذا روسی تاجروں کے مقابلے میں ان کو نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔ اٹھارہویں صدی کے آخر میں کیتھرائن کی اصلاحات کے باوجود تاتاری امراء کا زوال جاری رہا، روسی حکومت کی مسلم دشمنی کا سب سے بڑا نقصان ان امراء کو پہنچا تھا اور تاجروں نے تاتاری معاشرے میں اہم کردار حاصل کرلیا۔ آہستہ آہستہ بچے کھچے امراء اور رؤسا نے صنعت اور تجارت کو اپنا لیا۔ ۱۸۲۱ء میں تاتاری کسانوں کو بھی تجارت میں حصہ لینے کی اجازت دیدی گئی۔

تاتاریوں نے اپنے آباؤاجداد کے تجارتی پیشے کو از سرِ نو زندہ کیا اور سترہویں صدی میں وسطی ایشیا کی کل تجارت تاتاریوں اُزبک اور تاجک تاجروں کے ہاتھوں میں آگئی ان کی تجارتی سرگرمیاں سائبیریا کی سرحدوں تک پہنچ گئیں، جہاں انہوں نے بہت سے لوگوں کو دوبارہ مسلمان بنالیا۔ اٹھارویں صدی کے شروع میں وسطی ایشیا کی تمام تر تجارت پر وسط ایشیائی مسلمانوں کا تسلط ہوچکا تھا۔ کیتھرائن کی روادارانہ پالیسی کے بعد تاتاریوں کی تجارتی سرگرمیوں میں مزید اضافہ ہوگیا اور بخارا اور تاشقند کے دو نئے تجارتی راستے کھل گئے۔

انیسویں صدی میں قزاقستان اور اُزبیکستان کی تمام تر تجارت تاتاریوں کے ہاتھ میں آچکی تھی۔ حکومت روس نے اپنے باشندوں کی خاطر غیر ملکی تاجروں کی سرگرمیوں کو محدود کردیا جس کے نتیجے میں ایرانی اور اُزبیک تاجر قزاقستان تک محدود کردیئے گئے۔ ان روسی قوانین کی وجہ سے تاتاریوں کو بہت فائدہ پہنچا اس کے علاوہ تاتاریوں نے وسطی ایشیا کے باشندوں سے اپنے لسانی اور نسلی تعلق کا بھی پورا پورا

فائدہ اٹھایا۔ اُزبیکستان میں بخارا، خیوا[۱] اور خوقند کی تجارتی منڈیوں میں عیسائی اور یہودی تاجروں پر پابندیاں عائد تھیں لیکن مسلمان ہونے کی وجہ سے تاتاری تاجر آزادی سے کاروبار کر سکتے تھے۔ اس وجہ سے بیشتر روسی تاجر وسطی ایشیا میں تاتاریوں کے ذریعے تجارت کرتے تھے۔ جوں جوں وسطی ایشیا اُزبیکستان اور ترکمنستان میں صنعت و تجارت کو فروغ ہوا تاتاریوں کی خوشحالی بڑھتی گئی۔ اس معاشی خوشحالی کے نتیجے میں تاتاریوں کا معاشی اقتدار بھی بڑھنے لگا اور انیسویں صدی کے آخر تک نہ صرف وسطی ایشیا بلکہ والگا، یورال، مغربی و مشرقی سائبیریا، روسی مشرق بعید اور وسطی روس کے بڑے بڑے شہروں میں تاتاری کارخانے اور دفاتر قائم ہو چکے تھے۔ تاتاری تاجروں نے اجارہ داریاں قائم کر لی تھیں اور اکثر علاقے ان کے مکمل معاشی اقتدار میں آ چکے تھے۔ کئی تاجروں کے گماشتے اور دفاتر نہ صرف روس کے بڑے بڑے شہروں میں بلکہ برلن، پیرس، لندن اور نیویارک تک میں موجود تھے۔

تجارت کے علاوہ تاتاری تاجروں نے صنعت میں بھی سرمایہ لگایا۔ اٹھارویں صدی کے آخر میں قازان کی ایک تہائی صنعت ان کے ہاتھوں میں تھی۔ کپڑے، صابن اور چمڑے کی صنعت ان کی اجارہ داری بن گئی۔ یورال میں انہوں نے سونا نکالنے اور لکڑی کاٹنے کے کاموں میں بھی حصہ لیا۔ الغرض یہ کہ تاتاری تاجر سوسائٹی کا سب سے اہم اور مضبوط رکن بن گئے۔

انقلاب روس تک روس کے مشرقی علاقوں میں تاتاری تجارت فروغ پاتی رہی۔ ۱۸۷۰ء میں ترکستان کی فتح کے بعد وسطی ایشیا میں ان کی اجارہ داری ختم ہو گئی

---

[۱] یہ خوارزم میں واقع ہے۔ قدیم زمانہ میں خوارزم نام تھا۔

اور مسلمانوں کی مزاحمت کے باوجود روسی تاجر اور روسی سرمایہ ترکستان اور وسطی ایشیا میں نمایاں ہونے لگا۔ وسطی ایشیا سے روئی درآمد کی جاتی تھی چنانچہ اس صنعت کو فروغ دینے کے لئے اورن برگ ۔ تاشقند ریلوے کی بنیاد پڑی[1] اور بیشمار روسی سرمایہ آنے لگا۔ ترکستان پر روسی حکومت قائم ہو جانے کی وجہ سے ماسکو اور ترکستان میں براہِ راست رابطہ قائم ہو گیا اور تاتاریوں کا واسطہ ختم ہو گیا ان سب حالات نے تاتاریوں کی معاشی و اقتصادی حالت کو زک پہنچائی۔ قزاقستان میں بھی روسی نوآبادیاں قائم ہونے کے بعد تاتاری اقتصادی اثر کم ہو گیا اور روسی مقابلے کے نتیجے میں تاتاری اجارہ داریاں ختم ہونے لگیں۔ لیکن وسطی ایشیا میں لسانی نسلی اور تمدنی قربت کی وجہ سے تاتاریوں نے روسیوں کی سخت مزاحمت کی حتی کہ روسی تاجروں نے مقامی حکومت سے درخواست کی کہ تاتاری تاجروں کی سرگرمیوں کو قانوناً محدود کر دیا جائے لیکن اس میں صرف ان کو اتنی کامیابی ہوئی کہ تاتاریوں کو ترکستان میں جائداد خریدنے سے روک دیا گیا۔

گو اس بڑھتے ہوئے روسی مقابلے نے تاتاریوں کو کسی حد تک قزاقستان اور وسطی ایشیا کی تجارت سے بے دخل کر دیا مگر روس کی تیزی سے فروغ پاتی ہوئی صنعت، تجارت اور اقتصادی زندگی میں اور نئی نئی راہیں کھل گئیں۔ تاتاریوں نے والگا کی صنعت اور یورال کی کان سازی کی صنعت میں اپنی سرگرمیاں تیز کر دیں، انہوں نے چین اور منگولیا سے تجارت بڑھائی شروع کر دی اور سائبیریا کی نئی منڈیوں میں سرمایہ لگانے لگے۔ روس کے عظیم خطے میں محنتی اور جفاکش انسانوں کے لئے روزگار اور اقتصادی ترقی کی کوئی کمی نہ تھی۔

---

[1] ریلوے لائن ۱۸۹۹ء اور ۱۹۰۶ء کے درمیان مکمل ہوئی۔

تحریک اتحاد اسلامی و دور اصلاحات

انیسویں صدی میں تاتاری نشاۃ ثانیہ صرف معاشی اور اقتصادی دائرے تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ مذہبی اور ثقافتی دائرے میں بھی از سر نو زندگی بڑھی ۱۷۸۸ء کے ضابطے کے تحت مذہبی تعلیم کے لئے بڑی سہولتیں پیدا ہوگئیں۔ تاتاری اسکولوں میں دینی تعلیم کا معیار بہت پست تھا اس کے برعکس بخارا کے مدرسے وسطی ایشیا اور اسلامی دنیا میں مشہور و معروف تھے چنانچہ نوجوان تاتاری ان مدرسوں میں تعلیم کے لئے بھیجے گئے لیکن ان مدرسوں کا نظام اور طریقۂ تعلیم فرسودہ ہو چکا تھا اور تاتاری طالب علموں میں بے اطمینانی پھیلنے لگی۔ تاتاریوں کے مشہور مورخ اور مصلح شہاب الدین مرجانی (۱۸۱۵ء-۱۸۸۹) نے ۱۸۴۹ء میں والگا کے خطے میں اصلاح و تنظیم کا بیڑا اٹھایا۔ شہاب الدین نے ۱۲ سال بخارا میں گذارے تھے اور وہ اس نظریئے کے حامی تھے کہ ہر مسلمان کو قرآن سمجھنا چاہیئے، ان کا خیال تھا کہ پرانی درسی کتابیں مبہم اور غیر واضح ہیں اور ایک عام طالب علم ان کو سمجھنے سے قاصر ہے، اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ مسلمانوں کو روسی زبان سیکھنی چاہیئے اور نئے نظام تعلیم سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ ان میں سے کوئی بھی بات اسلام کے منافی نہیں ہے۔ اس کے برعکس اس تعلیم سے مسلمانوں کے عقائد اور ایمان کو مزید تقویت پہنچے گی۔ شہاب الدین مرجانی پر جوش اور باعمل انسان تھے اور اپنے خیالات اور عقائد کو پھیلانے کے لئے انہوں نے

انتھک کوششیں کیں، بالآخر ۲۰ سال کی کوششوں کے بعد انہوں نے قازان کے ایک لکھ پتی تاجر ابراہیم یونس کو ایک نیا اسکول قائم کرنے پر راضی کر لیا۔ انہوں نے اس دوران میں بلغار اور تاتار قبائل پر مستند تاریخی کتابیں تصنیف کیں، مرجانی کی ان تصانیف نے تاتاریوں میں اپنے ماضی سے بڑی دلچسپی پیدا کر دی اور اس لحاظ سے تاتاریوں کے قومی شعور کو بیدار کرنے میں مرجانی کا بڑا حصہ ہے۔ شہاب الدین مرجانی کی کوششوں کے باعث تاتاریوں میں روسی زبان اور مغربی تمدن سے نفرت بڑی حد تک کم ہوگئی اور نتیجۃً تاتاریوں میں نیا اسلوب تعلیم اور نئے فکر و انداز مقبول ہونے لگے۔ تاتاریوں کی اصلاح میں قیوم ناصری (۱۹۰۲ — ۱۸۲۴ء) نے بھی بڑا اہم کردار ادا کیا، وہ مشہور ادیب اور ناشر تھے، انہوں نے چغتائی زبان کو چھوڑ کر جو تقریباً مفقود ہو چکی تھی لیکن ہنوز ادبی حیثیت رکھتی تھی، تاتاری زبان میں بیشمار درسی کتابیں، لغات اور کوائف لکھے۔ تاتار تاریخ میں پہلی مرتبہ جغرافیائی، تاریخی و سائنٹفک مضامین ان کی اپنی مقبول عام زبان میں سامنے آئے، ناصری نے تاتاری زبان کو اونچی سطح پر پہنچا دیا۔ حتی کہ اس صدی میں یہ زبان اہل تاتار کی ادبی زبان بن گئی۔

تاتاری متوسط طبقے کی سرپرستی میں والگا اور یورال کے تاتاریوں میں انیسویں صدی کے وسط میں تصنیف و تالیف نے بڑی ترقی کی اور تعلیم کے ساتھ ساتھ تمدنی و ثقافتی سرگرمیوں کو بھی فروغ ہوا۔ متوسط طبقے نے جابجا اسکول اور مساجد قائم کیں اور کتابیں طبع کروائیں۔ تاتاریوں نے کیتھرائن کے دور حکومت میں قرآن اور مذہبی کتابیں شائع کرنے کی اجازت حاصل کی تھی اور ۱۸۰۰ء تک تقریباً ۱۴۰۰۰ قرآن اور مذہبی کتابیں طبع ہوئیں، ۱۸۵۰ء کے دوران صرف قازان یونیورسٹی نے قرآن کے ۳ لاکھ نسخے طبع کئے اور آئندہ دس پندرہ سالوں میں اشاعت کی

تعداد دس لاکھ کے قریب پہنچ چکی تھی[۵] اسی طرح مذہبی ادارے کے تحت اسکولوں کی تعداد میں بھی بڑا اضافہ ہوا۔ ۱۸۴۴ء میں کل ۴ مدرسے تھے اور ۱۸۶۰ء تک ڈیڑھ ہزار سے زیادہ مکتب قائم ہو چکے تھے۔

تاتاریوں کی اس تیز رفتار تمدنی تہذیبی اور اقتصادی ترقی سے حکومت روس کو تشویش لاحق ہوگئی اس کے علاوہ الگزنڈر دوئم (ALEXANDER II) کے دور حکومت میں، ۱۸۶۵ء کے لگ بھگ، مسلمانوں کی آبادی میں بھی بڑا نمایاں اضافہ ہوا اور ان کی تعداد ایک کروڑ کے قریب پہنچ گئی۔ اس ترک اقلیت کی باگ ڈور تاتاریوں کے ہاتھ میں تھی۔ قزاقستان اور ازبکستان کے الحاق کے بعد ترک اقوام سلطنت روس کا جز بن گئیں اور اب ان کو حکومت میں شامل کرنے کا مسئلہ در پیش ہوا۔ روس اور ترکی کی ۱۸۷۸ء کی جنگ نے تاتاری، روسی تعلقات کو اور بھی پیچیدہ اور دشوار کر دیا اور حکومت کا رویہ مسلم رعایا کی طرف خاصا معاندانہ ہوگیا یورپ اور روس میں قومیت کے ابھرتے ہوئے تصور نے تاتاری قومی شعور کو بھی اثر انداز کیا۔ ریلوے اور بحری سفر کی سہولتوں نے مختلف ترک اقوام اور سلطنت عثمانیہ میں آسان رابطہ پیدا کر دیا خلیفۃ المسلمین اور مکہ مدینہ کے والی کی حیثیت سے عثمانی سلطان کا روسی مسلمانوں پر بڑا اثر و رسوخ تھا۔ کریمیا کی جنگ نے حکومت زار اور تاتاریوں کے درمیان تعلقات کو سنگین بنا دیا، والگا کے خطے میں ترکی افواج کی فتوحات کی خبریں گشت کرنے لگیں اور مسجدوں میں ترکی کی فتح کے لئے دعائیں کی گئیں۔ ان حالات میں تاتاریوں نے روسی فوج میں لڑنے سے انکار کر دیا۔ اور سینکڑوں فوجی بھاگ گئے۔ ۱۸۵۶ء

۵۔ ISKHAKI

تک تقریباً ڈیڑھ لاکھ کریمیائی تاتار ترک وطن کرکے ترکی چلے گئے۔ ترک وطن کی یہ تحریک والگا کے تاتاریوں تک پھیل گئی۔ سلطنت عثمانیہ سے اس عقیدت اور لگاؤ نے روس کے تاتاریوں میں تحریک اتحاد اسلامی کی بنا ڈالی۔

مذہبی اور نسلی اتفاق کے بڑھتے ہوئے جذبات کا اظہار اس سے بھی ہوتا ہے کہ ان تاتاریوں کی کثیر تعداد جس نے ترک اسلام کر دیا تھا پھر مسلمان ہوگئی اور اس کے ساتھ ہی مسلمان مبلغین کو بھی بڑی کامیابیاں ہوئیں۔ حکومت کو ہمیشہ اس بات کا ڈر تھا کہ غیر مسلم اقلیتیں مسلمان نہ ہو جائیں اور جب والگا کے خطے میں تاتاریوں کی پُر زور تبلیغی اور ثقافتی سرگرمیوں کے زیر اثر فن، اوغوری اور چواش کثیر تعداد میں مسلمان ہونے لگے تو حکومت نے سخت اقدامات اٹھائے۔ تاتاریوں میں ان اقدامات سے غم وغصہ کی لہر دوڑ گئی اور جب یہ افواہ پھیلی کہ حکومت مسلمانوں کو جبراً عیسائی کرے گی تو مختلف شہروں اور علاقوں میں ہنگامے اور فسادات ہوئے۔ بہت سے تاتاری گرفتار کرکے سائبیریا جلاوطن کر دیئے گئے اور حکومت نے تاتاری مفکروں اور دانشوروں کو افواہوں پر کان دھرنے پر سرزنش کی۔ لیکن ان سب باتوں اور شکوک وشبہات کے باوجود حکومت نے مسلم اداروں پر کوئی پابندی عائد نہیں کی۔ ترک قبائل روسی تمدن اور روسی زبان کی مخالفت کرتے رہے اور نتیجۃً وہ روسی زبان سے بے بہرہ رہے۔

انیسویں صدی کے نصف میں ایک روسی ماہر تعلیم المنسکی (ILMINSKY) نے یہ خیال ظاہر کیا کہ تاتاریوں پر سے مسلمان اسکولوں کا اثر مٹانے کے لئے جہاں اسلامی تعلیمات اور تمدن کی تعلیم دی جاتی ہے، نئے روسی اسکول قائم کئے جانے چاہئیں جن میں ذریعۂ تعلیم تاتاری زبان ہو۔ ان اسکولوں میں ابتدائی جماعتوں میں طلبا کو روسی تہذیب ان کی اپنی تاتاری زبان میں پڑھائی جائے اور پھر

بڑی جماعتوں میں روسی زبان کی تعلیم دی جائے۔ المنسکی کا خیال تھا کہ غیر روسی باشندوں میں روسی زبان اور روسی تہذیب کو پھیلانے کا بہترین طریقہ ہے۔ انہوں نے روسی حروف پر مبنی تاتاری حروف تہجی ایجاد کئے۔ ۱۸۶۳ء میں قازان میں اس قسم کا پہلا اسکول قائم ہوا جس میں بیشتر اساتذہ تاتاری تھے اولاً حکومت نے اس تجربے کو مشکوک نظروں سے دیکھا، اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ ان اسکولوں کے ذریعے تاتاری قومیت کو مزید تقویت پہنچے گی اور روسی تہذیب کو فروغ نہ ہو سکے گا لیکن کلیسائے روس نے المنسکی کی حمایت کی اور صدی کے آخر تک تقریباً ننو ایسے اسکول قائم ہو گئے۔ غیر مسلم تاتاری اقلیتوں میں یہ اسکول بہت مقبول ہوئے اور یہ مسلمانوں کے مدرسوں سے بہتر ثابت ہوئے جہاں نصاب تعلیم صرف عربی فارسی اور قرآن پر مبنی تھا۔[1]

المنسکی کے اسکولوں کی افادیت کا اعتراف حکومت نے بھی کیا اور روس کی غیر روسی آبادی میں روسی زبان اور روسی تہذیب پھیلانے کے لئے ان ہی اسکولوں کی بنیاد پر بیشتر اسکول قائم کئے گئے۔ تاتاری علما اور دانشوروں نے ان اسکولوں کا مقصد سمجھ لیا کہ اس طرح حکومت تاتاریوں پر روسی تہذیب ٹھونسنا چاہتی ہے چنانچہ انہوں نے سخت مخالفت کی اور تاتاری عوام کو روسی تہذیب سے محفوظ رکھنے کی جد و جہد کی خوش قسمتی سے مدرسوں کے مقابلے میں، جو کہ ہر گاؤں اور قریہ میں قائم تھے، ان اسکولوں کی تعداد بہت کم تھی۔

تاتاریوں کی تعلیمی ترقی اور قومیت کی بیداری میں کریمیا کے ایک تاتاری

---

[1] قرآن اور درسی کتابیں عربی میں شائع ہوتی تھیں اور انیسویں صدی میں تاتاری اسکولوں کے نصاب میں تمام تر توجہ قرآن اور عربی کی تعلیم پر دی جاتی تھی۔ ۱۹۱۷ء تک زیادہ تر نصاب قرآن، عربی اور فقہ کی تعلیم پر مبنی تھا۔

اسمٰعیل بے گسپرالی (۱۹۱۴ - ۱۸۵۱ء) کا بہت نمایاں حصہ ہے۔ روسی ترکوں کی تاریخ میں اسمٰعیل بے کی شخصیت سب سے زیادہ نمایاں اور اہم ہے۔ اسمٰعیل بے نے باغچہ سرائے اور ماسکو میں تعلیم حاصل کی جہاں ان کی مشہور روسی صحافی کاٹکوف (KATKOV) کے ساتھ ملاقات ہوئی۔ باغچہ سرائے واپس آنے پر اسمٰعیل بے نے چند مشہور و معروف روسی آزاد خیال مفکروں کی کتابوں سے استفادہ کیا جس کا ان کے اوپر بہت اثر ہوا[۱]۔ اس کے بعد اسمٰعیل بے پیرس اور پھر وہاں سے کچھ عرصے کے لئے قسطنطنیہ چلے گئے۔ ان مقامات کے قیام نے ان کی زندگی پر گہرا اثر ڈالا اور ان کی آئندہ زندگی کی سرگرمیاں آزادانہ قومیت کے نظریئے کی پُر زور حامل ہوگئیں۔

ترکی میں دو نظریات نے، جو اس وقت وہاں رائج تھے، ان پر بہت گہرا اثر ڈالا۔ پہلی تحریک "جدید عثمانی" تھی جس کی بنیاد ادیب و مصنف نامق کمال، شناسی آفندی اور ضیا پاشا نے ڈالی تھی۔ اس تحریک کی بنیاد دورِ تنظیمات (۱۸۲۶ء - ۱۸۸۰ء) میں پڑی جبکہ سلطنت عثمانیہ میں انتظامی اور تعلیمی اصلاحات کا دور شروع ہوا۔ اس تحریک کے بانی مبانی جوان عثمانی ترک تھے جنہوں نے ترکی ادب میں نئی راہیں کھولیں اور یوروپی ادب سے اثر انداز ہوئے۔ اس سے قبل عثمانی شعر و ادب کی بنیاد فارسی پر تھی اور تمام تر اثر ایرانی تھا۔ ۱۸۵۹ء کے بعد ترکی شاعروں اور ادیبوں نے فردوسی، جامی اور دوسرے فارسی اساتذہ کی تقلید چھوڑ کر ہیوگو اور بلزاک کی نقالی شروع کر دی۔

دوسرا نظریہ جو اس وقت قسطنطنیہ میں بیحد مقبول تھا اور جس سے اکثر و بیشتر

---

[۱] ولیدی

دانشور اور مفکرین اثر انداز تھے وہ جمال الدین افغانی (۱۸۳۹ — ۱۸۹۷ء) کی تحریک اتحاد اسلامی (PAN-ISLAMISM) تھی۔ جمال الدین افغانی نے اس بات کی تلقین کی کہ اسلام کو لغویات اور فضولیات سے پاک کر کے مسلمانوں کے ذہنی اور تعلیمی معیار کو بلند کیا جائے۔ سیاسی طور پر مسلمانوں کے ذہنی اور تعلیمی معیار کو بلند کیا جائے۔ سیاسی طور پر وہ اس بات کے لئے کوشاں تھے کہ مسلمانوں کو یورپ کے عیسائی حکمرانوں سے آزاد کرا کے ایک اخوت اور ایک امت میں پرو دیا جائے۔ مختلف مسلم طبقات اور گروہوں میں رکاوٹیں نہ ہوں اور تمام مسلم ممالک کا ایک مضبوط وفاق قائم ہو جائے۔ انیسویں صدی کے اواخر میں اس تحریک اتحاد اسلامی سے مسلمانوں کا نوجوان طبقہ بے حد متاثر تھا اور سلطان عبدالحمید (۱۸۷۶-۱۹۰۸) نے بھی اس نظریئے کی سرپرستی کی۔ ان کو یہ امید تھی کہ اس تحریک سے دنیا کے تمام مسلمانوں کو متحد کر کے وہ ان کی قیادت و خلافت سنبھال لیں گے۔

کریمیا واپس آنے پر، جمال الدین افغانی کے زیر اثر، اسمٰعیل بے نے روسی مسلمانوں کو متحد کرنے کی مہم شروع کی۔ ۱۰ اراپریل ۱۸۸۳ء کو ان کے اخبار "ترجمان" کا پہلا پرچہ شائع ہوا۔ اس رسالے نے آئندہ ۲۵ سالوں تک روسی ترکوں کے سیاسی اور ذہنی نظریات کی رہنمائی کی۔ اسمٰعیل بے کی بے پناہ صلاحیتوں نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کی، وہ ایک عظیم قومی رہنما اور مصلح قوم تھے۔ انہوں نے روس کے مسلم صوبوں کا دورہ کیا اور وہاں سب کو ذاتی تعلقات اور خط و کتابت کے ذریعے اتحاد اسلامی کی تلقین و تبلیغ کی۔ انیسویں صدی کے آخر میں اسمٰعیل بے روس کے ترک لیڈروں میں سب سے زیادہ اہم اور مقبول رہنما تھے۔ ان کی شہرت باہر کے ملکوں تک پہنچ چکی تھی اور ہر جگہ ان کی بات احترام سے سنی جاتی تھی۔

اسمٰعیل بے نے اتحاد کے تین اصول پیش کئے جو اُن کے فکر و عمل کی اساس تھے اول، اتحاد لسانی ۔ دوم، اتحاد فکری ۔ اور سوم، اتحاد عمل ۔ اتحاد سے ان کی مراد روس کے تمام تر مسلمانوں کا اتحاد تھا اور چونکہ روسی مسلمانوں کی اکثریت ترک قبائل پر مبنی تھی لہٰذا بالفاظ دیگر ان کی اپیل کا مقصد روسی ترکوں کی قومی یک جہتی تھا اور اس طرح غیر شعوری طور پر، بلاارادہ و قصد، اسمٰعیل بے اور ان کے رفقار نے روس میں ترک قومیت کی بنیاد ڈالی ۔ لسانی اتحاد کے اصول نے بھی اس قومیت کو ہوا دی کیوں کہ ظاہر ہے کہ روسی مسلمانوں میں صرف ترک زبان ہی متحدہ اور مقبول عام زبان بن سکتی تھی ۔ اصولی طور پر اسمٰعیل بے بلا لحاظ جغرافیائی حدود دنیا کے تمام مسلمانوں کے اتحاد کی تبلیغ کر رہے تھے وہ مسلمانوں کو قرون وسطی کی تاریک ذہنیت سے آزاد کرانا چاہتے تھے جس نے ان کو موجودہ دور کی ترقی سے علیحدہ کردیا تھا اور چاہتے تھے کہ مسلمان یورپ کی موجودہ تہذیب سے خاطر خواہ استفادہ کریں ۔ وہ نہ صرف مسلمانوں کے طریق زندگی میں تبدیلیاں چاہتے تھے بلکہ مسلمان عورتوں کی آزادی کے لئے بھی پیش پیش تھے ۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ مسلم تہذیب و تمدن کو بھی برقرار رکھنا چاہتے تھے ۔ جہاں وہ عوام کو ترکی زبان سیکھنے کی تلقین کرتے وہاں وہ ساتھ ہی عربی پڑھنے کی ہدایت بھی کرتے تاکہ قرآن اور حدیث سے رابطہ نہ ٹوٹنے پائے ۔ انہوں نے اسکولوں سے فارسی کی کتابیں ہٹا کر قسطنطنیہ سے نئی ترکی زبان کی کتابیں شامل کیں ۔

اسمٰعیل بے نے مسلم ثقافتی اور تمدنی اتحاد کی خاطر عثمانی ترکی کو عام زبان بنانے کے لئے اس کو اسکولوں اور اخباروں میں رائج کرنے کی سفارش کی ۔ انہوں نے اپنے اخبار "ترجمان" میں نہ تو ترکوں کی صدیوں پرانی ادبی زبان چغتائی استعمال کی اور نہ ناصری کی رائج کردہ تاتاری زبان لکھی ۔ انہوں نے نئی عثمانی ترکی زبان لکھی ۔

کریمیا اور اس کے جنوبی علاقوں اور آذربیجان میں ترکی سے قربت کی وجہ سے "ترجمان" کی زبان عام فہم تھی لیکن والگا کے خطے میں قزاقستان اور وسطی ایشیا میں بغیر تعلیم کے اس کو سمجھنا ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ اسمٰعیل بے اور تاتاری دانشوروں کی کوششوں کے باوجود ایک عام فہم ترکی زبان رائج کرنے کی کوششیں بارآور نہ ہو سکیں۔ ترکوں میں علاقائی اور لسانی انتشار ہزاروں سال سے آچکا تھا اور اب اس مرحلے پر ایک عام فہم ادبی زبان کی تخلیق یا کوشش ناممکن تھی۔

یہ بات قابل حیرت ہے کہ اسمٰعیل بے کی تمام تر کوششیں ترک قبائل کے مذہبی، ثقافتی اور لسانی اتحاد پر مرکوز تھی لیکن انہوں نے کسی سیاسی تحریک کی مہم نہیں چلائی۔ ان کے ذہن میں روسی ترکوں کو متحد کرنے کی غرض و غایت یہ تھی کہ عالمی اتحاد اسلامی کو تقویت ملے۔ وہ اس بات کو بخوبی سمجھتے تھے کہ زار روس یا عثمانی خلیفہ کسی ایسی تحریک کو پسند نہیں کریں گے جس سے ان کے اقتدار کو ٹھیس لگنے کا خطرہ ہو۔ چنانچہ مسلم اتحاد کی کوششوں میں وہ حکومت روس* کی طرف سے بہت محتاط تھے۔ ۱۸۹۶ء میں انہوں نے ایک کتابچہ "معاہدۂ شرقِ روس" میں لکھا کہ

"مسلمان اور روسی اکٹھے کاشتکاری، زراعت اور ملازمت کر سکتے ہیں۔"

۱۹۰۵ء میں انہوں نے کہا کہ

"روسی اور ترک ایک ایسے مشترکہ رشتے میں جڑے ہوئے ہیں جو التائی اور پامیر کی وادیوں سے لے کر بحیرۂ بالٹک تک پھیلا ہوا ہے، یہ بڑا پرانا رشتہ ہے اور مستقبل میں بھی ان لوگوں کو شانہ بشانہ اور قدم بہ قدم چل کر اپنی زندگیوں کا

مشترکہ لائحہ عمل تیار کرنا ہوگا۔"[۱]

ان کے خیال میں تاریخ ایک دن خود بخود ترک قبائل اور روسیوں کو اتحاد باہمی کے رشتے میں پرو دے گی اور دونوں ایک ہی ریاست کے فرد بن جائیں گے

"تاریخ کے دھارے نے قازان، استرخان، سائبیریا، کریمیا اور قفقاز کو روس کا حصہ بنا دیا ہے۔ حال میں وسطی ایشیاء کی چند ولایتیں سلطنت روس کا جزو بن چکی ہیں اور روس کی قدرتی حدیں ابھی تشنہ ہیں۔ ہمارا خیال ہے دیر سویر تمام تاتاری روس کی سرحدوں میں شامل ہو جائیں گے۔ مستقبل میں، اغلباً روس ایک اہم مسلم ریاست بن جائے گا اور یہ حیثیت اس کی عظیم مسیحی سلطنت کو نظرانداز نہ ہونے دے گی۔"[۲]

اسمٰعیل بے کے نزدیک روس کا اہم ترین سیاسی مسئلہ اپنے مسلمان ہمسایوں ترکی اور ایران سے دوستانہ تعلقات بڑھانا تھا، انہوں نے رائے پیش کی کہ روس ان سے دوستانہ معاہدے قائم کر لے۔

"تصور کیجئے کہ روس نے ترکی اور ایران سے دوستانہ تعلقات قائم کئے — ہمسایہ مسلم سلطنتوں سے پائیدار معاہدے کر کے روس کی جنوبی سرحد محفوظ ہو جائے گی جس سے روس کی طاقت کو مغرب اور مشرق بعید میں تقویت پہنچے گی۔ ایران اور ترکی کی حمایت سے روس مشرق کے مسلمانوں کے نزدیک آجائے گا اور

---

[۱] "ترجمان" ۱۵ اپریل ۱۹۰۵ء

[۲] I. GASPERALI: "RUSSKOE MUSUIMANSTVO" (BAKHCHISARAI 1881)

اس طرح وہ مسلم ملتوں کی سربراہی حاصل کرلے گا جس کے لئے
انگلینڈ اس قدر کوشاں ہے"۔[1]

تاریخی حقیقت اور روس میں ترکوں کی کسمپرسی کو سمجھنے کے باوجود وہ اسلام اور ترکوں کی منفرد حیثیت کو برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ اسمٰعیل بے نے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا کہ ترک اور روسی میل جول اسی صورت میں بڑھ سکتا ہے کہ تاتاریوں کا تعلیمی معیار بلند کیا جائے اور یہ اسی وقت ممکن ہے کہ روسی حکومت تاتاری زبان کو ذریعہ تعلیم تسلیم کرے۔

اسمٰعیل بے کی نظروں میں مسلم سوسائٹی اور خصوصاً ترک مسلم اتحاد کی بقا کے لئے تعلیم سب سے اہم تھی چنانچہ ان کی تمام تر کوششیں تعلیم کو فروغ دینے اور نئے اسکول کھولنے پر مبنی تھی۔ انہوں نے اپنے آبائی وطن باغچہ سرائے میں جو "ترجمان" کی اشاعت کے بعد سے تاتاری ثقافت کا اہم مرکز بن گیا تھا ایک نیا اسکول کھولا جس کے نمونے پر بعد میں اور اسکول قائم ہوئے۔ ان اسکولوں میں نئے اصولوں اور طریقوں سے تعلیم دی جاتی تھی اس لئے یہ "اصول جدید" اسکول کے نام سے پکارے جانے لگے اور ترقی پسند تاتاریوں نے اپنے کو "جدید" کہنا شروع کر دیا۔ ان اسکولوں میں عربی صوتی طریق سے بڑھائی جاتی تھی اور ہجے کا طریقہ ختم کر دیا گیا یہ طریقہ تعلیم کافی مقبول ہوا اور جلد ہی چین، ایران اور ہندوستان تک پھیل گیا۔ اسمٰعیل بے نے قرآن اور فقہ کی تعلیم کے علاوہ حساب، تاریخ اور جغرافیہ کے مضامین کو بھی نصاب میں شامل کیا۔ اسمٰعیل بے نے اس بات پر غور ہی نہیں کیا کہ اصول جدید اسکولوں میں عربی کی جگہ ترکی آجانے سے اسلامی روایات کا اثر کم

---

[1] I. GASPERALI: "RUSKO-VOSTOCHNOE SOGLASHENIE" (B-S. 1896)

ہونے لگے گا اور قدیم تہذیب و تمدن کی اقدار گھٹنے لگیں گی۔ "جدید" اور ان کے مخالفین "قدما" میں جو اصول قدیم کے حامی تھے اس بات پر رخنہ ہو گیا لیکن اصول جدید بہت مقبول ہوا اور ۱۹۱۴ء تک تقریباً ۵ ہزار تاتار اور مسلم اسکولوں میں یہ طریق تعلیم نافذ ہو چکا تھا۔ وسطی ایشیا کے اسکولوں، قفقاسیہ کے علاقے میں اور والگا۔یوزال کے قدیم اسکولوں میں "اصول جدید" رائج نہیں ہو سکا لیکن تاتاریوں میں تعلیم تیزی سے پھیلتی رہی اور انقلاب کے وقت تاتاریوں اور روسیوں میں تعلیم کا تناسب تقریباً برابر تھا[۱]۔ تاتاری مدرسوں کی حالت ناگفتہ تھی اور سوائے اوفا کے مدرسۂ عالیہ، اورن برگ کے مدرسۂ حسینیہ اور قازان کے مدرسۂ محمدیہ، کسی مدرسہ میں بھی موجودہ اعلیٰ نصاب تعلیم نافذ نہیں تھا۔

اولاً تاتاری متوسط طبقہ نے اسمٰعیل بے کی سرگرمیوں کو شک و شبہ کی نگاہوں سے دیکھا لیکن بعد میں ان کی رائے بدل گئی، روسی حکام سے تعلقات میں کشیدگی پیدا ہونے پر تاتاریوں میں قومی شعور کو فروغ ملا اور تاتاری تاجروں کو نئے اسکولوں کی اہمیت و افادیت کا احساس ہوا چنانچہ انہوں نے مکتبوں، مدرسوں، استادوں کی تربیت اور روسی کتابوں کی طباعت و اشاعت کے لئے فراخدلی سے مالی امداد دی۔

تاتار اسکولوں کی روزافزوں ترقی کے باوجود مسلمانوں کا نظام تعلیم غیر پختہ تھا اور مدرسوں کا معیار روسی "جمنیزیم" (GYMNASIUM) ہائی اسکول

---

[۱] محکمہ تعلیم کے اعداد و شمار کے مطابق ۱۰ ہزار مکتب اور ۲۵ ہزار مدرسے قائم تھے۔ تاتاریوں میں تعلیم کا تناسب ۲۴ فیصد اور روسیوں میں ۲۵ فیصد تھا۔

سے پست تھا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ بیسویں صدی کے بیشتر تاتاری قوم پرست یا تو قازان کے روسی کالجوں اور یونیورسٹی کے پڑھے ہوئے تھے یا پھر وہ قسطنطنیہ یا فرانس سے تعلیم حاصل کرکے آئے تھے چندے معدودے تاتاری مدرسوں کے تعلیم یافتہ تھے[1]

بیسویں صدی کے شروع میں تاتاری دانشوروں اور مفکرین کی خاصی بڑی جماعت پیدا ہوچکی تھی جو نظریات اور خیالات میں روسی ہمعصروں کی ہم پلہ تھی بیشمار تعلیمی اداروں، اشاعت گھروں اور ادبی سرگرمیوں کی وجہ سے قازان کا شہر اسلامی دنیا کا ایک اہم ثقافتی مرکز بن گیا۔ تاتاریوں کی اکثریت مذہب کی سخت پابند تھی اور وہ اب بھی اچھے مسلمان تھے لیکن اب سیاسی عمرانی نظریات میں وہ بخارا کے بجائے ماسکو، پیٹرزبرگ، قسطنطنیہ اور پیرس کے زیر اثر آگئے۔ روسی سوسائٹی کے متوازی تاتاریوں میں بھی اسی قسم کی سیاسی گروہ بندیاں بن گئیں۔

تاتار کی روزمرہ زندگی میں بھی تغیر و تبدل آگیا، پڑھے لکھے طبقے میں عورتوں کو قدرے آزادی مل گئی۔ تاتار امیر، جاگیردار یا تاجر کے رہن سہن اور روسیوں کے رہن سہن میں کوئی فرق نہیں رہا۔ تاتاری کے ظاہری حلیہ، لباس، طور طریق یا تمیز تہذیب میں کوئی ایشیائی عنصر نہیں رہ گیا۔ یہاں تک کہ آذربیجان کے ایک مشہور رسالے، "فیوضات"[2] کا مقولہ "مذہب اسلام، خیالات فرانسیسی، حلیہ یورپین" تھا۔ ۱۹۰۶ء میں جب یوسف آقچورا (۱۸۷۶ء — ۱۹۳۵) نے روسی کیڈٹ[3] کانگریس

---

[1] مثلاً الیاس آلین، صدری مقصودی آغا اوغلو، حسین زادہ اور یوسف آقچورہ

[2] اس کے ایڈیٹر حسین زادہ تھے اور اس کے ایک مشہور مقالہ نویس آغا اوغلو تھے

[3] ترکی زبان میں ان کو "قادت" کہتے ہیں۔

کے سامنے مسلم کیڈٹ کا پروگرام پیش کیا تو انہوں نے شستہ فرانسیسی میں تقریر کی[1] غرضیکہ نصف صدی کے اندر ہی اندر تاتاریوں کے اعلیٰ طبقے نے ایک نئی تہذیب کو جنم دیا اور بڑی حد تک یوروپین طور طریق اختیار کر لئے۔

تاتاریوں کے ادنیٰ طبقے خصوصاً دیہی آبادی کی حالت اس سے بہت مختلف تھی۔ قازان کے صوبے میں ۹۵ فی صد آبادی دیہاتوں میں تھی۔ ان دیہی آبادیوں میں رہنے والے تاتاریوں کا روسیوں سے ملنا جلنا برائے نام تھا اور وہ سختی سے قرآن پر پابند تھے اور اپنے مولویوں کے کہے پر عمل پیرا تھے۔ تاتاری تاجروں کے مقابلے میں ان کی حالت بڑی سقیم تھی اور کوششوں کے باوجود ان کے طریق زندگی میں کوئی خاص تبدیلی نہ ہوئی۔ انقلاب سے دس پندرہ سال قبل چند تبدیلیاں پیدا ہوئیں اور اوفا اور ارنبرگ کے علاقوں کے تاتاری نقل مکانی کر کے صنعتی مرکزوں خصوصاً ماسکو کی طرف جانے لگے۔ دور دراز کے علاقوں اور دیہاتوں میں ۱۹۰۵ء تک کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ اس کے بعد سے روسی مقبوضہ علاقوں کے ترک قبائل کی تاریخ کا نیا باب شروع ہوتا ہے۔

---

[1] یوسف نے ECOLE DES SCIENCES POLITIQUES (پیرس) میں تعلیم پائی تھی۔

تحریک قومیت[1]

۱۹۰۵ء میں روسی ترکوں میں قومی تحریک کی پہلی کرن ابھری۔ اس وقت تک تاتاری "جدید" ترقی پسندوں کی تمام تر کوششیں ثقافتی، مذہبی اور تعلیمی سرگرمیوں تک محدود تھیں اور ان کا مقصد صرف اتنا تھا کہ روس میں مسلمانوں کے مختلف گروہوں کے درمیان رابطہ قائم کر کے تعلیمی اور معاشرتی اصلاحات نافذ کی جائیں۔ اسمٰعیل بے اور ان کے ساتھیوں نے نہ تو کسی قومی تحریک میں حصہ لیا اور نہ کوئی سیاسی مہم چلائی۔ وہ کوئی ایسی بات نہیں کرنا چاہتے تھے جو قبل از وقت روسی حکومت کے عناد کا سبب ہو۔ چند منچلے تاتاری ترقی پسندوں کی نکتہ چینی پر اسمٰعیل بے نے جواب دیا کہ

"تہذیب و تمدن کے بغیر کوئی قوم کسی کام یا کاروبار اور صنعت کی بنیاد نہیں ڈال سکتی اور جب تک صنعت و روزگار نہ ہو اندرونی خلفشار اور کشمکش نہیں پیدا ہو سکتی۔ ہمارا اولین فرض آج تمدن کی ترقی اور بقا ہے"۔

انیسویں صدی کے آخری دس سالوں میں نوجوان تاتاری اور آذربیجانی میدان عمل میں آگئے، ان میں وہ ضبط و صبر نہ تھا جو پرانی نسل کا خاصۂ امتیاز تھا۔ بالآخر ان ہی میں سے وہ جماعت پیدا ہوئی جس نے خالص ترک قومیت تحریک کی بنا ڈالی۔

---

[1] K.F.FASEEV: ISTORII TATARSKOI (KAZAN 1955)

ان میں سے بیشتر نے قسطنطنیہ یا پیرس میں تعلیم پائی تھی اور وہیں سے وہ یہ سیاسی نظریات لے کر آئے تھے۔ ان میں سب سے پہلے قاضی عبدالرشید ابراہیم[۱] نے جو ادفا کے مسلم مذہبی انتظامیہ کے قاضی تھے روسی ترکوں میں سیاسی تحریک شروع کی۔ وہ ۱۸۹۵ء میں ترکی چلے گئے تھے اور وہاں سے انہوں نے روسیوں کے خلاف تاتار تاریخ میں پہلا کتابچہ "چولپان الدیزی" (روشن ستارہ) شائع کیا۔ اس کتابچے میں انہوں نے اس پرانے الزام کو دہرایا کہ حکومت روس تمام مسلمانوں کو بالجبر عیسائی بنانے کا منصوبہ تیار کر رہی ہے۔ انہوں نے تمام تاتاریوں اور اہل اسلام سے اپیل کی کہ وہ اس کے خلاف جدوجہد کریں۔ یہ کتابچہ خفیہ طور پر والگا اور یورالی خطے کے مسلمانوں میں تقسیم کیا گیا اور نتیجۃً کچھ فسادات ہوئے۔ ۱۹۰۴ء میں قسطنطنیہ کے حکام نے قاضی عبدالرشید ابراہیم کو روس جلاوطن کر دیا جہاں پیٹرزبرگ سے انہوں نے ایک رسالہ "آئینہ" شائع کرنا شروع کیا جس میں روس کے مسلمانوں کو اتحاد کی تلقین و تبلیغ ہوتی تھی[۲]۔

اسی سال قاہرہ سے نکلنے والے اخبار "ترک" میں جس کے ناشر ترکی کے مشہور اخبار نویس علی کمال تھے "اوچ طرفلی سیاست[۳]" کے عنوان سے ایک مضمون شائع ہوا جس کا ترک قومیت کے فروغ پر بہت گہرا اثر پڑا۔ اس مضمون کے مصنف ایک نوجوان تاتاری صحافی یوسف آقچورا (آقچورین) تھے۔ وہ ایک امیر صنعت کار کے

---

[۱] قاضی عبدالرشید ابراہیم نے ۱۹۱۷ء کے بعد جاپان میں تبلیغ و اشاعت اسلام کے سلسلہ میں بڑی خدمات سرانجام دیں اور انہی کی کوششوں سے جاپان میں مذہب اسلام کو قانوناً تسلیم کر لیا گیا۔ دوسری جنگ عظیم سے کچھ عرصہ قبل انہوں نے نوے سال سے اوپر کی عمر میں رحلت کی۔

[۲]۔ عبدالرشید ابراہیم "TATARY REVOLIUTSIU 1905"

[۳] سہ رخی سیاست۔

لڑکے تھے اور انہوں نے پیرس یونیورسٹی سے انسانیات اور قانون کی ڈگری حاصل کی تھی۔ ان پر فرانسیسی مفکر ارنسٹ رینان (ERNEST RENAN) اور دوسرے جرمن مفکرین کا گہرا اثر تھا۔ انہوں نے اپنے مضمون میں ترک قومیت کا ایک بالکل اچھوتا نظریہ پیش کیا۔ عثمانی سلطنت کی نشوونما کی روشنی میں انہوں نے ترک سیاسی نظریات کی چھان بین کی اور ان سب سیاسی روایات کو ماننے سے انکار کر دیا جن کی اساس پر تاتاری "جدید" اور "قدما" نے اپنا لائحہ عمل مرتب کیا تھا۔ یوسف کا خیال تھا کہ موجودہ دور میں جبکہ اسلامی ممالک میں مذہب کا اثر کم ہو رہا تھا جمال الدین افغانی اور اسمٰعیل بے کے نظریات فرسودہ ہو چکے ہیں۔ ساتھ ہی وہ ترکیہ کے "نوجوان ترکوں[1]" کی اس رائے سے بھی اختلاف رکھتے تھے کہ سلطنت عثمانیہ کا احیا مذہبی یا قومی بنیاد کے بجائے بین القومی اساس پر ہو۔ "نوجوان ترکوں" کا منشور تھا کہ طاقت حاصل کرنے کے بعد وہ سلطنت عثمانیہ سے مذہبی اور نسلی امتیاز مٹا کر محض آزادانہ نظریات پر حکومت قائم کریں گے جس میں بلا تفریق مذہب و ملت ہر شہری برابر کا حصے دار ہوگا۔ یوسف آقچورا کا عقیدہ تھا کہ مسلمانوں اور عیسائیوں میں بڑھتے ہوئے قومیت کے احساس کی وجہ سے ایسی کوئی اسکیم بار آور نہ ہوسکے گی۔ ان دونوں نظریات کی مذمت کرنے کے بعد یوسف نے ایک "تیسرا راستہ" تجویز کیا کہ روس، سلطنت عثمانیہ اور دوسرے ممالک کی ترک اقلیتوں کا سیاسی اتحاد قائم ہو۔ یوسف کا یہ فلسفہ مقبول جرمن نظریات "پان جرمن ازم" کا چربہ تھا اور اسی مناسبت سے اس کو بھی "پان ترکی ازم[2]" کا نام دیا گیا۔ اکثر و بیشتر لوگوں کو یوسف آقچورا کا یہ نظریہ

---

[1] ۔ ترکی میں "انجمن اتحاد و ترقی" سے وابستہ گروہ کا نام

[2] ۔ اتحاد اقوام ترک

خطرناک اور ناقابل عمل نظر آیا۔ یوسف کو خود بھی اس بات کا احساس تھا کہ یہ نظریئے کا پنپنا کارے دارد ہے کیوں کہ اس سے روس کے وسیع علاقوں میں تفریق ہو جائے گی اور والگا۔ یورال، قفقاسیہ، قزاقستان اور وسطی ایشیا کے بڑے علاقے علیحدہ ہو جائیں گے۔ ان کا خیال تھا کہ زار روس کی مخالف بڑی طاقتوں کی مدد سے یہ اسکیم کامیاب ہو سکتی ہے۔ بہرکیف یوسف آقچورا کا یہ پہلا مضمون جس میں ترک قومیت کی تحریک کے اصول پیش کئے گئے تھے "پان ترکی ازم" کا صحیفہ ثابت ہوا اور ترک نظریات اور خیالات پر اس کے گہرے اور دیرپا اثرات پڑے۔ ترکی اور فرانسیسی اخباروں کی مدد سے چند اور روسی ترک اخبار نویسوں نے جو روس سے ترک وطن کر گئے تھے، ترک اور مسلم اتحاد پر زور دیا۔ اپنے مضامین میں انہوں نے حکومتِ روس پر مسلمانوں پر پابندیاں عائد کرنے کا الزام لگایا۔ ان میں سے دو آذر بائیجانی اخبار نویس احمد بے آغا اُو غلو اور حسین زادہ "نوجوان ترک پارٹی کی سیاسی سرگرمیوں کے پُرجوش کارکن تھے۔ اور اس پارٹی کی تیسری کانگریس" اتحاد و ترقی" کے اجلاس میں اس کی مرکزی کمیٹی کے ممبر بھی ہو گئے تھے۔

۱۹۰۵ء میں جب روسی وزیر داخلہ نے سیاسی مراعات کا اعلان کیا تو اکثر و بیشتر ترک مہاجرین روس واپس آ گئے اور انہوں نے اپنے تاتاری اور آذر بیجانی ہم وطنوں میں سیاسی تحریک کی بنیاد ڈالی۔ رشید ابراہیم جن کو ۱۹۰۴ء میں ترکی سے جلا وطن کر دیا گیا تھا، روس کے سیاسی حالات سے بخوبی شناسا تھے اور انہوں نے پیٹرز برگ میں ایک مسلم سیاسی جماعت قائم کی۔

قاضی عبدالرشید ابراہیم نے پہلے ہی سے مختلف روسی سیاسی گروہوں سے رابطہ قائم کر رکھا تھا اور ستمبر ۱۹۰۴ء میں انہوں نے ایک سیاسی گروہ سے

تعاون کی درخواست کی۔ یہ ایک سیاسی تجربہ تھا۔ لیکن مستقبل میں تاتاری "جدید" کا روسی آزاد خیالوں کے ساتھ تعاون سے کام کرنے کا راستہ کھل گیا۔ اس دوران میں یوسف آقچورا بھی روس آچکے تھے اور قاضی عبدالرشید ابراہیم کے ساتھ یہ فیصلہ کرکے کہ آئندہ سیاسی تحریکوں میں روسی سیاسی پارٹیوں کے تعاون سے کام کیا جائے ان دونوں نے کل روسی مسلمانوں کی تحریک چلانے کے لئے روس کے مسلم مراکز کے دورے شروع کئے۔ اس تحریک میں تاتاری لکھپتی احمد بے حسین نے ان کو مالی امداد بہم پہنچائی۔ آذربیجان میں اس تحریک کے بانی مبانی ایک ممتاز قانون دان علی مردان، باکو میں تیل کی صنعت کے مالک تاجییوف (TAJIEV) اور حسین زادہ تھے، جو قسطنطنیہ اور پیرس کے قیام کے بعد روس آگئے تھے۔ کریمیا میں قیادت اسمٰعیل بے اور مصطفیٰ داؤد کے ہاتھوں میں تھی۔ اورن برگ کی قیادت قانون دان سید آلین[1] اور ادیب فتح کریم نے سنبھالی۔ اس کے علاوہ دو ممتاز ماہرِ تعلیم برادران عبداللہ اور عین اللہ نے ویاتکا (VIATKA) کے صوبے میں اس تحریک کا ساتھ دیا۔

مارچ ۱۹۰۵ء میں تقریباً ۸۰ تاتار صنعت کار، قانون دان، علماء، ماہرینِ تعلیم اور تاجروں کا قازان میں ابتدائی اجتماع ہوا۔ مسلم مذہبی ادارے کے قدامت پسند ارکان نے اس اجتماع میں شرکت نہیں کی۔ اس اجتماع میں اتفاقِ رائے سے فیصلہ ہوا۔ کہ روسی مقبوضہ علاقوں کے مسلمانوں کے اتحاد کی ہر ممکن کوشش جاری رکھی جائے اور ایک وفد روسی وزیر اعظم کاونٹ وٹ (COUNT WITTE) کے پاس عرضداشت لے کر پیٹرز برگ گیا جس میں کہا گیا تھا کہ مسلمانوں پر ابھی تک جو

---

[1] علی سے آلین بن گیا ہے۔

قانونی پابندیاں عائد ہیں ان کو ہٹالیا جائے اور ان کو ایک کانگریس منعقد کرنے کی اجازت دی جائے۔ پیٹرزبرگ میں مسلم مذہبی ادارے کے سربراہ مفتی یار سلطان اور امام بایزید نے جو "جدید" تحریک کے سخت مخالف تھے، اس وفد کی راہ میں ہر ممکن رکاوٹ کھڑی کی۔ جس کے نتیجے میں وزیر داخلہ نے کانگریس منعقد کرنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ دارالحکومت میں دوسرے مسلمانوں کے صلاح مشورے سے طے پایا کہ حکومت کے احکامات کے خلاف اگست کے میلے کے دوران "نژنی نوو گراڈ" (NIZHNI NOVGOROD) میں کل مسلمانان روس کی کانگریس منعقد کی جائے۔

اس پہلی کانگریس کے انعقاد میں جن خطرات کا سامنا تھا ان سے سب بخوبی واقف تھے۔ اور اس لئے نژنی نووگراڈ کے میلے کا انتخاب ہوا تھا کہ جشن و ہنگامہ میں مسلمانوں کے اجتماع کو زیادہ اہمیت نہ دی جائے گی۔ کانگریس کا پہلا جلسہ ۱۵ اگست[۱] کو "ہوٹل جرمینیا" میں ہوا۔ لیکن مقامی گورنر نے جو اس غیر سرکاری کانگریس کے اجتماع سے بخوبی واقف تھا۔ ہوٹل کا استعمال ممنوع قرار دے دیا۔ چنانچہ پکنک کے بہانے دوسرا جلسہ ایک تفریحی جہاز میں منعقد ہوا[۲]۔ اس اجلاس میں تقریباً ڈیڑھ سو تاتار اور آذربیجانی رہنماؤں نے شرکت کی۔ علی مردان بے، عبدالرشید ابراہیم اور یوسف آقچورا نے مختلف اجلاس کی صدارت کی۔ کانگریس کے نمائندگان نے اس مطالبے کی توثیق کر دی کہ کل مسلمانان روس یونین کی داغ بیل ڈالی جائے۔

لہ ولیدی

لہ یہ جہاز خفیہ اور نامعلوم مقام پر سمندر میں پندرہ دن تک غائب رہا۔

تلفیق الاخبار

اور حسب ذیل قرار دادیں منظور کیں [1]

۱۔ سیاسی اقتصادی اور عمرانی اصلاحات کی خاطر روس کے کل مسلمان شہریوں کو متحد کیا جائے۔

۲۔ مسلمانوں اور روسیوں میں قانونی برابری ہونی چاہیئے۔

۳۔ آئینی بادشاہت قائم کی جائے، اور قانون ساز اسمبلی میں قومی تناسب سے نمائندگی دی جائے۔

۴۔ مذہبی، اخباری اور اجلاس وغیرہ منعقد کرنے کی آزادی دی جائے۔

۵۔ ذاتی ملکیت رخنہ اندازی اور دست درازی سے محفوظ کی جائے جن کسانوں کے پاس تھوڑی زمین ہے۔ انہیں حکومت یا زار کی ملک سے مزید زمین دی جائے۔ جاگیرداروں کی زمین بلا مناسب معاوضے کے ضبط نہ کی جائے۔

۲۳ر جنوری ۱۹۰۶ء میں ایک دوسری غیر سرکاری کانگریس پیٹرز برگ میں منعقد ہوئی اور اس میں کل مسلمانان روس کی یونین روسیہ مسلمان لری نیننگ اتفاقی جس کا نام "اتفاق" مشہور ہوا، قائم کی گئی۔ نام کے باوجود "اتفاق" محض ترک رہنماؤں کی جماعت تھی اور اس میں مختلف ترک قبائل، گروہ، اور سوسائیٹیوں کی شرکت مفقود تھی۔ "اتفاق" کے بانی کسی جماعت یا گروہ کی نمائندگی نہیں کر رہے تھے، انہوں نے یہ کام محض اپنی ذاتی اہمیت اور شہرت کے بل پر کیا تھا۔ علاوہ ازیں "اتفاق" میں والگا، یورال، آذربیجان اور کریمیا کے تو متعدد نمائندے تھے لیکن قزاقستان، شمالی قفقاسیہ اور سائبیریا کے چند ہی نمائندے تھے اور وسطی ایشیا سے کوئی بھی نہ تھا۔[2] دوسری کانگریس نے فیصلہ کیا کہ سولہ

---

[1] GADIULLIN ARSHARUNI اور عبدالرشید ابراہیم

[2] ۔ وسطی ایشیا کے نمائندوں نے خفیہ شرکت کی تھی اس لئے حوالوں میں ان کا ذکر نہیں ملتا

علاقائی شاخیں قائم کی جائیں، لیکن ایشیائی روس میں اس پر عمل در آمد نہ ہو سکا۔ اور محض والگا، آذربیجان اور کریمیا میں شاخیں قائم ہوئیں، قدامت پسند تاتاریوں نے "اتفاق" کی سرگرمیوں میں قطعاً کوئی حصہ نہ لیا، اور سوشلسٹ جماعتوں نے "اتفاق" کے ترقی پسند طبقے سے علیحدگی کر لی۔ "اتفاق" کا سوشل اور اقتصادی پروگرام روسی کیڈٹ پارٹی سے ملتا جلتا تھا۔ کیوں کہ دونوں جماعتوں کے افراد تقریباً ایک ہی قسم کے معاشرے سے آئے تھے۔ "اتفاق" کے تمام تر رہنما تاتاری اور باشیقر تعلیم یافتہ متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے ان میں چند امراء اور جاگیردار بھی تھے۔

اس کانگریس میں یہ بھی فیصلہ ہوا کہ روسی پارلیمنٹ دوما (DUMA) کے انتخابات میں کیڈٹ پارٹی کے ساتھ تعاون کیا جائے اور امیدواروں کی مشترکہ فہرست تیار کی جائے۔

"اتفاق" کے رہنما کیڈٹ پارٹی کی مرکزی انتظامیہ کے ممبر بھی چنے گئے اور دوسری کانگریس کے انعقاد سے قبل کیڈٹ کے اجلاس میں یوسف آقچورا نے مسلمانوں کے وفد کی قیادت کی اور ایک لمبی تقریر میں اپنے لائحہ عمل کی وضاحت کی۔ "اتفاق" کا منشور روسی مسلمانوں کے تمدنی حقوق کی حفاظت کرنا تھا اس لئے یوسف آقچورا نے اپنی تقریر میں مسلمانوں کے تعلیمی اور مذہبی مسائل کا ذکر کیا۔ "جس طرح کسانوں کے زراعت کا مسئلہ بنیادی حیثیت رکھتا ہے اسی طرح مسلمانوں کے لئے ان کا مذہب ہے[1]"۔ یوسف آقچورا اور رشید ابراہیم کو، جو کہ اولاً "پان ترک ازم" (اتحاد اقوام ترک) کے حامی اور روس کے خلاف

---

[1] قاضی رشید ابراہیم

تھے ۔مسلمان اقلیت کی نمائندگی کے لئے کیڈٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کا ممبر منتخب کرلیا گیا۔ علاوہ ازیں تاتاریوں کے مطالبات پورے کرنے کے لئے اور ان سے اپنی دوستی کو مضبوط بنانے کے لئے کیڈٹ پارٹی نے اپنے پروگرام میں چند تبدیلیاں بھی کردیں خاص خاص تبدیلیاں یہ تھیں[ﻪ]۔

۱۔ مسلم مذہبی ادارے کی پوری آزادی کے لئے تاتاریوں کے مطالبے کی حمایت۔

۲۔ مسلمانوں کے لئے شریعت اور فقہ کا نفاذ۔

۳۔ غیر روسی علاقوں میں تعلیم کے لئے مقامی زبان کا استعمال۔

"اتفاق" کے رہنماؤں نے اپنی اس کامیابی کو برقرار رکھنے کے لئے اور مستقبل میں قانونی طور پر سیاسی سرگرمیوں کو جاری رکھنے کی خاطر اپنے انتہا پسند اور قومی نظریات کو ترک کردینے کا اعلان کردیا۔ رشید ابراہیم جنہوں نے ۱۸۹۵ء میں اپنے کتابچہ میں حکومت روس پر سخت حملے کئے تھے انہوں نے اب تیسری کانگریس منعقد کرنے کی درخواست میں کہا کہ "ہم مسلمانانِ روس، شہنشاہیت کے خیرخواہ اور اتحاد اسلامی، سوشلزم، طوائف الملوکی اور دوسرے نظریات کے خلاف ہیں، جو لوگوں کی زندگی میں خلفشار پیدا کرتے ہیں اور روح اسلامی کے خلاف ہیں، قانونی طریقوں سے جدوجہد کریں گے۔ ہم سفید زار کے خدمت گذار ہیں اور بادشاہ کی اپنے آباؤ اجداد کی طرح وفاداری سے خدمت کریں گے"۔ اپنی عرضداشت میں ابراہیم نے مسلمان علماء پر بھی کڑی نکتہ چینی کی اور کہا کہ "ہم مکتبوں اور مدرسوں کو ملاؤں کے ہاتھوں سے نجات

[ﻪ] قاضی رشید ابراہیم

دلاکر عوام کے انتظام میں دیں گے"۔ بالفاظ دیگر یہ کہ عوام پرے قدامت پسند علما اور خصوصاً مفتی اوفا کا اثر و رسوخ کم کیا جائے۔

روسی کیڈٹ سے تعاون، تاتاری اتحاد اور آزاد خیال علما کی مدد سے "اتفاق" کو ڈوما کے انتخابات میں نمایاں کامیابی ہوئی اور ۲۵ مسلمان نمائندے منتخب ہو گئے[1]۔ بدقسمتی سے پہلی دوما کی زندگی بڑی مختصر ثابت ہوئی اور مسلمان نمائندوں کو سرگرمی دکھانے کا موقع نہ مل سکا، صرف اوفا کے نمائندے نے تقریر کی جس میں مسلمانوں کی قانونی برابری کا مطالبہ کیا گیا۔ جب دوما کے توڑے جانے کے خلاف فن لینڈ کے شہر وائی بورگ (VYBORG) میں نمائندوں کا احتجاجی اجلاس ہوا تو مسلمانوں نے احتیاطاً اس میں حصہ نہیں لیا۔ صرف چھ نمائندے شرکت کے لئے گئے تھے تو ان کو بھی فوری طور پر پیٹرز برگ واپس بلا لیا گیا اور تمام نمائندگان کو ہدایت دی گئی کہ وہ عوام کو حکومت کے خلاف نہ اکسائیں۔

۱۹۰۵ - ۱۹۰۷ء کے انقلاب میں ترک عوام نے کوئی قابل ذکر حصہ نہیں لیا، وسطی ایشیا، قزاقستان اور والگا۔یورال کے بیشتر علاقوں میں مسلمان الگ تھلگ رہے صرف ایک آدھ مقام پر مقامی حکام کے ظلم و استبداد کے خلاف مظاہرے ہوئے۔ سوویٹ اکیڈیمی آف سائنس نے ۱۹۵۵ء میں اس انقلاب کے متعلق جو مواد شائع کیا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ سوائے ترکوں کے تمام قومی گروہوں نے ۱۹۰۵ء کے انقلاب میں حصہ لیا تھا۔ البتہ آذربیجان کے مسلمانوں نے روسی باشندوں کے ساتھ ہڑتالوں اور فسادات

---

[1] نمائندگان کی تفصیل یہ تھی: قفقاسیہ سے ۸، قزاقستان سے ۴ اور والگا۔یورال خطہ سے ۱۳

میں حصہ لیا[۱]۔ یوروپی روس میں قازان کے تاتاری مزدوروں اور یورال میں سونے کی کانوں میں کام کرنے والے کانکنوں نے ہڑتالوں اور جلوسوں میں حصہ لیا۔ بلوائیوں دہشت پسندوں اور انقلابی قیدیوں کی لمبی فہرست میں مشکل سے چند ہی تاتاری نام ملیں گے۔

اس دوران میں تاتاری، آذربیجانی، قزاق اور ازبیک اخبارات مسلمانوں سے صبر و تحمل سے کام لینے کی ہدایت کرتے رہے اور ان کو تلقین کی کہ وہ انقلابی سرگرمیوں سے دور رہیں اور حکام سے تعاون کریں۔ تاشقند کے اخبار "خورشید" نے اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ "سوشل ڈیموکریٹ" کے نظریات اسلام کے منافی ہیں اور ان سے صرف نقصان ہی پہنچ سکتا ہے اور مسلمانوں کو کیڈٹ پارٹی سے تعاون کرنا چاہیئے۔ آذربیجان کے اخبار "حیات" نے جس میں ممتاز قومی رہنما مضامین لکھتے تھے کہا کہ "مسلمانوں کے لئے شہنشاہیت آئینی دستور سے بہتر ہے اور مسلمانوں کی بھلائی اور بہتری اسی میں ہے کہ وہ بادشاہت کی حمایت کریں کیونکہ نئے نظام میں اسلام کے خلاف عناد ہے[۲]۔"

پہلی اور دوسری دوما کے انعقاد کے درمیان اگست ۱۹۰۶ء میں نزنی نووگراڈ میں تیسری اور سب سے زیادہ قابل ذکر مسلم کانگریس منعقد ہوئی۔ اس کانگریس میں ترک قومیت کا واضح پرچار ہوا اور اسلام کی آڑ میں قومیت کی صدا

---

[۱] ان میں زیادہ تر تعداد تخریب پسند نوجوانوں کی تھی جن کو ایران میں خلفشار پیدا کرنے کے لئے تیار کیا گیا تھا۔ اس ضمن میں مرزا بالا بیگ کے مقالات کا مطالعہ قابل دلچسپی ہے۔

[۲] مسلم زعماء نے اس امر کو محسوس کر لیا تھا کہ سوشلسٹ نظام قائم ہونے سے ان کے مفاد کو نقصان پہنچے گا چنانچہ وہ حکومت وقت سے خیر خواہی کا اظہار کر کے اپنی جمعیت کو منظم کرنا چاہتے تھے۔

بلند کی گئی۔

کانگریس کا پہلا اجلاس ملے جلے جذبات سے شروع ہوا۔ بہت سے نمائندوں نے جو عبد الرشید ابراہیم سے ناراض تھے ان پر اس خط کے سلسلے میں جو انہوں نے اتحاد اسلامی اور علماء کے خلاف وزیر داخلہ کو لکھا تھا موقع پرستی کا الزام لگایا نوبت یہاں تک پہنچی کہ اسمٰعیل بے، علی مردان بے اور سید آلین جیسے ممتاز اور اہم رہنماؤں نے اس وقت تک کانگریس کی کارروائی میں حصّہ لینے سے انکار کر دیا جب تک کہ عبد الرشید ابراہیم اس الزام کا تسلی بخش جواب نہ دیں اور معافی نہ مانگیں۔ مختلف جانب سے دباؤ پڑنے پر عبد الرشید ابراہیم نے استقبالیہ خطبے میں اپنے عمل کی وضاحت کی۔ انہوں نے کہا کہ مسلمانوں کا اتحاد صرف روسی مسلمانوں تک محدود نہیں رہنا چاہیئے بلکہ ان کا ذاتی اور کانگریس کا مقصد دنیا کے تمام مسلمانوں کا اتحاد ہونا چاہیئے۔ "اہلِ اسلام کی اخوت ایک خیالی پلاؤ نہیں بلکہ حقیقت ہے"۔ انہوں نے فخر سے کہا کہ ان کا اولین مقصد روس کے تمام مسلمان نمائندوں کی یک جہتی ہے اور سرکاری اجازت سے منعقد ہونے والی یہ تیسری کانگریس ان کی اس کامیابی کا مظہر ہے اور اب مسلمان نمائندے بلا خوف و خطر سرکاری طور پر اپنی کارروائی شروع کر سکتے ہیں۔ ان افتتاحیہ جملوں کے بعد عبد الرشید ابراہیم نے اعلان کیا کہ اسلام کی حفاظت ہر مسلمان کا فرض ہے اور کانگریس کو ہر ممکن طریق سے اسلام اور علمائے دین کو عیسائی مشنریوں سے، جو حکومت کی مدد سے مسلمانوں میں تبلیغ کرتے ہیں اور مسلمانوں کی زندگی تنگ کر رہے ہیں، بچانا لازمی ہے۔ اپنے خطبے میں انہوں نے علماء کی حالت زار پر افسوس کیا اور ان کی مالی مشکلات کا ذکر کیا کیوں کہ علماء کو اپنے شاگردوں کے کھانے پینے اور رہن سہن کے لئے مدرسوں سے خرچہ کرنا ہوتا تھا۔ وزیر داخلہ کو انہوں نے جو کچھ لکھا تھا

اس کے بالکل برعکس انہوں نے عوام سے علمار اور اسکولوں کی فراخدلی سے مدد کرنے کی اپیل کی۔ ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی تسلیم کیا کہ عوام کی اپنی حالت زیادہ بہتر نہیں ہے اور اس لئے کانگریس کو مدرسوں اور مکتبوں کی امداد کے لئے کوئی دوسرا موثر طریقہ ڈھونڈنا ہوگا۔

استقبالیہ خطبے کے بعد "پریسیڈیم" کے انتخابات ہوئے۔ علی مردان بے صدر منتخب ہوئے۔ دوسرے ارکان اسمٰعیل بے، عبدالرشید ابراہیم، عالم جان بارودی عبداللہ، شیخ قورشیجی غولوف، امین جان اور علی اسکندر منتخب ہوئے۔ یوسف آقچورا کو سکریٹری مقرر کیا گیا۔ اسمٰعیل بے نے مخالف گروہ کی طرف سے عبدالرشید ابراہیم کی وضاحت کو تسلیم کر لیا۔ کانگریس کے خاتمہ پر ابراہیم کے خط کا قضیہ پھر کھڑا ہوا لیکن ووٹ کے ذریعے ابراہیم کی ناسمجھ اور بے وقت حرکت کو معاف کر دیا گیا۔ ایک نئی سیاسی پارٹی "اتفاق" کے ہی نام سے منظم کرنے کے لئے کمیشن مقرر کیا گیا جس کو مسلمانوں کے معاشی مسائل اور اسکولوں کی مشکلات کا جائزہ لینے کا کام بھی سونپا گیا۔

پارٹی کی تنظیم اور سیاسی منشور پر سخت بحث و مباحثہ ہوا، بہت سے نمائندے ایک متحدہ مسلم پارٹی بنانے کے خلاف تھے۔ مسلم تحریک کے پرانے رہنماؤں مثلاً اسمٰعیل بے کا خیال تھا کہ کانگریس کو اپنی کارروائی صرف تمدنی اور مذہبی امور تک محدود رکھنی چاہیئے اور سیاست میں حصہ نہیں لینا چاہیئے۔ عیاض اسحاقی[1] نے جن کا

---

[1] عیاض اسحاقی (د ۱۹۵۴-۱۸۷۸) اولاً سرگرم اشتراکی تھے مگر بعد ازاں ان کی آنکھیں کھلیں اور یہ فرار ہو کر ترکی چلے گئے اور ۱۹۵۴ میں استنبول میں وفات پائی۔ ۱۹۳۱ میں انہوں نے یروشلم کی مسلم کانگریس میں شرکت کی۔ ۱۹۳۳ میں انہوں نے جاپان میں تاتاری تارکین وطن کو منظم کرنے کی تحریک میں حصہ لیا۔ عیاض اسحاقی ایک اچھے ادیب اور ناول نگار بھی تھے۔ انہوں نے اپنی تمام زندگی سیاسی اور قومی جد و جہد کے لئے وقف کر دی تھی۔

روس کے سوشلسٹ انقلابیوں سے قریبی تعلق تھا اس بات پر شبہ ظاہر کیا کہ کسی پارٹی کی بنیاد بجائے سوشل اساس کے مذہب پر رکھی جائے۔ انہوں نے ایک ایسی سیاسی پارٹی کی تشکیل کی مشکلات کی طرف اشارہ کیا جس میں متوسط طبقہ، کسانوں اور مزدوروں کے نمائندے شامل ہوں۔ نئی نسل کے نمائندوں نے جن میں یوسف آقچورا پیش پیش تھے پارٹی کی تشکیل کے لئے زور ڈالا۔ انہوں نے کہا کہ

"ہمارا مقصد مسلمانان روس کی اکثریت کو متحد کر کے ایک سیاسی پارٹی بنانا ہے، اس کو مضبوط اور پُر اثر کرنا ہے تاکہ وہ روس کی دوسری پارٹیوں کی طرح بارسوخ بن جائے۔ اگر ہم ایسا نہیں کریں گے تو ہمارا بھی وہی انجام ہوگا جو اندرونی خلفشار کی وجہ سے بلغاریہ کے مسلمانوں کا ہوا، ہم بھی اپنے اتحاد و اتفاق اور سیاسی اختیارات سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ مسلمانان روس کو بلغاریہ کے مسلمانوں سے درس عبرت لینا چاہیئے"۔

یوسف آقچورا نے عیاض اسحاقی کی اس رائے کو غلط قرار دیا کہ مختلف طبقوں کے نمائندے ایک پارٹی میں مل جل کر کام نہیں کر سکتے ہیں۔ یوسف کی رائے میں ایسی پارٹی کی تشکیل ممکن تھی اور یہ اشد ضروری تھا کہ مسلمانان روس کو متحد کر کے ایک پر اثر اور بارسوخ سیاسی جماعت جو قومی اور مذہبی اصولوں پر مبنی ہو قائم کی جائے۔

یوسف آقچورا کی دلیلوں کے سامنے تمام مخالفت ختم ہوگئی اور "اتفاق" پارٹی کی بنیاد پڑی۔ اس کے منشور کے دس حصے تھے جو ۷۰ دفعات پر مبنی تھے اور یہ کیڈٹ پارٹی کے منشور سے بہت مشابہ تھے۔

حصہ اول (دفعات ۱-۲) میں کانگریس کے اس فیصلے کا ذکر کیا گیا کہ مسلمانوں کی ایک پارٹی قائم کی جائے جس کا مقصد مسلمانان روس کی سیاسی، مذہبی، ثقافتی، تمدنی اور اقتصادی حالت کو بہتر بنانا ہو۔

حصہ دوم (دفعات ۳-۱۶) میں روس کے تمام باشندوں خصوصاً مسلمانوں کے لئے قانونی برابری کا مطالبہ تھا۔ تمام قانونی، سوشل اور ثقافتی امتیازات ختم کئے جائیں۔ پیشوں، سرکاری اور فوجی ملازمتوں میں مسلمانوں کو وہی مراعات حاصل ہوں جو سلطنت کے عیسائی باشندوں کو ہیں۔

حصہ سوم (دفعات ۱۷-۲۴) میں دستور سازی کے قوانین اور شاہی نظام کے متعلق مطالبات تھے۔

حصہ چہارم (دفعات ۲۵-۲۷) میں اس بات پر اصرار کیا گیا کہ تمام مذاہب کو برابری حاصل ہو۔

حصہ پنجم (دفعات ۲۸-۳۴) مقامی حکومتوں کی تشکیل اور اختیارات سے متعلق تھا، لیکن قومی خود مختاری کا کوئی تذکرہ نہیں تھا۔

حصہ ششم (دفعات ۳۵-۴۵) میں غیر معمولی عدالتوں کے خاتمے اور انصاف کے بہتر طریقوں کا مطالبہ کیا گیا، اس کے علاوہ عدلیہ اور انتظامیہ کو علیحدٰہ کرنے کا مطالبہ بھی تھا۔ یہ حصہ کیڈٹ پارٹی کے مطالبے کا ہو بہو چربہ تھا۔

حصہ ہفتم (دفعات ۴۶-۵۳) کا تعلق تعلیم سے تھا پرائمری تعلیم مقامی حکومتوں کی تحویل میں دی جائے اور ذریعۂ تعلیم مختلف

فرقوں کی اپنی زبان میں ہونا چاہیئے۔

حصہ ہشتم، نہم اور دہم (دفعات ۴۵ — ۷۲) کا تعلق زرعی، اقتصادی اور لیبر اصلاحات سے تھا یہ مطالبات کیڈٹ پارٹی سے ملتے جلتے تھے۔ زرعی اصلاحات کے سلسلے میں کہا گیا کہ جاگیرداروں کی زمینیں جبراً کسانوں کو فروخت کر دی جائیں۔ دن میں ۸ گھنٹے کام لیا جائے اور ٹریڈ یونین بنانے کا حق دیا جائے، علاوہ ازیں مصالحتی عدالتیں قائم کی جائیں[1]۔

دوسری کمیٹیوں نے بھی مسلمانوں کی زندگی کے مختلف اور اہم پہلوؤں کا جائزہ لیا اور ان کی بنیاد پر "اتفاق" کی پالیسیوں کے اصول وضع کئے۔ ان پالیسیوں میں زور دیا گیا کہ اسلام کی حکومت اور مسیحی مبلغین کی دست درازیوں سے حفاظت کی جائے۔ کانگریس نے "پریسیڈیم" سے کہا کہ وہ بذریعہ تار وزراء کی شاہی کونسل کے صدر کو اس قرارداد سے آگاہ کر دے کہ صرف ضمیر اور پریس کی مکمل آزادی ہی کے ذریعے اسلام اور مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ ہو سکتا ہے اور ان کی سرگرمیوں پر پابندیاں عائد نہ کی جائیں۔ اس قرارداد میں یہ بھی کہا گیا کہ دوما کو جس کو تھوڑے عرصے قبل حکومت نے توڑ دیا تھا دوبارہ بحال کیا جائے۔

"تاکہ موجودہ مشکل حالات کا حل ڈھونڈا جا سکے۔"

محض سیاسی سوالات و مسائل پر کانگریس اور اس کے رہنماؤں

---

[1] "PROCEEDINGS OF THE CONGRESS. 1906 SANO 16-21 AUGUSTOSDA ICTIMAG RUSYA MUSULMAN-LARYNIN NADYESI." (KAZAN 1906)

نے کیڈٹ پارٹی کے ساتھ مکمل تعاون کیا اور وہی تدابیر اختیار کیں۔ سب سے دلچسپ اور قابل غور قرار داد مسلم اسکولوں کے مسائل سے متعلق تھی جس میں اس بات پر زور دیا گیا کہ ان اسکولوں کی تنظیم اور نصاب قومی جذبات کی روشنی میں تیار ہوں۔ اس قرار داد میں مزید کہا گیا کہ سلطنت اور مقامی حکومت کے خرچ سے تمام مسلمانوں کے لئے تعلیم عام کی جائے اور اس بات کی ضمانت دی جائے کہ اسلامی تعلیم میں کسی قسم کی مداخلت نہ ہوگی اس قرار داد میں یہ بھی سفارش کی گئی کہ تمام مسلم اسکولوں میں "ایک مسلم ادبی زبان" رائج کی جائے اور کانگریس کی رائے میں یہ زبان عثمانی ترکی ہونی چاہیئے[1] علاوہ ازیں پرائمری جماعتوں میں روسی زبان کی تعلیم کو ضروری قرار نہیں دیا گیا البتہ اس کو سیکنڈری جماعتوں کے نصاب میں شامل کرنے کی سفارش کی گئی[2]۔ اس قرار داد میں یہ بھی سفارش کی گئی کہ غیر روسی اسکولوں پر جو پابندیاں ۱۹۰۶ء میں عائد کی گئی تھیں ان کو منسوخ کر دیا جائے تاکہ نئے مسلم اسکول قائم کئے جا سکیں۔

مذہبی امور کے کمیشن کی صدارت قازان کے مشہور مدرسۂ محمدیہ کے صدر عالم جان البارودی کی جو اس دور میں روس کے سب سے ممتاز اور معزز عالم دین تھے، یہ ۱۹۱۷ء میں مفتی کے عہدے پر فائز ہوئے۔ اس کمیشن نے بھی ایک لمبی قرار داد منظور کی جس میں حکومت سے کہا گیا کہ مسلم مذہبی انتظامیہ

---

[1] مسلمان رہنماؤں کا مقصد یہ تھا کہ اس زبان میں تھوڑی بہت تبدیلی کے بعد اس کو تمام ترک اقوام کی مشترک زبان بنا دیا جائے - ۱۹۲۹ء سے اشتراکی حکومت نے علاقائی زبانوں کی ترقی پر زور دیا اور اس پالیسی کی مخالفت کرنے پر تقریباً دس ہزار افراد کو سائبیریا جلاوطن کر دیا گیا۔

[2] "PROCEEDINGS OF THE CONGRESS"

ادارے کو حکومت کے اثر سے نکال کر خود مختار کر دیا جائے۔ اورن برگ کے تاتاری مفتی باغچہ سرائے کے مفتی اور قفقاز کے سنی اور شیعہ مفتیوں کو حکومت نامزد نہ کرے بلکہ مسلمانوں کے نمائندے ان کا انتخاب کریں۔ اس کے علاوہ مسلمانان روس کے نظم ونسق کے لئے ایک مرکزی نظام قائم کیا جائے جس کے سربراہ مسلمانان روس کے روحانی پیشوا شمس العلماءؒ ہوں اور جن کو براہِ راست زار کے پاس جانے کا حق ہو۔

تمام قراردادوں اور پروگرام میں سیاسی اعتبار سے انتہائی ضبط وتحمل سے کام لیا گیا تھا لیکن پھر بھی یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ مسلمانان روس تاتاریوں کی قیادت میں اپنی مذہبی اور ثقافتی آزادی کے لئے حد درجہ کوشاں تھے اور ہر ممکن طریقے سے روسی ثقافتی اثر سے بچنا چاہتے تھے۔ علاوہ ازیں اس خود مختار مسلم فرقے کی زبان عثمانی ترکی ہوتی لہٰذا ثقافتی اور تمدنی اور بالآخر سیاسی طور پر ان کا رابطہ ترکی سے بہت گہرا ہو جاتا اور اس طرح تاتاری اور دوسرے مسلمان نظریاتی اور نفسیاتی طور پر روسی اثر سے محفوظ ہو جاتے۔

کانگریس نے ایک مسلم عوامی پارٹیؒ کی بنیاد بھی ڈالی اور حسب ذیل اس کی مرکزی کمیٹی کے ممبر منتخب ہوئے[۱]۔

۱۔ عبدالرشید ابراہیم	۲۔ یوسف آقچورا
۳۔ سید آلین	۴۔ عبداللہ
۵۔ عالم جان بارودی	۶۔ صدری مقصودی
۷۔ شاہ حید سلطان	۸۔ موسیٰ جاراللہ

---

[۱] سب سے زیادہ ووٹ عبدالرشید ابراہیم اور سب سے کم شاہ مردان قوشچی غولوف کو ملے

۹۔ عبداللہ ذبسکی
۱۰۔ ہادی مقصود
۱۱۔ سلیم خیری
۱۲۔ اسمٰعیل بے
۱۳۔ مصطفےٰ داؤد
۱۴۔ شاہ مردان قوشجی غولوف
۱۵۔ علی مردان بے

ان میں سے پہلے ۱۱ ممبر والگا۔ یورال خطے کے تاتاری تھے اور اس طرح ان کی اکثریت تھی۔ لہ

"اتفاق" پارٹی کے علاوہ ایک مزید سیاسی پارٹی کا قیام جو کہ بد قسمتی سے قائم نہ ہو سکی ــــ اور عثمانی ترکی کا مسلم اسکولوں میں بحیثیت عام زبان استعمال روس کے ترک رہنماؤں کی قومی پالیسی کا مظہر ہے۔ دوسری دوما کے انتخاب میں تاتاری طبقہ اور ان کے آذربیجانی اور کریمیا کے ترک رفقا نے کیڈٹ پارٹی کا ساتھ دیا اور اس کے ساتھ تعاون برقرار رکھا۔ تاتاری سیاست میں یہ ظاہرا اختلاف اس خلفشار کی علامت ہے جس سے روس کے ترک اس دور میں گذر رہے تھے۔ یہاں یہ بھی نہیں بھولنا چاہیئے کہ ۱۹۰۵ء میں روس کے تمام ترکوں کی ایک ادبی زبان نہیں تھی جس کے ذریعے ان کے نظریات کی پوری ترجمانی ہو سکتی ناصری نے اس سلسلے میں جو پہلا قدم اٹھایا تھا اور چند ادیبوں نے جس کی تقلید کی اس سے تاتاری زبان کو صرف اتنی ہی ترقی ہوئی کہ وہ روزمرہ کی صحافت میں استعمال ہو سکے، اس میں ابھی اتنی وسعت نہیں پیدا ہوئی تھی کہ سیاسی اور ثقافتی جذبات کی کماحقہٗ ترجمانی کر سکتی۔ اس لئے ترک اور تاتاریوں نے عثمانی ترکی کو جو کہ ایک وسیع اور ذومعنی زبان تھی اور جس میں الفاظ اور اصطلاحات کی بھرمار

"PROCEEDINGS OF THE CONGRESS

تھی، مستعمل کرنا چاہا۔ مسلم اسکولوں میں عثمانی ترکی کے استعمال سے ذہنی اور ثقافتی طور پر روسی ترک ترکی کے قریب آجاتے اور یہ تاتاریوں کے لئے ایک کامیاب سیاسی چال ہوتی کیوں کہ بیشتر روسی رہنما تاتاری تھے اور ترک قبائل میں ان کا اقتدار قائم رہتا۔ اس بنا پر مسلمانوں کی ایک مشترکہ سیاسی پارٹی سے بھی تاتاریوں کے سیاسی اور ثقافتی اقتدار کو تقویت پہنچتی۔

والگا۔ یورال خطے میں مسلمانوں کی آبادی کل آبادی کی ۲۵ فی صدی کے لگ بھگ تھی اور اس لئے تیسری مسلم کانگریس کے اعلانات میں اس امر کا لحاظ رکھا گیا کہ سیاسی مقاصد و خواہشات حکومت روس کے عتاب کی زد میں نہ آنے پائیں چنانچہ تاتاریوں نے قصداً ایسی روسی پارٹی سے تعاون کیا جس کو ان کا مذہبی اور ثقافتی پروگرام منظور تھا۔

دوسری ڈوما کے انتخابات میں کیڈٹ پارٹی سے تعاون کامیاب ثابت ہوا اور اس دفعہ ۳۹ مسلمان نمائندے پارلیمنٹ میں منتخب ہوئے۔ اولاً تجربہ کار لیڈر کے نہونے سے ان کی سرگرمیاں سرد رہیں لیکن جب علی مردان بے نے سید آلین سے "اتفاق" کی صدارت سنبھالی تو انہوں نے ڈوما میں مسلمان نمائندوں کی سرگرمیاں منظم کر دیں۔ ۳۹ نمائندوں میں سے ۱۸ نے کیڈٹ پارٹی میں شمولیت کر لی، ۱۵ نے ان کے ساتھ محض تعاون رکھا اور بقیہ ۶ نے بائیں بازو کی لیبر پارٹی قائم کر لی اور "اتفاق" سے علیحدہ ہو گئے۔ یہ پھوٹ سیاسی اور دستوری لائحہ عمل کے بنیادی اصولوں پر ہوئی "اتفاق" محض اور صرف مذہبی اور قومی مسائل میں دلچسپی لیتی تھی اور اس میں متوسط طبقے کی اکثریت تھی۔ لیبر پارٹی نے سوشل پروگرام پر زور دیا اور "اتفاق" پر متوسط طبقے کی اجارہ داری کا الزام لگایا اس کے برعکس وہ روس کی بائیں

بازو والی ان جماعتوں سے تعاون چاہتے تھے جس میں کسانوں اور مزدوروں کی اکثریت تھی۔ دوسری دوما کے ٹوٹنے پر اس لیبر پارٹی کا خاتمہ ہوگیا اور اس کے ممبر سوشلسٹ پارٹیوں کے ممبر بن گئے۔

۱۹۰۵ء—۱۹۰۷ میں تاتار سوشلسٹ انقلابیوں نے جو اپنے ہم پلہ روسیوں کی طرح زرعی اصلاحات کے حامی تھے، "اتفاق" اور روسی سوشلسٹوں سے تعاون کیا۔ ان کے لیڈروں میں سب سے سرگرم کارکن عیاض اسحاقی اور فواد تکتار تھے۔ عیاض اسحاقی ایک بہترین ادیب اور صحافی تھے اور نوجوان طبقے میں بیحد مقبول تھے۔ ۱۹۱۷ء کے انقلاب کے بعد وہ بائیں بازو کی قومی جماعت کے پر اثر رہنما بن گئے۔ ان کے اخبار کا نام "تانگ" (افق) تھا جس کی مناسبت سے یہ لوگ "تانگ چیلر" کہلاتے تھے۔[۱]

زیادہ تر تاتاری تجارت یا زراعت پیشہ تھے اس لئے ان میں سوشل ڈیموکریٹ کا زیادہ اثر نہیں تھا۔ بیسویں صدی کے شروع میں جب تاتاریوں میں مزدور طبقہ پیدا ہوا تب سوشل ڈیموکریٹ پارٹی کو کچھ کامیابی حاصل ہوئی۔ ان کے رہنماؤں میں صادق ساجیوف، ظریف صادق، حسین یاماشیوف، ابراہیم اختیاموف اور غلیم جان سیوف قابلِ ذکر ہیں۔ ان لوگوں نے قازان میں پروپیگنڈا کرنے کی کوشش کی مگر اس میں کوئی نمایاں کامیابی نہ ہوئی۔ ۱۹۰۷ء کے بعد حسین یاماشیوف نے اورن برگ سے "اورال" نامی اخبار جاری کیا مگر یہ جلد ہی بند ہوگیا۔ اسی مناسبت سے سوشل ڈیموکریٹ کو "اورال چیلر" کے نام سے منسوب کیا جانے لگا۔ سوشل ڈیموکریٹ کے اس چھوٹے سے ادارے نے

---

[۱] ۱۹۲۹ء میں عیاض اسحاقی نے روس چھوڑنے کے بعد ایک ماہنامہ "ملی یول" جاری کیا۔

آگے چل کر تاتار بالشویک جماعت کی بنیاد ڈالی اور اس کے ممبر خصوصاً ابراہیم اختیاموف "تاتاری سرخ محافظ" کے رہنما تھے۔

مسلمانوں کی دائیں بازو کی پارٹی میں مذہبی انتظامیہ ادارے کے قدامت پسند علما اور پیٹرز برگ کے مسلمان رؤسا شامل تھے، جن کی قیادت پیٹرز برگ کے بائزید اور اوفا کے مفتی یار احمد سلطان کے ہاتھوں میں تھی۔ ان کی جماعت کا نام "صراط مستقیم" تھا اور انہوں نے روسی دائیں بازو کی جماعتوں سے تعاون قائم کیا۔ "قدما" کے روحانی پیشوا ولی حضرت[1] کی "جدید" عنصر اور "اتفاق" کے لیڈروں سے مستقل چشمک رہتی تھی۔ ان کی نظروں میں یہ لوگ دہریہ اور خدا اور رسول کے منکر تھے۔ ولی حضرت کی دشمنی اس حد تک بڑھ گئی کہ انہوں نے اتحاد اقوام ترک اور اصول جدید پر اسکولوں کی مہم چلانے والوں کے خلاف پولس کی مخبری کی۔ بالشویک انقلاب کے بعد وہ تمام ریکارڈ منظر عام پر آئے جن میں قدامت پسند ملاؤں نے خفیہ پولیس کی مخبری کی تھی۔ ان کو دیکھ کر ان مولویوں کی تنگ نظری اور شدت پسندی کا اندازہ ہوتا ہے جو قابل حیرت ہے۔

ان تمام جماعتوں اور گروہوں میں سے جو انقلاب سے قبل روس کی سیاسی زندگی کا جزو تھے صرف "اتفاق" اور لیبر پارٹی کے نمائندے دوسری دوما کے ممبر تھے۔ انہوں نے اپنا دائرہ عمل صرف تین خاص باتوں تک محدود رکھا۔ اول مسلم اسکولوں کی حکومت کی نگرانی سے آزادی۔ دوئم مسلمان اور روسی باشندوں کی قانونی برابری اور سوئم مسلم مذہبی ادارے کی تنظیم نو

---

[1] یہ ایک بہت ہی متقی اور دین دار شخصیت تھے اور عموماً سیاست سے غیر متعلق رہتے تھے۔

وہ چاہتے تھے کہ بجائے سرکاری تقرر کے مفتیوں کا انتخاب ہو اور حکومت اس ادارے کے کاموں میں دخل اندازی نہ کرے[۵۱]۔ لیکن حکومت نے مسلمانوں پر اپنا اقتدار رکھنے کے لئے مفتیوں کے تقرر کا طریقہ منسوخ نہیں کیا اور یہ طریقہ انقلاب تک جاری رہا البتہ کیڈٹ پارٹی کی مدد سے مسلمانوں نے اپنے اسکول کو خود مختار کروالیا۔

دوسرا اہم مسئلہ جس نے دوسری دوما کے مسلمان نمائندوں کو غیر مطمئن کیا وہ حکومت کی نوآبادی پالیسی تھی[۵۲]۔ قزاق اور باشقیریوں نے اس بات کی کوشش کی کہ جنوب مشرقی خطوں میں روسی آبادکاروں پر پابندیاں عائد کی جائیں۔ انہوں نے حکومت سے اپیل کی کہ خانہ بدوشوں کے حقوق کو تسلیم کیا جائے۔ لیکن یہ تقاریر اور سرگرمیاں بسل کی آخری تڑپ تھیں کیوں کہ جون ۱۹۰۷ء میں حکومت اور دوما میں اختلافات ہونے پر دوما توڑ دی گئی اور نئے سیاسی حالات میں مسلمانوں کی سیاسی سرگرمیاں بے اثر اور بے نتیجہ ثابت ہوئیں۔

---

۵۱ دوسری دوما میں صدری مقصودی کی تقریروں سے اقتباس

۵۲ حکومت روس کا منشا و مقصد یہ تھا کہ ترکستان میں روسیوں کو آباد کرکے یہاں کے مسلمانوں کو اقلیت میں تبدیل کر دیا جائے۔

قزاق

تاتار اور قزاق مذہبی اور لسانی رشتے میں جڑے ہوئے تھے لیکن ۱۹۰۵ء تک سوشل اور اقتصادی طور پر ان میں بہت کم باتیں مشترک تھیں۔ آخری تاتار قبائل صدیوں قبل زراعت اختیار کر چکے تھے یا شہروں میں بس گئے تھے جبکہ انیسویں صدی کے اواخر تک قزاق اور ان کے مشرقی ہمسایہ قرغیز خانہ بدوشی کی زندگی گذار رہے تھے اور اپنے آبائی تمدن اور رسم ورواج پر قائم تھے۔ ایرانی، چینی اور روسی ثقافتی اور علمی مرکزوں سے دور وہ گھاس کے میدانوں میں گھومتے پھرتے تھے، نتیجتہً ان کی زبان بالکل محفوظ رہی اور تاتاریوں، باشقیروں اور ازبیکوں کے مقابلے میں ان پر اسلام کا اثر نسبتاً کم پڑا۔

گذشتہ صدی کے آخری سالوں میں انہوں نے خانہ بدوشی کی زندگی ترک کر کے مستقل معاش کے ذرائع ڈھونڈنے شروع کئے اور آہستہ آہستہ شمال میں روسی نو آبادیوں اور جنوب میں ازبیک خطوں کے کنارے کنارے آباد ہو گئے۔ ۱۸۹۷ء کے اعداد وشمار کے مطابق قزاقستان اور قرغیزستان کے وسیع میدانوں میں تقریباً ۴۰ لاکھ خانہ بدوش رہتے تھے۔ یہ قزاق والگا سے لے کر آلطائی پہاڑوں کے درمیان پھیلے ہوئے وسیع گھاس کے میدانوں میں گھومتے پھرتے تھے اور قرغیز خانہ بدوش تیان شان کے پہاڑوں کی ڈھلوانوں پر آباد تھے۔ قزاقستان کے جغرافیہ کی ایک خاص اور عجیب بات یہ تھی کہ تمامتر

آبادی شمالی اور مشرقی سرحدوں پر بسی ہوئی تھی۔ وسطی، مغربی اور جنوبی حصے انتہائی خشک تھے اور درمیان کے ریگستانوں نے قزاقوں کی اکثریت کو ازبکستان اور ترکمان کے نخلستانوں سے جدا کر دیا تھا۔ چند ے معدودے قزاق سیر دریا کے کناروں پر زراعت کرتے تھے۔ روسی الحاق سے قبل "سنہری غول" کے زمانے سے (یعنی پندرہویں ــــ سولہویں صدی میں) قزاقستان ۳ حصوں میں منقسم تھا ہر حصہ ایک علاحدہ سیاسی اور جغرافیائی علاقہ تھا جو چند قبائل کی مشترکہ حکمرانی میں تھا۔

قزاقوں کا روسی سلطنت میں الحاق سترہویں صدی میں شروع ہوا جبکہ روسیوں نے سائبیریا کو فتح کیا اور تکمیل انیسویں صدی کے وسط میں ہوئی جبکہ ازبکستان کی خانیت خیوا اور بخارا فتح ہوئیں۔ ۱۷۲۶ء میں قزاقوں کے خان ابوالخیر نے منگولوں کے حملوں کے خلاف روسی سلطنت کی مدد مانگی اور درخواست کی کہ قزاقوں کو روسی سلطنت میں شامل کر لیا جائے۔ اس وقت مشرقی قزاقستان اور چینی وسط ایشیا کے بڑے علاقوں پر منگول قبیلہ جُنگر کا قبضہ تھا لیکن مغربی قزاقوں نے روسیوں کی اطاعت کر لی۔

اس دوران پیٹرز برگ میں جانشینی کے جھگڑوں کی وجہ سے قزاق مسئلے کی طرف کوئی توجہ نہیں دی جا سکی لیکن ۱۷۳۱ء میں ملکہ این (ANNE) کی تخت نشینی کے بعد حکومت نے ایک تاتاری کی رہنمائی میں ایک خاص وفد قزاقستان بھیجا۔ اس وفد کے تمام ارکان تاتاری یا باشقیری تھے۔ یہاں تک کہ ان کا محافظ دستہ بھی باشقیری سپاہیوں پر مشتمل تھا۔ اس وفد نے اپنی چالبازیوں سے قزاق امرا اور فوجی حکام کی حمایت حاصل کر لی اور اکتوبر ۱۷۳۱ء میں خان ابوالخیر نے روس سے وفاداری کا حلف اٹھالیا۔

اٹھارہویں صدی کے آخر میں مشرقی ترکستان سے جنگروں کو نکال کر چینیوں نے قبضہ کرلیا تھا اور قزاق خوانین کے لئے یہ کوئی خاص بات نہ تھی کہ وہ یک بیک وقت چینی اور روسی حکومت سے وفاداری کا اعادہ کریں۔ ۱۸۲۲ء میں روسیوں نے سائبیریا میں فوجی حدود کا تعین کرکے اپنے اور چینیوں کے درمیان خط متارکہ قائم کردی اور اس طرح ان کی چوکیاں بخارا اور خوقند تک پہنچ گئیں۔ ۱۸۶۴ء کے لگ بھگ تمام قزاقوں نے روس کی اطاعت قبول کرلی اور اسی سال روسی افواج نے اولیا آتا، ترکستان (نام شہر) اور چمکینت پر قبضہ کرلیا اور اس طرح سائبیریا کی فوجی حد اورن برگ کی فوجی حد سے مل گئی جس سے قزاقوں اور وسط ایشیا کی ریاستوں میں حد فاصل قائم ہوگئی۔

قزاقستان کے وسیع علاقوں کا الحاق خاموشی اور بغیر فوجی مہمات کے مکمل ہوگیا۔ حالانکہ قزاقوں کی آبادی بہت تھی لیکن وہ بہت ہی غیر منظم تھے اور ان میں صرف قبائلی اور خاندانی نظام رائج تھا۔ قزاق خوانین کی سیاسی طاقت مفقود ہوچکی تھی اور امرا کو منگول، چینی اور اُزبیک حملہ آوروں کے مقابلے میں روسی پشت پناہی پسند تھی۔

قزاقستان میں اسلام دسویں صدی میں پہنچا جبکہ بلخ کے قزاق قبائل نے قبول اسلام کیا۔ "سنہری غول" کے خان اُزبیگ (سلطان غیاث الدین محمد اوزبیگ خان) (۱۳۱۳-۱۳۴۱ء) نے جس کی سلطنت میں قزاقستان شامل تھا، اسلام کو بہت فروغ دیا۔ قزاقوں کی خانہ بدوش زندگی پر جس کی وجہ سے مسجدوں اور مدرسوں کی تعمیر تقریباً ناممکن تھی اسلام کا بہت زیادہ اثر نہیں پڑا۔ روسی الحاق تک قزاق محض برائے نام مسلمان تھے۔ سیر دریا

اور تاشقند کے اطراف میں جو قزاق آباد تھے ان تک میں تعلیم برائے نام تھی کھلے میدانوں میں گھومنے والے خانہ بدوش مدرسوں کی چاردیواری سے بھاگتے تھے۔ نتیجتہً بہت کم لوگوں نے مذہبی تعلیم حاصل کی۔ بیسویں صدی کے اوائل تک میدانوں اور پہاڑوں میں بسنے والے قزاق شریعت سے نابلد تھے اور ان کے قانون رسم و رواج ـــــ عادات پر مبنی تھے البتہ جو قزاق جنوب میں وسط ایشیا کے نخلستانوں میں اُزبیک اور تاجکوں کے قرب میں آباد تھے ان پر اسلام کا گہرا اثر پڑا لیکن شمال اور مغرب میں جہاں اکثریت خانہ بدوشوں کی تھی اسلام کا اصل اثر الحاق کے بعد شروع ہوا۔ قزاق جغرافیہ داں ولی خاں بوکیخان نے لکھا کہ "قزاقوں نے کبھی بھی شریعت کو قبول نہیں کیا تا آنکہ حکومت نے اس پر عمل درآمد کروایا"۔ ۱۸۷۰ء میں ایک روسی انسپکٹر اسکول نے لکھا کہ "قزاقوں نے ابھی تک مسلم تہذیب کے بنیادی اصولوں کو نہیں اپنایا ہے۔ ان کے یہاں نہ تو علماء کی کوئی جماعت ہے اور نہ وہ اپنے عقائد میں پختہ ہیں" علاوہ ازیں ان کا مذہب صرف ظاہری علامتوں تک محدود ہے، وہ عربی میں نماز پڑھتے ہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی قرآن نہیں سمجھ سکتا"۔

کیتھرین دوئم کے رویئے سے قزاقستان میں اسلام کو بہت تقویت پہنچی، حالانکہ اسے خود مذہب سے کوئی دلچسپی نہ تھی لیکن اس کو روسی مسلمانوں کی مذہبی آزادی کا بڑا خیال تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اسلامی تہذیب و تمدن قزاقوں کے لئے سب سے موزوں ہے اور مدرسوں کی تعلیم سے ان کی خانہ بدوش زندگی میں تغیر آجائے گا۔ کیتھرین نے تاتاری مُلا قزاقوں کی تعلیم کے لئے بھیجے اور اس کے احکامات پر جنوبی بسائبیریا اور یورال کے قزاق علاقوں میں مسجدیں تعمیر ہوئیں اوفا کے گورنر کے نام ایک

فرمان میں ملکہ نے لکھا کہ

"مسجدوں اور اسکولوں میں مولویوں کا تقرر ہماری عین خواہش کے مطابق ہے اور یہ ایک ضروری فریضہ اور خرچہ ہے[۵۱]"۔

حکومت نے قزاقوں کے لئے نہ صرف مسجدیں بنوائیں بلکہ تبلیغ اور قرآن کی طباعت کے اخراجات بھی برداشت کئے۔ مسلم مذہبی ادارے کے قائم ہونے کے بعد جس کا مرکز اورن برگ اور پھر اوفا میں قزاقستان کے قرب میں تھا، قزاقوں کی مذہبی تعلیم اس کی تحویل میں آگئی۔ یہ مالی امداد اس وقت بھی جاری رہی جب ترکی نے یہاں کے علماء کو بھڑکانا اور اکسانا چاہا۔ ۱۹۰۰ء کے لگ بھگ ترکی گماشتوں نے خیوا اور بخارا کو روس کے خلاف بغاوت پر اکسانے کی کوشش کی[۵۲]۔

انیسویں صدی کے وسط تک قزاقستان تاتاری ثقافتی اور اقتصادی اقتدار میں رہا۔ انتظامیہ کے ملازم خصوصاً کلرک اور مترجم تاتاری تھے اور قزاقوں اور روسی حکومت کے درمیان تاتاری سرکاری زبان تھی۔ قزاق اسکولوں میں بھی یہی زبان پڑھائی جاتی تھی۔ غرضکہ کیتھرین کی اسلام دوستی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تاتاریوں نے قزاقستان اور سلطنت کی مشرقی حدود تک اپنا اثر و رسوخ اور اقتدار قائم کرلیا تھا۔ اسمٰعیل بے نے کیتھرین کی مدح سرائی کرتے ہوئے کہا کہ

مشرق میں ملکہ کی دانشمندانہ اور فائدہ مند پالیسیوں سے دس سال میں روس کو اتنا فائدہ پہنچا جتنا کہ تمام سیاستدان اور حکام

---

۵۱ ISTORII KAZAKHSKOI

۵۲ ایضاً

پوری ایک صدی میں نہ پہنچا سکے۔[۱]

قزاقوں میں سرگرمیوں سے خاصی بے چینی پھیل گئی کہ ان کو اپنے رہن سہن اور طریق زندگی میں تبدیلی کا خطرہ لاحق ہوگیا۔ ۱۸۳۰ء میں ان کے ایک وفد نے زار نکولائی اول (NICHOLAS I) کو عرضداشت پیش کی کہ ان کے علاقے میں مسجدوں اور اور اسکولوں کی مزید تعمیر روک دی جائے اور مولویوں کا تقرر بند کیا جائے قزاقوں کا تاتاری تاجروں کی طرف بھی خاصا معاندانہ رویہ تھا کیوں کہ وہ لوگ سیدھے سادے خانہ بدوشوں کو لوٹتے تھے۔ قزاق تاتاری حکام کی سخت گیری سے بھی نالاں تھے۔ قزاق قرغیزی اور باشقیر ی تاتاریوں کے ان ارادوں اور منصوبوں کو بخوبی سمجھتے تھے کہ وہ تمام ترک لوگوں کی سیاسی، ثقافتی اور اقتصادی سربراہی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ قزاقوں میں ایک پرانی کہاوت تھی "تاتار سے بچو"۔

چونکہ قزاقستان میں روسیوں کی نمائندگی تاتاری کرتے تھے اس لئے وہاں انیسویں صدی کے وسط تک روسی تہذیب و تمدن کا اثر نہیں پڑا۔ ۱۸۴۱ء میں والگا-یورال کے خطے میں پہلا روسی اسکول قائم ہوا۔ ۱۸۶۶ء تک آٹھ ایسے اسکول اور قائم ہوچکے تھے لیکن سرمایہ اور تجربے کار استادوں کی نایابی کی وجہ سے مزید اسکول نہیں قائم ہوسکے۔ قزاق رؤسا کے طبقے میں سے خاصے طالب علم اورن برگ کی کیڈٹ اکیڈمی (CADET ACADEMY) اور اومسک (OMSK) کی اکیڈمی میں تعلیم پاتے تھے۔ اس دور کے ایک ممتاز عالم ولی خان اپنے والد اور دوستوں کی طرح اومسک اکیڈمی کے تعلیم یافتہ تھے۔

---

[۱] "ترجمان" مورخہ ۱۵ / مارچ ۱۹۰۵ء

۱۸۶۰-۱۸۵۰ء کے دوران متعدد سیاسی جلاوطن قزاقستان کے میدانوں میں بھیجے گئے تھے۔ مشہور ناول نگار ڈوسٹووسکی (DOSTOEVSKY) بھی یہاں ۵۹-۱۸۵۴ء تک تعینات تھے اور ولی خان کے ان سے بڑے مراسم پیدا ہو گئے تھے۔ اس کے علاوہ متعدد روسی فنکار اور دانشور کئی وجوہات سے یہاں آباد تھے۔ ان لوگوں کی موجودگی سے قزاقستان کے پڑھے لکھے طبقے پر بڑا اثر پڑا۔ ان روسی مفکرین کی دہریت سے نوجوان قزاق طبقے میں اسلام کی مقبولیت کو مزید زک پہنچی اور قزاقوں کے پڑھے لکھے طبقے پر روسی آزاد خیالی کی روایات کا گہرا رنگ چڑھ گیا۔ ان روایات کی جھلک ولی خاں کی نثر اور آبائی کی شاعری میں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔

ولی خان (۱۸۶۵-۱۸۳۵ء) قزاق کے ایک ممتاز خاندان کے جس کا سلسلۂ نسب براہ راست چنگیز خاں سے ملتا تھا فرد تھے۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد انہوں نے سائبیریا اور وسطی ایشیا میں افواج روس میں خدمات انجام دیں اور بہت جلد ان کی شہرت بحیثیت جغرافیہ داں اور ماہر علوم شرق پھیل گئی۔ قزاقستان کے ثقافتی اور سوشل حالات پر اور وسطی ایشیا پر ان کے مقالات اور مضامین آج تک مستند تسلیم کئے جاتے ہیں۔ فوجی ملازمت کے دوران میں روسی علماء اور مفکرین سے خصوصاً ڈسٹووسکی سے ان کے بڑے گہرے مراسم پیدا ہو گئے۔ بدقسمتی سے تھوڑے تھوڑے عرصے میں آب و ہوا کی تبدیلی اور تصنیف و تالیف اور مطالعہ کی مشقتوں نے ان کی صحت تباہ کر دی اور ۳۰ سال کی عمر میں وہ تپ دق کا شکار ہو گئے۔

ولی خان کے خطوط سے ان کے ان گہرے اور پُر خلوص جذبات کا اندازہ ہوتا ہے جو ان کے اور روسی دوستوں کے درمیان قائم تھے۔ ڈسٹووسکی نے

ان کو لکھا کہ انہوں نے ولی خاں سے زیادہ کسی اور فرد کی جانب کبھی اتنی کشش محسوس نہیں کی۔ ایک اور خط میں اس شہرہ آفاق ناول نگار نے لکھا کہ

"کیا یہ ایک عظیم اور مقدس مشن نہیں ہے کہ اپنے ہم وطنوں میں تم پہلے شخص ہو جس نے روس کو اپنے وطن سے روشناس کرایا اور ساتھ ہی تم نے اپنے عوام کی خدمت بھی کی اور حکومت روس کے سامنے اپنے عوام اور وطن کی مشکلات پیش کیں"۔

اپنے پسماندہ خانہ بدوش ہم وطنوں کی بیداری کے لئے ولی خان نے اس بات کی کوشش کی کہ تعلیم اور مغربی ثقافت کے ذریعے ان کا ذہنی اور اقتصادی معیار بلند کیا جائے۔ انہوں نے دولت مند قزاق امراء کے خلاف جدوجہد کر کے ایک عام قزاق کی خوشحالی کی کوشش کی۔ ان کا خیال تھا کہ قزاقوں کی بہتری کی راہ میں قبائلی نظام اور زوال پذیر اسلامی تہذیب بڑی رکاوٹیں ہیں انہوں نے لکھا کہ

"ماوراء النہر میں غربت اور جہالت کا دور دورہ ہے۔ سمرقند، تاشقند، فرغانہ، خیوا اور بخارا کے کتب خانے اور سمرقند کی رصدگاہ تاتاری لوٹ کھسوٹ کا شکار ہو چکے ہیں اور اہل بخارا کے تعصب اور تنگ نظری نے مذہب کے علاوہ ہر چیز کو تباہ کر دیا ہے، حتیٰ کہ عظیم الشان یادگاروں کو شانِ خداوندی کے خلاف گناہِ انسانی کہہ کر تباہ و برباد کر دیا گیا ہے[۱]"۔

وہ مسلم مذہبی ادارے کے سخت مخالف تھے اور انہوں نے اس بات پر اصرار کیا

---

[۱] VALI KHAN: "SOCHINENIIA"

کہ قزاقستان میں تاتاری مولویوں کا تقرر نہ کیا جائے۔ وہ قزاقوں کو تاتاریوں سے بالکل محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔ بالآخر ۱۸۶۸ء میں ان کی کوششوں کی وجہ سے حکومت نے قزاقوں کی مذہبی زندگی پر سے اوفا کے مسلم ادارے کا اختیار ہٹا دیا۔

ولی خان کی جوانمرگی کے باوجود مستقبل کے قزاق نظریات و افکار کی بنیاد ان کے فلسفے اور کام پر پڑی۔ نوجوان طبقے نے ان کی آزاد خیالی، مساوات اور انصاف کے عقائد پر لبیک کہا اور اسی پر قزاق دانشوروں کی "روسیت" کی بنیاد قائم ہوئی۔ لیکن جنوبی قزاقستان میں اسلام کا اثر زیادہ تھا اور اس طرح قزاقستان کے میدان دو گروہوں میں بٹ گئے ان دونوں گروہوں کی چشمک ہر میدان عمل حتیٰ کہ قزاقی گیتوں تک میں عیاں تھی۔ انیسویں صدی کے آخر میں مسلم قزاق رہنما کم ہو چلے تھے اور ان کا اثر و رسوخ کم ہو گیا تھا۔

ولی خان کے ہم خیال اور قزاق کی دوسری مشہور شخصیت شاعر آبائی کنان بیو (۱۸۴۵ء – ۱۹۰۴) تھے۔ دوران تعلیم ہی میں ان کو روسی شاعری سے گہری دلچسپی پیدا ہو گئی تھی اور انہوں نے اپنی زبان میں روسی سے بیشتر ترجمے کئے۔ قزاقوں میں وہ پہلے ادیب اور شاعر تھے اور ۱۸۸۰ء میں جبکہ انہوں نے روسی لوک گیتوں کا قزاق زبان میں ترجمہ کیا تو ان کو شہرت عام نصیب ہوئی۔ انہوں نے ترجموں کے ذریعے نہ صرف پشکن (PUSHKIN) اور ٹالسٹائی (TOLS-TOY) بلکہ بائرن (BYRON) اور گوئٹے (GOETHE) کو اپنے ہم وطنوں سے روشناس کرایا۔ ولی خان کی طرح انہوں نے بھی تعلیم پر زور دیا اور کہا۔ "روسی ادب اور ثقافت کو سیکھو۔ اسی میں زندگی کی کامیابی ہے۔" [۸۱]

---

۸۱ VALI KHAN: "SOCHINENIIA"

آبائی کی رائے تھی کہ قزاق تعلیم مقامی زبان میں ہونی چاہیئے، انہوں نے روسی اسکولوں کی تعمیر پر زور دیا کیوں کہ ان کی نظروں میں مدرسوں کی تعلیم کی بہت کم وقعت تھی۔ ولی خان کی طرح انہوں نے بھی عوام کی حالت بہتر کرنے کے لئے امرا طبقے کے خلاف جد وجہد کی۔ قزاق امرا اور جاگیرداروں کی مخالفت اور ان کے نظریات کی بنا پر حکومت روس کے شبہات نے جوان کو ایک خطرناک انقلابی سمجھتی تھی، آبائی کی زندگی مشکل کردی اور ان کی صحت جلد ہی جواب دے گئی۔

قزاقوں پر سے تاتاری اثر کم کرنے اور روسی اسکولوں کے فروغ کے لئے حکومت روس نے دو نئے احکامات جاری کئے۔ اول "عارضی ضابطہ نظام برلئے میدانی خطہ جات" ۱۸۶۸ء میں جاری ہوا یہ حکمنامہ تاتاری زبان میں شائع ہوا اور اس میں قزاقستان کے علاقے میں حکومت کے دفتری کاروبار میں تاتاری زبان کے استعمال کو ممنوع قرار دیا گیا اور تاتاری مترجمین کے فرائض محدود کردیئے گئے۔ دوسرا حکمنامہ "تعلیمی قوانین وضوابط برلئے غیر روسی اقوام" ۱۸۷۰ء میں جاری ہوا۔ اس قانون کے تحت مسلم اسکولوں میں روسی زبان کی تعلیم لازمی حاصل کرنے میں سہولت ہو۔ اکتوبر ۱۹۰۶ء میں ایک اور حکمنامے کی رو سے ان اقدامات کو مزید سخت کردیا گیا۔ اب مسلم اسکولوں میں تاتاری کے بجائے مقامی زبان میں تعلیم لازمی قرار دی گئی اور کہا گیا کہ اساتذہ اسی قومیت کے ہوں جس کے طلبا ہوں۔

ان اقدامات کی وجہ سے اور روسی اور قزاق ماہرین تعلیم کی سرگرمیوں کے نتیجے میں انیسویں صدی کے خاتمے تک ایک قزاق ادبی زبان وجود میں آگئی۔ اور اس کے ساتھ ہی قومی شعور کا احساس بھی بیدار ہوچلا۔ ولی خان کے زمانے میں کہا جاتا تھا کہ تاتاریوں کے زیر اثر قزاقوں کی انفرادیت مٹ رہی ہے لیکن

بیسویں صدی کے اوائل تک یہ بات بالکل ناممکن ثابت ہوچکی تھی، قزاق روسی اسکولوں نے قزاق ثقافت اور تہذیب وتمدن کی نشوونما اور ارتقا میں بڑا اہم کردار ادا کیا لیکن حکومت کی امیدوں کے برعکس قزاقوں پر "روسیت" کا غلبہ نہ ہوسکا بلکہ تاتاری اثرات سے آزاد ہوکر ایک ایسی قزاق قوم کی بنیاد پڑی جس کی جداگانہ شخصیت اور منفرد ثقافت تھی۔ اس میں شک نہیں کہ گذشتہ صدی ختم ہونے تک قزاق دانشوروں اور اہل الرائے پر روسی تہذیب وثقافت کا بڑا گہرا اثر تھا لیکن اس کے باوجود وہ کٹر قوم پرست تھے اور وہ نہ روسی بننا چاہتے تھے، نہ تاتار اور نہ ترک۔ روسیوں اور تاتاریوں سے دوستانہ تعلقات کے باوجود تمامتر قزاق دانشور، جن کا ترجمان اخبار "قزاق" تھا اپنی آزاد روش پر قائم رہے۔ ان میں سے ہر ایک بے لوثی سے اپنے نصب العین پر ڈٹا رہا۔ اور علم کی جستجو میں کوشاں رہا۔ مثال کے طور پر قزاق ادیب کاشاطوف KASHATOV نے ۱۹۰۸ء میں اپنے مضمون "ہدایاتِ قزاق" میں مشورہ دیا کہ "ہمیں سائنس اور تجارت کا مطالعہ کرنا چاہیئے اور دنیا میں اپنے عوام کی رہنمائی کرنی چاہیئے"۔ ۱۹۱۰ء میں دولتوف (DULATOV) نے "قزاق جاگ اٹھو" کا نعرہ بلند کیا۔

۱۹۰۵ء کے انقلاب کا زمانہ قزاقستان میں بھی طوفان خیز تھا لیکن تمامتر انقلابی کارروائیاں اور بدنظمی صرف ان ہی علاقوں میں عام تھی جہاں روسی اور یوکرین نوآبادیاں قائم تھیں۔ دوسری دوما میں شمالی قزاقستان کے یورپی آبادکاروں نے جو چار نمائندے بھیجے ان میں سے ۳ بالشوک تھے لیکن سوشل ڈیموکریٹ پارٹی کو خانہ بدوشوں میں زیادہ کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ ان میں ایسے لوگوں کا نقدان تھا جو قزاق زبان بول سکتے۔

۱۹۰۷ — ۱۹۰۵ء کے واقعات میں قزاقوں نے صرف اتنا ہی حصہ لیا کہ ایک آدھ مقام پر آبادکاروں کے خلاف مظاہرے ہوئے[1] اور کبھی کبھار سوشل ڈیموکریٹ یا دوسری انقلابی جماعتوں کے جلسوں میں تھوڑے بہت لوگ شامل ہوجاتے اس دوران نئے اسکول قائم کرنے کے لئے متعدد عرضداشتیں پیش کی گئیں۔ ۱۹۰۵ء میں قزاق مفکرین اور قبائلی رہنماؤں کے ایک وفد نے پیٹرزبرگ جاکر زار نکولس دوم سے قزاقستان کے زرخیز میدانوں میں آبادکاری پر پابندیاں عائد کرنے کی درخواست کی اور حکومت کے کاروبار میں روس کے ساتھ ساتھ قزاق زبان استعمال کرنے کی اجازت چاہی۔ زار نے یہ دونوں درخواستیں نامنظور کردیں، لیکن پیٹرزبرگ کے دوران قیام میں قزاقوں نے کیڈٹ پارٹی سے تعلقات استوار کرلئے اور دسمبر ۱۹۰۵ء میں مغربی قزاقستان کے آزاد خیال اور اہل الرائے طبقے اور قزاق رہنماؤں اور امرا کی ایک کانفرنس میں طے پایا کہ کیڈٹ پارٹی سے زیادہ سے زیادہ تعاون کیا جائے۔ اسی قسم کی ایک قرارداد مشرقی قزاقستان کے رہنماؤں نے "آلما اتا" میں منظور کی۔ ان دونوں گروہوں کے سربراہ "قزاق" کے ایڈیٹر بیتر سنوف (BAITURSUNOV) تھے جن کی انتخابی سرگرمیوں سے قزاق کیڈٹ پارٹی کو کامیابی حاصل ہوئی۔ قزاقستان میں انتخابات کے لئے مقامی باشندے اور یوروپی آبادکار علیحدہ علیحدہ انتخاب کرتے تھے۔

ولی خان اور آبائی کے اصول و ہدایات پر قائم شدہ نئی روایات کے

---

[1] آبادکاری کے مسئلہ پر اکثر و بیشتر خونریز ہنگامے ہوتے رہے ہیں۔ اشتراکی حکومت کے قیام کے بعد بھی یہ مسئلہ کلی طور پر حل نہ ہوسکا۔ ۱۹۵۸ء میں قزاق اور روسیوں کے درمیان اس قدر سنگین فسادات ہوئے کہ خروشچوف کو بذات خود جانا پڑا اخبار "ایکلیچی قزاق" مورخہ جون ۱۹۵۸ء

تحت قزاق رہنما ترک قومی تحریک سے قطعاً بے تعلق تھے اور اس لئے "اتفاق" پارٹی سے کسی قسم کا تعاون نہیں ہوا۔ مذہب سے معمولی تعلق ہونے کی وجہ سے ان پر اسمٰعیل بے کی تحریک "اتحاد اسلامی" کا بھی کوئی خاص اثر نہیں پڑا، علاوہ ازیں تاتاری حکام، علما اور تاجروں سے محتاط رہنے کی وجہ سے وہ تاتاری قیادت اور ثقافتی برتری سے بھی محفوظ رہے۔ قزاق زبان کا عثمانی ترکی یا تاتاری سے دور کا بھی لگاؤ نہیں تھا لہٰذا قدرتاً انہوں نے اپنی نئی زبان کو فروغ دیا۔

۱۹۰۶-۱۹۰۵ء کی پہلی اور دوسری کل مسلم کانگریس میں کسی بھی قابل ذکر قزاق رہنما نے شرکت نہیں کی۔ تیسری کانگریس میں شاہ مردان نے جو دوما کے ممبر بھی تھے، کارروائیوں میں حصہ لیا اور مسلم عوامی پارٹی کے ممبر منتخب ہوئے۔ لیکن شاہ مردان کی شمولیت ایک اتفاق تھا، ان کا نہ تو شمالی اور مشرقی قزاقستان کے کثیر التعداد قزاقوں سے تعلق تھا اور نہ ہی وہ قزاق مفکرین اور اہل الرائے طبقے سے متعلق تھے۔ تمام تر دانشور، مفکرین اور آزاد خیال طبقہ کیڈٹ پارٹی کا حامی تھا اور اخبار "قزاق" ان کے خیالات و نظریات کا آئینہ دار تھا جن کی بنا پر قزاق قومی پارٹی کی بنیاد پڑی۔ اس پارٹی نے آگے چل کر ۱۹۱۷ء میں خاص اہمیت حاصل کر لی۔

۱۹۱۷ء کے انقلاب کے اوائل تک قزاق رہنما کیڈٹ پارٹی سے اپنے سب سے سنگین مسئلہ یعنی زرخیز میدانوں میں یوروپی باشندوں کی آبادکاری کے حل کی امید میں تعاون کرتے رہے۔ انیسویں صدی کے اواخر میں قزاقستان میں روسی زراعتی آبادکاری کی سطح پریشان کن حد تک پہنچ چکی تھی۔ ۱۸۹۰ء تک روسی نوآبادیاں یورال اور ارتیش IRTISH دریاؤں کے ساتھ ساتھ اور سمرچی کے نیم کوہستانی میدانوں میں آباد تھی۔

روس میں ۱۸۹۲ — ۱۸۹۱ء کی قحط سالی کے بعد نئے آباد کاروں کی تعداد بہت بڑھ گئی، حکومت نے، شریعت کی آڑ لے کر، خانہ بدوشوں کی فاضل زمین پر قبضہ کرلیا۔ ان نو آبادیوں کے خاص خاص علاقے جنوب مغربی شمالی اور مشرقی قزاقستان میں واقع تھے جہاں کی زرخیز سیاہ مٹی اور آب وہوا زراعت کے لئے بڑی موزوں تھی۔

۱۹۰۴ء میں "نو آبادی انتظامیہ" کے قائم ہونے اور ۱۹۰۵ء کے انقلاب کے بعد اقتصادی ترقی کی وجہ سے آباد کاروں کی بڑی جماعتیں یہاں اور پہنچ گئیں۔ روسی وزیر اعظم اسٹولیپن (STOLYPIN) کی اس زرعی پالیسی نے بھی کہ روس اور یوکرین کی زرعی آبادی کو گھٹا دیا جائے، قزاقستان میں آباد کاروں کی تعداد بہت بڑھادی۔ ۱۹۱۲ — ۱۹۰۶ء کے عرصے میں ۴ لاکھ سے اوپر روسی اور یوکرینی کاشتکار خاندان نقل مکانی کر کے قزاقستان آئے، ان لوگوں کو آباد کرنے کے لئے حکومت نے مزید ½ ۸ کروڑ ایکڑ زمین پر قبضہ کرلیا پہلی جنگِ عظیم کے وقت تک قزاقستان کے میدان روس کی اجناس وغلے کی بہم رسانی کا اہم مرکز بن چکے تھے۔

حکومت جس تیز رفتاری سے زمینوں کو اپنی تحویل میں لے رہی تھی اس کا قزاقوں کی اقتصادی حالت پر نمایاں اثر ہوا۔ کچھ خانہ بدوشوں نے زراعت اختیار کرنی چاہی لیکن ناتجربے کاری اور خانہ بدوشی سے فطری لگاؤ کی وجہ سے ان کا یہ تجربہ زیادہ کامیاب نہ ہوسکا بہت سے خانہ بدوشوں کو اپنی زرخیز زمینیں اور سرسبز چراگاہیں نو آبادکاروں کے حوالے کر کے وسطی اور جنوبی قزاقستان کے خشک اور بنجر علاقوں کی طرف ہجرت کرنی پڑی۔ نتیجتاً ان کے مویشی اور گلے کم ہوگئے اور قزاقوں میں قحط کے آثار نمودار ہونے لگے۔

ویسے یہ حقیقت اسی وقت جبکہ وسط انیسویں صدی میں قزاقستان کا سلطنت روس کے ساتھ الحاق ہوا، عیاں ہوگئی تھی کہ میدانوں میں امن و امان قائم ہونے اور آبادکاری پھیلنے سے قزاقوں کی صدیوں پرانی خانہ بدوش معیشت کو کاری ضرب لگے گی۔

۱۸۶۰ء—۱۸۷۰ میں روسی سیاحوں نے اس بات کی طرف توجہ دلائی تھی کہ خانہ بدوشوں کی کثیر تعداد کو پیٹ بھر کے کھانا نصیب نہیں ہوتا ہے۔ ۱۸۹۶ء کے لگ بھگ قزاقستان کے ۵۰ فی صدی مویشی صرف ۷ فی صد آبادی کی ملکیت میں تھے جبکہ ۵۰ سے ۷۰ فی صدی آبادی انتہائی غربت و افلاس کا شکار تھی۔ روسیوں کی زرعی آبادکاریوں کے بعد یہ حالت اور بھی بگڑ گئی۔ قزاق عوام کی اس تباہ حالی نے قزاق رہنماؤں کو بڑا متردد کر دیا اور انہوں نے مشورہ دیا کہ خانہ بدوشوں کی حالت بہتر بنانے کے لئے روسی آبادکاریاں روک دی جائیں۔ ۱۹۰۷ء میں قزاق رہنماؤں کی کانفرنسیں ٹرائسک، اورن برگ اور قستنائی میں منعقد ہوئیں جن میں قزاق میدانوں میں کاشتکاروں کی آبادکاری سے معاشرتی و اقتصادی زندگی پر اس کے اثرات اور دوسرے متعلقہ مسائل پر مواد جمع کیا گیا ان کانفرنسوں میں مطالبہ کیا گیا کہ خانہ بدوشوں کی زمینوں پر آبادکاری کا کام فوراً روک دیا جائے اور دوما میں قزاق نمائندگی جو ۱۹۰۷ء میں ختم کر دی گئی تھی بحال کی جائے۔ روس کی تمام آزاد خیال جماعتوں نے ان مطالبات کی حمایت کی لیکن حکومت نے آبادکاری کے مسائل پر بات چیت سے ہی انکار کر دیا۔ ان نوآبادیوں سے نہ صرف روس کو کثیر مقدار میں غلہ اور اجناس فراہم ہوتے تھے بلکہ کثیر التعداد روسی کسانوں کی کھپت کا بھی ذریعہ تھا۔

قزاقستان کی ان نئی بستیوں میں خانہ بدوشوں اور نئے آبادکاروں کے

تعلقات میں کشیدگی ایک لازمی امر تھا۔ اکثر و بیشتر کشیدگی اس لئے بھی بڑھ جاتی تھی کہ روسی حکام کو ایسے مقامی عناصر پر بھروسہ کرنا پڑتا تھا جن کا اپنے عوام سے کوئی رابطہ نہیں تھا، چنانچہ وہ ان خانہ بدوشوں کی مشکلات یا مسائل کو صحیح طور پر پیش کرنے سے قاصر تھے۔ روسیوں نے جو جمہوری طریقۂ انتخاب رائج کیا وہ خانہ بدوشوں کے قبائلی نظام زندگی میں مقبول نہ ہوسکا اور انتخابات محض تماشا بنکر رہ گئے۔ منتخب کردہ مقامی حکام رشوت خوری اور اقربا پروری کا شکار ہو گئے۔ اکثر و بیشتر ان حالات کی بڑی ذمہ داری خود روسی حکام پر عائد ہوتی تھی۔ قزاقستان اور وسطی ایشیا میں جو سرکاری ملازم بھیجے جاتے تھے وہ دیانت داری اور قابلیت کا اعلےٰ نمونہ نہیں ہوتے تھے۔ ان میں بہت سے ایسے ہوتے جو یوروپی روس میں بمشکل تمام اپنے فرائض منصبی نباہ سکتے۔ مرکزی حکومت سے دوری اور مقامی آبادی کی پس ماندگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ سرکاری ملازمین ہر طرح کی غیرقانونی اور قابل اعتراض سرگرمیوں میں مصروف رہتے۔ بے نیازی، رضائے الٰہی پر قناعت، سلطنت کے دبدبے اور زار روس کی اطاعت کے جذبات نے خانہ بدوشوں کی بے چینی اور بد اطمینانی کو کھلم کھلا ابھرنے نہیں دیا۔

ازبیک اور بخاری قوم پرست

سلطنت روس کے کسی اور مسلمان علاقے میں یوروپی تہذیب و تمدن اور آزاد خیالی کی اتنی شدید مخالفت نہیں ہوئی جتنی کہ وسطی ایشیا میں جس کو روس نے ۱۸۶۵ء — ۱۸۷۶ء کے دوران فتح کیا تھا۔[1] اس مخالفت کی وجہ وسطی ایشیا کے باشندوں کی پسماندگی نہیں بلکہ اپنی عظمت رفتہ اور ماضی کی شاندار روایات کی بنا پر تھی۔ وسط ایشیائی تہذیب کے نامور عالم بارتھولڈ (BARTHOLD) نے لکھا ہے کہ

"قرون وسطیٰ کے برعکس انیسویں صدی میں ترکستان اسلامی دنیا کا پست ترین ملک تھا۔"

اس خطے میں جہاں الفارابی اور ابوسینا جیسے شہرۂ آفاق مفکر، نوائی جیسے بے مثال شاعر اور البیرونی و خوارزمی جیسے ممتاز سائنس دان پیدا ہوئے، سولہویں صدی کے اوائل سے تمدنی اور اقتصادی انحطاط شروع ہو چکا تھا۔ اس کی بڑی وجہ مشرق بعید کے بحری راستے کی دریافت تھی جس کی وجہ سے چین اور ہندوستان کی براعظمی تجارت وسط ایشیا کے نخلستانوں سے گزرنی بند ہو گئی۔ جس کا اثر لازماً یہاں کے لوگوں کی خوشحالی پر پڑا۔ اس کے ساتھ ہی چنگیز خاں کی قائم کردہ سلطنت کے زوال نے چین اور مشرق وسطیٰ کے تجارتی تعلقات

---

[1] ۱۸۶۵ء میں تاشقند پر حملہ ہوا۔

پر برا اثر ڈالا۔ تقریباً اسی زمانے میں ایران کی بڑھتی ہوئی طاقت نے سمرقند و بخارا کے مسلمانوں کو بحیرۂ روم کے مسلم ممالک سے الگ تھلگ کر دیا۔ وسطی ایشیا کی اس علیحدگی نے جو جغرافیائی طور پر پہلے ہی دور گذار علاقہ تھا، اس خطے میں روحانی انحطاط پیدا کر دیا۔

وسطی ایشیا کے تمدنی زوال میں ترک خانہ بدوشوں کی فتوحات کو بھی بڑا دخل تھا۔ ۱۰۰۰ء اور ۱۵۰۰ء کے درمیان تین دفعہ اس ایران نژاد علاقے کو ترکوں نے تاخت و تاراج کیا۔ ان حملوں کے دوران آب پاشی کے نظام اور شہری آبادی کے مراکز تباہ و برباد کر دیئے گئے اور نخلستانوں کی آبادیاں اجاڑ کر نیم تہذیب یافتہ خانہ بدوش آباد ہو گئے۔ ان حملوں میں سب سے اہم اور دور رس پندرہویں صدی کا آخری ازبیک حملہ تھا، جس کے نتیجے میں آئندہ ۴ سو سال کے لئے سیر اور آمو دریاؤں کے نخلستانوں پر ازبیک حکمرانی قائم ہو گئی۔ ان نئے ترک حملہ آوروں نے مختلف النوع ایرانی اقوام کو بڑی سُرعت سے اپنے اندر جذب کر لیا۔ وسطی ایشیا میں اپنے اولین دور اقتدار ہی سے ازبکیوں نے مذہبی امور میں انتہا پسندی کا مظاہرہ کیا[۱] اور ہر بیرونی فکریات اور نظریات کی سخت ترین مخالفت کی۔ ازبیک حکمرانوں نے اپنے رسم و رواج اور طریق زندگی میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں ہونے دیا اور سُنی عقائد سے قطعاً انحراف نہیں کیا۔ پرانے علوم و فنون کی جگہ تنگ نظر اور شدید قسم کی مکتبی تہذیب نے لے لی جس کے نتیجے میں وسطی ایشیا کے افکار و نظریات پر جمود طاری ہو گیا۔

وسطی ایشیا میں روسیوں کو کسی ایک ممنوع ریاست یا نظام حکومت سے

---

[۱] شیبانی خان کے ترکی دیوان میں بھی خالص سُنی رنگ نظر آتا ہے۔

بجائے مختلف النوع جاگیرداریوں اور قبائلی حد بندیوں سے جو انتہائی پیچیدہ قومی رشتوں میں وابستہ تھے پالا پڑا سیر اور آمو دریاؤں کے درمیان کا زراعتی علاقہ اور فرغانہ کی زرخیزی وادی بخارا خوقند اور خیوا کی تین بڑی "خانیت"[1] پر مشتمل تھی۔ اس کے علاوہ بیشمار چھوٹی چھوٹی خراج گذار یا آزاد جاگیرداریاں بکھری ہوئی تھیں۔ ان سب ریاستوں اور جاگیرداریوں میں سیاسی اور اوپری طبقہ ازبکیوں پر مشتمل تھا۔ روسی فتوحات سے فوراً قبل وسطی ایشیا کی سیاسی زندگی میں طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا۔

ازبیک حکمرانی کے علاوہ یہاں فارسی بولنے والی ماؤں کی تاجک اولاد اور ان کے بھائی بند اور پرانے ترک فاتحین کی نسلیں آباد تھیں۔ سیر اور آمو دریا کے اس درمیانی علاقے کے اردگرد دوسرے خانہ بدوش ترک قبائل، مغرب میں ترکمان، شمال میں قزاق اور مشرق میں قرغیز آباد تھے جو ازبیک حکمرانوں کے خلاف اپنی چراگاہوں اور زرخیز میدانوں کی انتہائی احتیاط سے حفاظت کرتے تھے مذہب اور تہذیب و تمدن میں بھی خاصے امتیازات تھے۔ بستیوں میں رہنے والے عوام سختی سے شریعت کے پابند تھے اس کے برعکس خانہ بدوش برائے نام مسلمان تھے لیکن "عادات" (اسلامی رسم و رواج) پر کاربند تھے۔ بخارا، خوقند اور خیوا میں شیعہ اور یہودی اقلیتیں بھی آباد تھیں۔ زیادہ تر یہودی ایرانیوں کے غلام تھے۔

وسطی ایشیا کے اس پیچیدہ نسلی ڈھانچے اور رنگ برنگی لسانی خاکے کی وجہ سے قومی شعور کے فروغ کو کامیابی نہ ہو سکی۔ انقلاب سے قبل سلطنت

---

[1] ترکی زبان میں "خان لق" کہتے ہیں۔

روس کے دوسرے مسلمان گروہوں کے مقابلے میں ترکی بولنے والے ازبیک اور فارسی بولنے والے تاجکوں میں اسلام اور اسلامی تہذیب و ثقافت سے بہت گہری ہم آہنگی تھی اور اس کی وجہ سے کسی قومی نظریئے کو تقویت نہ پہنچ سکی۔ لسانی مسئلے نے بھی قومی بیداری کا کام مشکل کر دیا۔ حالانکہ گیارہویں صدی کی ترک فتوحات کے بعد ترکی زبان نے بڑی حد تک فارسی کی جگہ لے لی تھی لیکن اس کے باوجود وسطی ایشیا کی ثقافتی زندگی میں فارسی غیر معمولی اہمیت کی حامل رہی۔ شاعری اور روزناموں میں چغتائی کے بجائے عموماً فارسی مستعمل ہوتی تھی اور امیر بخارا کی حکومت نے فارسی کو ازبیک پر فوقیت حاصل تھی۔ پڑھے لکھے لوگ اور دانشور دونوں زبانوں پر دسترس رکھتے تھے۔ اس ضمن میں مشہور ازبیگ ادیب اور قوم پرست عبدالرؤف فطرت کا تذکرہ باعث دلچسپی ہے جنہوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز فارسی میں کیا اور پھر پہلی جنگ عظیم کے بعد ازبیگ زبان اختیار کر لی۔ اس کے برعکس بخارا میں "جدید" تحریک کے ایک پرانے رہنما صدرالدین عینی نے جو تاجک سائنس اکیڈمی کے صدر تھے اور جن کا ۱۹۵۴ء میں انتقال ہوا ازبیک چھوڑ کر فارسی اختیار کی۔ بہت سے علاقوں میں خصوصاً بخارا، سمرقند اور فرغانہ کی مغربی وادی میں زیادہ تر لوگ دونوں زبانیں بولتے اور سمجھتے تھے اور چنانچہ دونوں زبانوں کی لغت اور قواعد پر ایک دوسرے کا اثر انداز ہونا لازمی امر تھا۔ نسلی اعتبار سے وسطی ایشیا کی زیادہ آبادی میں ہند، یوروپی نسلی خصوصیات برقرار ہیں اور صرف تاشقند، مشرقی فرغانہ اور کشک دریا کے خطوں میں ترک رنگ و روپ اور چہرے مہرے کی جھلک پائی جاتی ہے۔

انگلستان کی رقابت کی وجہ سے جنوب میں روسیوں نے وسطی ایشیا کے علاقوں کے براہ راست الحاق سے اجتناب کیا۔ ۱۹۲۰ء تک بخارا اور خیوا کے وسیع علاقے

روسی حدود کے باہر تھے۔ ان کے حکمراں یعنی "خان" اندرونی معاملات میں پوری طرح خود مختار تھے لیکن حقیقتاً وہ سلطنت روس کے اطاعت گذار تھے۔ وسطی ایشیا کے الحاق شدہ علاقے ترکستان کے فوجی گورنر کے تحت منظم تھے جس کا دارالحکومت تاشقند میں تھا۔ یہ علاقہ تین صوبوں فرغانہ، سمرقند اور سیر دریا میں منقسم تھا۔ ان نئے روسی صوبوں کے معاشرتی نظام میں کوئی خاص تغیر و تبدل نہیں کیا گیا اور بہت سی پرانی انتظامی روایتی خصوصیات کو برقرار رہنے دیا گیا۔ اعلیٰ عہدیدار یعنی گورنر کا ذاتی عملہ اور ضلعدار روسی یا یوروپی روس کے باشندے ہوتے تھے لیکن نچلے درجے پر پہلے کی طرح شہروں اور دیہاتوں کے حکام مقامی منتخب شدہ مسلمان باشندے ہوتے تھے۔ یہی اصول عدالتوں میں بھی تھا۔ صرف غیر مقامی باشندوں کے مقدمات یا فوجداری کے سنگین مقدمات روسی عدلیہ کے تحت آزمائے جاتے تھے۔ دیوانی کے زیادہ تر مقدمات خصوصاً مقامی باشندوں کے خاندانی یا تجارتی جھگڑے اور فوجداری کے چھوٹے موٹے قضیئے منتخب شدہ قاضیوں کے روبرو لائے جاتے تھے۔[1]

وسطی ایشیا میں شروع ہی سے روسی پالیسی یہ تھی کہ مذہبی اور ثقافتی زندگی میں کسی قسم کی دخل اندازی نہ کی جائے۔ ۱۸۷۶ء میں جب روس میں فوجی ملازمت لازمی قرار دی گئی تو وسطی ایشیا کے مسلمانوں کو اس سے مستثنیٰ رکھا گیا جس کی وجہ سے ان پر روسیت کا رنگ چڑھنے سے رہ گیا۔ حکومت روس نے فتوحات کے وقت اسلام کو وسطی ایشیا کا مذہب تسلیم کر لیا تھا اور ترکستان کے پہلے گورنر جنرل کوف مین (KAUFMAN) (۱۸۶۷ء—۱۸۸۲) نے اپنے دور حکومت میں

---

[1] SCHUYLER: "TURKISTATAN" (NEW YORK. 1876)

راسخ العقیدہ مسیحی مبلغین کو وسطی ایشیا کے صوبوں میں آنے کی قطعی ممانعت کر دی تھی۔

جنرل کوف مین کی پالیسی کا مقصد یہ تھا کہ مقامی عوام کی دشمنی مول لئے بغیر روسی اقتدار کو مضبوط بنایا جائے۔ ان کا خیال تھا کہ بالآخر فرسودہ اسلامی تہذیب خود بخود انتشار کا شکار ہو جائے گی اور عوام روس کی نئی تہذیب کو خود ہی اختیار کرلیں گے۔ وہ ایک فوجی منتظم تھے اور ان کا کام اس پورے خطے میں امن و امان قائم رکھنا تھا، ان کو ثقافتی اور تمدنی اصلاحات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ شروع سالوں میں روسی انتظامیہ کے مقاصد صرف اتنے ہی تھے کہ وسطی ایشیا میں امن قائم رہے، غلامی کا سدّ باب کیا جائے اور لوٹ مار اور رہزنی کو ختم کیا جائے۔

مقامی مدرسوں اور مکتبوں کے سلسلے میں بھی اسی قسم کی رواداری کا سلوک کیا گیا۔ وسطی ایشیا پر زار کی ۵۰ سالہ حکومت کے دوران مقامی اسکولوں میں نہ تو روسی زبان رائج کرنے کی کوشش کی گئی اور نہ ہی نصاب تعلیم میں دخل اندازی کی گئی۔ مدرسوں اور مکتبوں میں آبائی طریقہ تعلیم جاری وساری رہا انقلاب سے قبل ثقافتی احیا کی راہ میں یہی نظام تعلیم سب سے بڑی رکاوٹ ثابت ہوا۔ اعداد و شمار کے مطابق ۱۹۱۱ء میں وسطی ایشیا میں ۶۰۰۰ مکتب اور ۲۵۰ مدرسے قائم تھے جن میں ایک لاکھ سے زائد طلبا تعلیم پا رہے تھے۔ بخارا میں تقریباً ڈیڑھ لاکھ طلبا ۶۵۰۰ مکتبوں میں تعلیم پا رہے تھے۔ اس سے یہ بخوبی عیاں ہے کہ وسطی ایشیا کے ۳ صوبوں کے لئے جن کی مجموعی آبادی ۲۵ لاکھ تھی ۶۰۰۰ اسکولوں کی تعداد کچھ کم نہ تھی اس کے علاوہ بے شمار ایسے اسکول بھی قائم تھے جن کو سرکاری سرپرستی حاصل نہیں تھی۔[۱]

---

[۱] عینی۔ بخارا" (ماسکو ۱۹۵۰ء)

۱۹۱۰ء میں چند اضلاع میں سات سے ۱۳ سال کی عمر کے ۲۰ فی صد سے زائد لڑکے تعلیم پا رہے تھے۔ حالانکہ اس مواد میں پورے ترکستان کے اعداد و شمار شامل نہیں ہیں پھر بھی ۱۸۹۷ء کے مقابلے میں ترقی کی رفتار ظاہر ہے اس وقت تمام وسطی ایشیا میں مردوں کی تعلیم کا تناسب ۸ فی صد اور عورتوں میں ۲ فی صد تھا۔ انقلاب سے پہلے بخارا میں تعلیم کا تناسب بہت کم تھا۔ حتیٰ کہ تاجکستان میں صرف ایک فی صد تھا۔ روس کے تمام مسلم اسکولوں میں نصاب پر دینی تعلیم کا گہرا اثر تھا۔ ذریعۂ تعلیم عربی تھی اور مقامی زبانوں کو کم از کم اہمیت دی جاتی تھی، جس کی وجہ سے ازبیک اور تاجک طلبا کو بڑی مشکلات ہوتی تھیں اور وہ عربی کتابوں کو رٹ لیا کرتے تھے۔ روسی اور یوروپی سیاحوں نے ان مدرسوں اور مکتبوں کے جو حالات چھوڑے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ انیسویں صدی کے وسط اور بیسویں صدی کے اوائل تک ان میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں واقع ہوئی تھی۔ ایک روسی سیاح نے جو روسی قبضے سے قبل ۱۸۴۰ء میں بخارا گیا تھا لکھا کہ

"بخارا کی سڑکوں پر گذرتے ہوئے اسکول آنے سے پہلے ہی طلبا کے شور و شغب سے اس کا پتہ چل جاتا ہے"

کچھ اسی قسم کا حال ایک اور روسی نے بھی لکھا ہے۔ جو ۱۹۱۸ء میں بخارا کے شہر میں تھا۔

"طلبا فرش پر پالتی مار کر بیٹھتے ہیں اور جھوم جھوم کر بلند آواز میں اپنا سبق پڑھتے ہیں۔ اس کا کُل مقصد یہ ہے کہ قرآن کی سورتوں کو حفظ کر لیا جائے خواہ اس کے معنی سمجھ میں نہ آئیں"[۵]

---

[۵] "KHANYKOV: "BOKHARA: ITS AMIR & ITS PEOPLE". (LONDON 1845) عینی بخارا

اس طریق تعلیم اور غیر تربیت یافتہ اساتذہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ مکتبوں سے نکلے ہوئے زیادہ تر طالب علم جاہل کے جاہل ہی رہے۔ ۱۹۱۴ء میں دولت مند تاجک تاجروں کے ایک گروہ نے بخارا میں روسی سفارتی ایجنٹ کو لکھا کہ

"ہم نے سات سال تک مکتبوں اور مدرسوں میں تعلیم پائی مگر ہم پھر بھی جاہل رہے اور ہمیں تعلیم سے کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔"

متعدد تذکروں سے مسلم اسکولوں کی ناگفتہ بہ حالت کا اندازہ ہوتا ہے۔ مکتبوں میں سات آٹھ سال تعلیم پانے کے باوجود چندے معدودے ہی لکھ پڑھ سکتے تھے ان میں سے صرف ۱۰، ۱۲ فی صدی طلبا اعلیٰ تعلیم کے لئے مدرسوں کا رخ کرتے تھے جہاں ان کو ملاّ، امام، مدرس، قاضی یا محاسب بننے کی تعلیم و تربیت دی جاتی تھی۔

ان مدرسوں میں سائنس یا انسانیت کے مضامین تو درکنار تاریخ اسلام تک نہیں پڑھائی جاتی تھی۔ فقہ اور شرع کی تعلیم کے علاوہ اور کسی طرح کی پیشہ ورانہ تعلیم مفقود تھی۔ البتہ بو علی سینا کی پرانی کتابوں سے حکمت سیکھی جاسکتی تھی۔ طلبا کی تمامتر تربیت علم مناظرہ پر مرکوز تھی، لیکن ان خامیوں کے باوجود وسطی ایشیا کے چند مدرسے خصوصاً بخارا کا مدرسہ، "میر عرب[1]" اسلامی دنیا میں شہرہ آفاق تھا جہاں بے مثال، دینی، فقہی، شرعی اور منطقی تعلیم دی جاتی تھی۔ کٹر اور پارسا امیر شاہ مراد (۱۸۰۰ــ ۱۷۸۵ء) اور حیدر (۱۸۲۵ــ ۱۸۰۰ء) کے دور حکومت میں راسخ العقیدہ مسلمانوں کی سرپرستی اور نگہبانی کے لئے بخارا کا نام

---

[1] یہ آج بھی مشہور ہے اور یہاں بھی صرف و نحو اور منطق کی تعلیم دیجاتی ہے۔

دور دور پھیل گیا۔ بخارا میں شریعت کا لحاظ اور پابندی کا تذکرہ سن سن کر چین، ہندوستان، افغانستان، قزاقستان، قفقاسیہ اور یوروپی روس سے جوق در جوق طالبعلم یہاں آتے تھے۔

مقامی باشندوں میں روسی ثقافت پھیلانے کے لئے حکومت نے روسی اسکولوں میں مسلمان طلبا کو بلانے کے لئے ہر ممکن کوشش کی۔ لیکن مسلم سوسائٹی میں اپنے بچوں کو عیسائی اسکولوں میں پڑھانے کی شدید مخالفت ہونے کی وجہ سے یہ کوششیں بالکل ناکام ہوگئیں۔ حالانکہ حکومت نے وظائف اور خصوصی مراعات بھی دیں مگر پھر بھی روسی اسکولوں میں تھوڑی سی اوّلیں کامیابی کے بعد مسلم طلبا کی تعداد گھٹنے لگی اور ۱۹۱۲ء میں وسطی ایشیا کے روسی سیکنڈری اسکولوں کے ۱۴ ہزار طلبا میں سے صرف ۲۰۰ مسلمان تھے۔

۱۸۶۰ء کے دوران المنسکی کی اسکیم کے تحت جو اسکول قائم کئے گئے ان میں البتہ نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔ ان اسکولوں میں پرائمری مدارج تک مقامی زبان میں تعلیم دی جاتی تھی اور اونچی جماعتوں میں روسی زبان ذریعۂ تعلیم تھی۔ ان اسکول میں جہاں دو زبانیں پڑھائی جاتی تھیں طلباء کو سرکاری ملازمتوں کے لئے تیار کیا جاتا تھا۔ ۱۹۰۹ء میں اس قسم کے ۱۹۰ اسکولوں میں تقریباً ۲½ ہزار مسلمان طلبا تعلیم پا رہے تھے۔ ۱۹۱۱ء تک ان اسکولوں کی تعداد ۱۲۰ تک پہنچ چکی تھی اور ان میں داخلہ حاصل کرنا مشکل ہوگیا تھا۔ ان اسکولوں کے فروغ میں اکثر و بیشتر بڑی رکاوٹ مسلم شہری انتظامیہ تھی جو کسی مالی معاونت پر تیار نہیں تھی۔ جب روسی حکام نے مسلمان امرا کو ہدایت کی کہ وہ اپنے بچوں کو ان اسکولوں میں بھیجیں تو اکثر امرا نے غریب خاندان کے بچوں کو معاوضہ دے کر اپنے بچوں کے بجائے داخل کروا دیا۔ ۱۹۰۵ء میں روسی حکومت کو جو عرضداشتیں پیش کی گئیں ان سب میں اس بات پر زور دیا

گیا کہ ان اسکولوں کو بند کر دیا جائے اور ایسے طلبا کو سرکاری وظائف نہ دیئے جائیں جو مکتبوں کی تعلیم مکمل کر کے ان اسکولوں میں اپنی تعلیم جاری رکھنا چاہیں۔ مقامی مسلمان آبادی کی ہچکچاہٹ پہلی جنگ عظیم کے اوائل تک بڑی حد تک کم ہو گئی اور تاشقند کے اسکولوں میں مقررہ نشستوں سے زیادہ داخلے ہونے لگے۔ بالآخر روسی حکام کی کوششیں بار آور ہونے لگیں۔

اس تبدیلی کا سہرا کسی حد تک تاشقند سے نکلنے والے سرکاری اخبار کے سر تھا جس نے روسی زبان اور روسی تہذیب کو وسطی ایشیا میں مقبول بنانے کے لئے بڑی کوششیں کیں۔ اس اخبار کے ایڈیٹر آسترو موف (OSTROUMOV) ایک ماہر شرقیات تھے اور وسطی ایشیا کے مسائل سے بخوبی واقف تھے اور کئی سالوں سے روسی ادیبوں کے مقالات کا ترجمہ جن کا تعلق روسی زندگی، معاشیات اور ثقافت سے تھا شائع کر رہے تھے۔ انہوں نے چند ممتاز آزاد خیال ازبیک ادیبوں کا تعاون بھی حاصل کر لیا تھا۔ محمود خواجہ مرزا خوجہ مقیمی (۱۹۰۳ــ ۱۸۵۰ء) ذاکر جان فرقت (۱۹۱۹ ــ ۱۸۵۹ء) عبداللہ سالک ذوقی (۱۹۲۱ ــ ۱۸۵۳ء) خوجہ محیط الدین (۱۹۱۱ ــ ۱۸۳۵ء) اور دوسرے مشہور ازبیک ادبا کے افسانوں، شاعری اور مقالات کی وجہ سے آسترو موف کے اخبار کو بڑی مقبولیت ہوئی۔ آسترو موف نے ان ادبا اور شعرا کو روس کے یوروپی علاقوں میں سیاحت کے لئے بھی بھیجا جہاں سے ان لوگوں نے اپنے تاثرات لکھ کر بھیجے جن کی اشاعت سے مقامی باشندوں میں روس کے حالات کو بڑا شہرہ ہوا۔

۱۹۰۷ء میں دوما نے ایک بل منظور کیا جس کی رو سے تمام مملکت میں ۱۹۲۲ء تک لازمی تعلیم کا نفاذ ضروری قرار دیا گیا اس قانون کی وجہ سے وسطی ایشیا کے ماہرین تعلیم کو نئے قسم کے لیے اسکول قائم کرنے کی فکر لاحق ہوئی جو مقامی

باشندوں اور حکومت دونوں کو قابل قبول ہوں۔ وزارت تعلیم کے ایک خصوصی اجلاس میں یہ طے پایا کہ روایتی مکتبوں کی اصلاح کر کے ان پر نئی تعلیمی پالیسی کی بنیاد رکھی جائے۔ حساب، تاریخ اور جغرافیہ کے مضامین مکتبوں کے نصاب میں داخل کئے گئے۔ جہاں ذریعہ تعلیم مقامی زبان رکھی گئی البتہ اوپری جماعتوں میں روسی زبان کی تعلیم دی جانے لگی۔

معاشرے کے ارتقا میں تعلیمی ترقی سے زیادہ وسطی ایشیا کا حکومت روس میں الحاق اور اس سے پیدا شدہ اقتصادی اثرات نے بہت نمایاں کردار ادا کیا۔ فتوحات کے بعد وہ پابندیاں خودبخود ختم ہوگئیں جو وسطی ایشیا کے حکمرانوں نے ثقافتی پاکیزگی قائم رکھنے کے لئے عاید کی تھیں اور اس کا بڑا دوررس اثر پڑا۔ الحاق کے بعد وسطی ایشیا میں ان تمام نظریات کا پرچار ہونے لگا جن کا منبع روس، مغربی یوروپ اور مشرق کے مسلم ممالک تھے۔ روسی، تاتاری، فارسی اور ترکی کتابیں اور رسالے وسطی ایشیا کے شہروں میں عام دستیاب ہونے لگے علاوہ ازیں مقامی لوگوں کا روسی، تاتاری اور یوروپی لوگوں سے مستقل ذاتی رابطہ رہنے لگا۔

انیسویں صدی کے آخری ۲۵ سالوں میں وسطی ایشیا کے صوبے سلطنت کی اقتصادی زندگی کا اہم اور ضروری جزو بن گئے۔ روس میں کپڑے کی بڑھتی ہوئی صنعت نے کپاس کی ضرورت کو بہت بڑھا دیا چنانچہ وسطی ایشیا میں کپاس کی زراعت کو بڑی ترقی ہوئی۔ ۱۸۸۸ء سے لے کر ۱۹۱۶ء تک کپاس کا زراعتی رقبہ ۲ لاکھ ایکڑ سے بڑھ کر تقریباً ۱۲ لاکھ ایکڑ ہوگیا۔ ان ۲۸ سالوں میں کپاس کی پیداوار میں ۵۰ ۷ فی صدی ترقی ہوئی صرف ۶ سالوں میں یعنی ۱۹۱۶ — ۱۹۱۰ء تک پیداوار میں ۵۰ فی صدی اضافہ ہوا — بخارا اور خیوا کے صوبوں میں کپاس کی برآمد میں ۳۰۰ فی صدی اضافہ ہوا۔ زراعت کے ساتھ ساتھ تجارت کو بھی فروغ ہوا

اور ۱۹۱۴ء میں وسطی ایشیا سے یوروپی روس اور بیرونی ممالک میں ۳۰ کروڑ روبل کی مالیت کا مال برآمد کیا گیا۔ اس کے مقابلے میں کل درآمد ۲۷ کروڑ روبل تھی۔ وسطی ایشیا میں فی کس درآمد اور برآمد سلطنت روس کے مقابلے میں چوگنی زیادہ تھی ۱۹۱۴ء میں روسی تجارت کا اوسط ۱۵ روبل فی کس تھا جبکہ وسطی ایشیا میں یہی اوسط ۷۰ روبل فی کس تھا۔ انیسویں صدی کے آخر میں کپاس اوٹنے کے کارخانے بخارا میں بھی نظر آنے لگے، ۱۹۱۳ء میں بخارا کے صوبے میں ۲۶ کارخانے قائم ہو چکے تھے اور ۱۹۱۶ء میں صرف بخارا کے شہر میں روسی بنکوں کی ۶ شاخیں قائم تھیں اور تمام صوبے میں ایجنسیاں قائم ہو رہی تھیں۔

وسطی ایشیا کی معیشت میں تجارت کے فروغ نے خود کفیل دیہی اقتصادی وسائل کو تجارتی رخ دے دیا اور جوں جوں یہ وسائل مستحکم ہوتے گئے متوسط طبقے کی دولت اور اقتدار بڑھتا گیا۔ گذشتہ صدی کے خاتمے پر متوسط طبقہ ان افراد پر مشتمل تھا جن میں بیشتر کپاس کے کاروبار سے متعلق تھے، یا تجارت پیشہ اور ساہوکار تھے۔ مقامی معاشرے میں ان کا بڑا اثر اور رسوخ تھا۔ یہ ازبیک اور تاجک متوسط طبقہ جاگیرداروں اور قبائلی سرداروں سے قیادت حاصل کرنے، اور علماء سے اثر ورسوخ چھیننے کے لئے بہت کوشاں تھا، چنانچہ آزاد خیال مسلم طلبہ کی مدد سے انہوں نے وسطی ایشیا کے معاشرے میں ایک ایسے نئے طبقے کی بنیاد ڈالی جو نئے نظریات قبول کرنے میں پیش پیش تھا۔

وسطی ایشیا میں ان نئے نظریات اور افکار کے پہلے نقیبوں میں سے بخارا کے ایک مدبر اور شاعر احمد مخدوم دانش (۱۸۲۷ء — ۱۸۹۷ء) تھے۔ بخارا کی شکست کے بعد یہ بخارا کے سفیر کے سیکریٹری کی حیثیت سے پیٹرزبرگ گئے تھے۔ یہاں کے روسی اسکولوں، عورتوں کی آزادی اور بے پردگی، کتابوں اور رسالوں

کی فراوانی، روسی دانشوروں اور لوگوں کے اعلیٰ معیار زندگی نے دانش پر بہت ہی گہرے تاثرات چھوڑے اور وہ واپس آکر مغربیت کے سخت حامی ہوگئے انہوں نے ایک سیاسی مقالے میں اہل بخارا سے اپیل کی کہ وہ اپنے لئے ایک نیا طریق زندگی اختیار کریں۔ایک اور مقالے میں انہوں نے حکمراں طبقہ، علماء اور سرکاری ملازمین پر کڑی نکتہ چینی کی۔ان کے سیاسی فلسفے میں مطلق العنانی اور سوشلزم گڈمڈ تھے۔انیسویں صدی کے آخر اور اس صدی کے شروع میں آزاد خیال بخاریوں نے بد دیانت اور پسماندہ نظام کے خلاف جدوجہد میں دانش کے ان افکار کو اپنا لیا۔

دانش کے خاص رفیقوں میں شعرا عبد القادر (۱۸۷۳ـ۱۸۲۳ء) شمس الدین محمود (۱۸۹۳ـ۱۸۵۷ء) اور امیر بخارا کے خزانچی تاریخ داں سمیع بسطامی (تاریخ وفات ۱۹۰۸ء) تھے۔ان لوگوں نے اور ان کے رفقا مثلاً یحییٰ حاجی اور ملا شریف نے کھلم کھلا حکومت کی مخالفت نہیں کی مگر چند دوسرے آزاد خیال بخاریوں نے مثلاً ملا اکرام اور ایاز نے طریق تعلیم میں اصلاحات نافذ کرانے کی کوششیں کیں۔امیر بخارا مظفر الدین (۱۸۸۵ـ۱۸۶۰ء) نے مخالفت اور نئے نظریات کا سختی سے سدباب کرنے کی کوشش کی۔امیر بخارا کی سختیوں سے تنگ آکر یہ اولین آزاد خیال بخاری وطن چھوڑ کر چلے گئے۔چند مثلاً عیسیٰ مقسوم (مخدوم) اور عنایت مقسوم (مخدوم سمرقند اور تاشقند چلے گئے اور دوسرے شریف مقسوم (مخدوم) کی طرح قسطنطنیہ چلے گئے۔مظفر الدین کی وفات کے بعد ان کے لڑکے عبد الاحد (۱۹۱۰ـ۱۸۸۵ء) کی تخت نشینی پر یہ لوگ بخارا واپس لوٹ آئے۔

عبد الاحد کے دور حکومت میں یوروپی روس کے مسلم معاشرے میں

ثقافتی تجدید کا دور شروع ہوا اور اسمٰعیل بے کی تحریک نے جنم لیا۔ اسمٰعیل بے کے نئے حریت پسند افکار بخارا میں تاتاریوں کے ذریعے پہنچے لیکن ازبکوں اور تاجکوں نے ان میں زیادہ دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔ حریت پسند تحریک کے حامیوں اور قدامت پرستوں میں جن کی بڑی اکثریت تھی سخت تصادم ہوا، حریت پسندوں کا خیال تھا کہ نظام تعلیم کی اصلاح اور روایاتی طریق زندگی میں تبدیلی کئے بغیر مسلم معاشرے کے انحطاط کو نہیں روکا جاسکتا۔ اس کے برعکس قدامت پسند ان تغیر و تبدل کو گھریلو زندگی اور اسلامی تہذیب کے لئے سخت مضر جانتے تھے۔

ان دو متصادم نظریات کی سب سے بڑی آزمائش اسکولوں کے مسئلے پر ہوئی انیسویں صدی کے آخر میں جب اسمٰعیل بے کے اخبار "ترجمان" اور اسی قسم کے دوسرے فارسی اور ترکی اخبارات کو ازبکوں اور تاجکوں میں مقبولیت ہوئی تو آزاد خیالی کو تقویت پہنچی۔ ۱۸۹۲ء میں اسمٰعیل بے نے خود وسطی ایشیا کا دورہ کیا اور اسکولوں کی اصلاحات کے سلسلے میں اپنے افکار کا پرچار کیا قزافستان کے میدانوں اور شمالی وسط ایشیا میں تاتاریوں نے چند نئے اصلاحی اسکول قائم کئے ۱۹۰۱ء میں بخارا کے مدرسے کے ایک سابق طالب علم منور قاری نے پہلا ازبیک مکتب ان تاتاری اسکولوں کی طرز پر قائم کیا، دو سال بعد محمود بہبودی نے دوسرا مکتب سمرقند میں قائم کیا۔ بہبودی نے جو ایک قابل ماہر تعلیم اور پرجوش صحافی تھے تعلیمی اصلاحات کی مہم کا بیڑا اٹھایا، ساتھ ہی انہوں نے مسلم علما کو تنگ نظری اور اسلامی عقائد و نظریات کو مسخ کرنے کا ملزم قرار دیا۔

انقلاب ۱۹۰۵ء کے بعد جس میں وسطی ایشیا کے مسلمانوں نے بہت معمولی حصہ لیا منور قاری، خواجہ بہبودی اور دوسرے آزاد خیال شائقین کی کوششیں بارآور ہونے لگیں۔ ۱۹۰۵ء کے دستور کی رُو سے روسی دوما میں وسطی ایشیا کو بھی نمائندگی

دی گئی۔ ۱۹۰۶ء کے انتخابات اُزبیک اور تاجک سیاسی نشو ونما میں بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ اس حقیقت کے باوجود کہ دوما میں الّا تاشقند کے نمائندے کے تمام مسلمان نمائندے قدامت پسند تھے، حریت پسندوں کی تحریک کو، جس کو وسطی ایشیا کے تمام تاتاریوں کی حمایت حاصل تھی، اس جمہوری تجربے سے بہت مدد ملی۔ تاتاریوں نے تاشقند اور سمرقند میں پہلے سیاسی جلسے منعقد کئے جن میں عرضداشتیں تیار کی گئیں۔ ان عرضداشتوں میں مسلم انتظامیہ میں اصلاحات میونسپل بورڈوں میں مقامی باشندوں کی زیادہ نمائندگی اور زراعتی زمینوں پر روسی نوآبادکاری کو روکنے کے مطالبات کئے گئے۔ ان جلسوں میں مسلمانوں کے بارسوخ افراد نے جن میں تاجر، علما اور سرکاری ملازم شامل تھے شرکت کی تاشقند جو کہ وسطی ایشیا کا ثقافتی اور انتظامی مرکز تھا حریت پسندوں کی تحریک کا اڈا بن گیا۔

روس میں انقلابی سرگرمیوں کی کامیابی دیکھ کر وسطی ایشیا میں آزاد خیال نظریات کے محرکین نے منور قاری، احمد جان، اسمٰعیل عابد مخدوم، عبداللہ اولانی اور عبید اللہ خواجہ کے زیر قیادت تمام شہروں میں اپنی تحریک کو پھیلانا شروع کردیا "جدید" نے تاشقند میں کئی ایک رسالے شائع کرنے شروع کئے جن میں "خورشید"، "شہرت"، "ایشیا" اور "صدائے ترکستان" قابل ذکر ہیں۔ اُزبیکوں میں آزاد خیالی کی تبلیغ کے لئے تاشقند کے تاتاریوں نے ایک اخبار "ترقی" شائع کیا۔ بخارا سے قربت کی وجہ سے سمرقند "جدید" تحریک کا دوسرا بڑا مرکز بن گیا۔ یہاں خواجہ بہبودی اور ان کے رفقائے کار نے اخبارات "سمرقند" اور "آئینہ" شائع کئے۔ اس تحریک نے فرغانہ میں بھی قدم جمائے جہاں قیادت ناصر خان تورا کے ہاتھوں میں تھی۔ خوقند میں اس تحریک کے رہنما عابد جان محمود، عاشور علی ظاہری اور

سالی بولات تھے۔ انہوں نے "صدائے فرغانہ"، "آل بَیْرق (سُرخ پرچم) اور "یُرت (ملک)" اخبارات شائع کئے۔ یہ جدید مطبوعات ۱۹۰۵ء کے روسی دستور کے بعد نکلنے شروع ہوئے جس کی رو سے سنسر کی سختیوں کو بڑی حد تک کم کر دیا گیا تھا۔ ان میں سے بیشتر اخبار اور رسالے زیادہ دن نہ چل سکے۔ مگر پھر بھی انہوں نے اصلاحی خیالات کے پھیلانے میں بڑا نمایاں حصہ لیا۔

حریت پسند اور قومی نظریات کے پھیلانے میں ازبیک اشاعت گھروں میں تھیٹر نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ تاشقند اور خوقند کے ناشرین نے قومی ادبار اور شعرار کی تصانیف شائع کیں جن میں سولہویں صدی کے شاعر نوائی کے کلام کو بیحد مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان کے علاوہ سترہویں اٹھارہویں صدی کے مفکرین اور صوفیا کی تصانیف سے جن میں نوائی، مرزا بیدل اور صوفی اللہ یار قابل ذکر ہیں، جدید تحریک کے نظریات کو بڑی تقویت ملی۔ نوجوان ازبیک طبقے میں ان ادیبوں کی تصانیف کو مقامی مذہبی خیالات کی ترجمانی کا آئینہ سمجھا جانے لگا اور ان کی اتنی ہی عزت و توقیر ہوئی جتنی کہ عربی اور فارسی کے علمار کی۔ ازبیک تعلیمیافتہ طبقے میں صرف مقامی مطبوعات ہی مقبول نہیں تھیں بلکہ ایران اور ترکی سے بھی بڑی تعداد میں کتابیں درآمد کی گئیں جن سے مشرقِ وسطیٰ کے مسلم ممالک میں وقوع ہونے والے سیاسی اور نظریاتی انقلاب سے لوگ آگاہ ہوئے۔

۱۹۱۱ء میں تاتاری ڈرامائی گروپ "سیر" اور "نور" نے وسطی ایشیا کا دورہ کیا، اس قسم کے دورے آذر بیجانی گروہوں نے بھی منظم کئے۔ ان کے ذریعے مقامی لوگوں کو ترک اسٹیج کی ترقی سے شناسائی ہوئی اور بین الترک ثقافت اور زبان کے رشتوں میں مضبوطی ہوئی۔ "جدید" پریس نے ازبیک قومی اسٹیج کے قیام کی کوششوں کو بہت سراہا اور شروع کی چند مشکلات کے بعد ازبیک تھیٹر مقبول

ہونے لگا۔ بہبودی نے وسطی ایشیا کے عوام میں آزاد خیالی کو فروغ دیئے ازبیک دانشوروں کا گروہ بنانے کی جو اپیلیں کیں ان کا عوام میں بہت گرمجوشی سے استقبال ہوا

"جدید" تحریک کو مزید مستحکم بنانے کے لئے ۱۹۰۹ء میں ایک ثقافتی سوسائٹی "امداد" وجود میں آئی جس کے اغراض و مقاصد یہ تھے کہ آزاد پریس کو ترقی دیجائے اور آزاد خیالات کو پھیلایا جائے "امداد" نے جو کہ روسی حکام کی منظوری سے وجود میں آئی تھی وسطی ایشیا کے تمام شہروں میں ازبیگ، تاتار اور ترک ادب پر کتابیں مہیا اور فروخت کیں۔ ان کی کوششوں سے اصلاحی اسکولوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا۔ ۱۹۰۸ء میں پورے ترکستان میں ۹۲ "جدید" مکتب تھے جن میں سے ۳۵ تاشقند، سمرقند، خوقند اور راندیجان کے شہروں میں تھے۔ ۱۹۱۲ء میں صرف تاشقند میں ۱۲ اسکول تھے جن میں ایک ہزار طلبہ تعلیم پاتے تھے۔

تاشقند میں تاتار حریت پسند تحریک کے خطرات کو بہت پہلے ہی بھانپ لیا گیا تھا اور اسی لئے ۱۸۷۰ء میں جنرل کوف مین نے وسطی ایشیا کو تاتار مذہبی انتظامیہ کے زیر تحت کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ۱۸۸۶ء میں ایک قانون کی رو سے غیر عیسائی آباد کاروں کو وسطی ایشیا میں جائداد خریدنے کی ممانعت کر دی گئی۔ اس کا مقصد بھی تاتاری اثر و رسوخ کو محدود کرنا تھا۔ ۱۹۰۷ء میں تاتاری پروپیگنڈے کے خلاف مزید اقدام اٹھائے گئے اور بہت سے "جدید" مطبوعات کی اشاعت بند کر دی گئی اور سنسر کے قوانین میں سختی ہو گئی انتہا پسند تاتاری اخبار "ترقی" سترہویں اشاعت کے بعد بند کر دیا گیا۔ اس کے بعد حکام نے تعلیم کے صیغے میں تاتاری آباد کاروں کے اثرات کے خلاف اقدام اٹھائے اور جنوری ۱۹۱۱ء میں فرغانہ کے صوبے میں بہت سے اصلاحی مکتب جو تاتاریوں نے قائم کئے تھے

بند کر دیئے گئے ۔ اسی سال جون میں ایک قانون کے ذریعے یہ لازمی قرار دیا گیا کہ مسلم اسکولوں میں اساتذہ اسی قومی گروہ سے متعلق ہوں جن کے طلبہ ہوں ۔ اس قانون کا مقصد یہ تھا کہ ازبیک، قزاق اور تاجک طلبہ کو تاتاریوں کی اتالیقی سے نکال لیا جائے ۔ حکومت روس نے وسطی ایشیا کے حکام اور ماہرین تعلیم کی توجہ ترکی، ایران یا دوسرے خطوں سے آنے والے ایسے نئے باشندوں کی طرف دلائی جو انقلابی نظریات کے حامل ہوں ۔ ان اقدامات سے نئے اصلاحی مکتبوں کی ترقی میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوئی بلکہ تاتاریوں کی جگہ پر کرنے کے لئے ازبیک اور تاجک اساتذہ تیزی سے آنے لگے ۔ تاتاری اثر و رسوخ ختم کرنے کی کوشش کا ایک خلاف امید نتیجہ یہ نکلا کہ ازبیک اور تاجک اصلاحی اسکولوں کے ارتقار اور نشوونما میں سرعت پیدا ہوگئی ۔

"جدید" اثر کی روک تھام کے لئے حکومت روس نے قدامت پسند مسلمانوں اور علما کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کی ۔ روسی حکام نے ان قدامت پسند مسلمانوں کی ہر طرح سے مدد کی جو "جدید" تحریک سے متنفر تھے اور اس کی سرگرمیوں کو بغض و عناد کی نظروں سے دیکھتے تھے ۔ جب ۱۹۰۷ء میں تاتاری اخبار "ترقی" نے قدامت پسند علما اور اساتذہ پر نکتہ چینی کی تو "قدما" بہت ناراض ہوئے اور تاشقند میں علما کے ایک اجلاس میں "ترقی" کے اڈیٹروں اور حامیوں پر الحاد کا فتویٰ لگایا گیا ۔ ان وجوہات کی بنا پر یہ سمجھ میں آنے والی بات ہے کہ وسطی ایشیا کے مسلمانوں نے ۱۹۰۶ — ۱۹۰۵ء کی منعقد شدہ کل مسلم کانگریس اور "اتفاق" کی کارروائیوں میں کیوں کم حصہ لیا ۔ ۱۹۱۷ء کے انقلاب سے قبل شہری آبادیوں کی اکثریت اور کل دیہی آبادی کی نمائندگی "قدما" کے ہاتھوں میں تھی ۔ ترکستان کے تینوں صوبوں میں صرف چند سو اسکولوں اور تقریباً

۷ ر ۸ ہزار طلبا پر "جدید" کا اثر تھا۔ اس کے برعکس "قدما" کا اختیار ۶ ہزار سے زائد اسکولوں پر تھا جن میں ایک لاکھ سے زیادہ طلبہ تھے۔

بخارا اور خیوا کی خانیت میں جو روسی گورنر جنرل کے تحت نہیں تھیں اور جس میں روسی قوانین کا اطلاق نہیں ہوتا تھا "جدید" کے لئے صورتحال بہت ہی غیر سازگار تھی۔ "قدما" اور آزاد خیالوں میں نظریاتی جھگڑا یہاں بھی اسکولوں پر اقتدار حاصل کرنے کی صورت میں ظاہر ہوا۔ روسی صوبوں کے مقابلے میں یہ تصادم یہاں زیادہ شدید تھا خصوصاً بخارا میں۔ جہاں علما کا اثر بہت زیادہ تھا۔ بخارا کے حکمرانوں کو بھی "جدید" تحریک سے کوئی ہمدردی نہیں تھی لیکن خانیت میں روسی علاقوں کی آبادیوں میں "جدید" کو زرخیز علاقہ مل گیا — یہاں بخارا کی تنگ نظری سے محفوظ روسی حکام کی اعانت سے اصلاحی اسکول قائم ہوئے۔ ۱۹۰۲ء میں ان روسی آبادی کے تاتار بچوں کے لئے ایک تاتار استاد کریم نے پہلا اسکول قائم کیا۔ یہ اسکول چند ہی مہینوں کے بعد بند ہو گیا لیکن ۱۹۰۷ء میں دو اور تاتاریوں نے ایک نئے اسکول کی بنیاد ڈالی۔ مقامی آبادیوں میں یہ اسکول بہت کامیاب ہوا اور بخارا کے دارالحکومت میں بھی اس کے طریق تعلیم کا چرچا ہونے لگا۔

بخارا کے زیادہ تر علما "جدید" اسکولوں کو خلاف شریعت سمجھتے تھے اور اس لئے وہاں کے ایک ممتاز عالم مفتی اکرام الدین نے بہت ڈرتے ڈرتے اعلان کیا کہ "جدید" اسکول روح اسلامی کے منافی نہیں ہیں۔ اس کے بعد بخارا کے آزاد خیال متوسط طبقے اور اسمٰعیل بے کے دباؤ ڈالنے سے امیر بخارا نے ایک اسکول کھولنے کی اجازت دیدی۔ یہ اسکول اکتوبر ۱۹۰۸ء میں کھلا اور اس میں ذریعہ تعلیم فارسی تھی جو اُس وقت حکومت بخارا کی شستہ زبان تھی۔ سال کے آخر میں

جو امتحانات ہوئے وہ بر سر عام منعقد کئے گئے اور اس سے لوگوں کو اندازہ ہوا کہ روایاتی مکتبوں کے طلبا کے مقابلے میں اس اسکول کے طلبہ بہت قابل تھے اس ڈر سے کہ کہیں اس اسکول کی کامیابی سے مکتبوں پر برا اثر نہ پڑے بخارا کے علما نے امیر سے درخواست کی کہ یہ اسکول بند کر دیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی دارالحکومت میں مذہبی جنون کی لہر پھیل گئی اور جنوری ۱۹۱۰ء میں خونریز شیعہ سنی فسادات ہوئے جن کو روکنے کے لئے امیر کو روسی افواج کی مدد لینی پڑی۔

نئے اسکول میں اہل بخارا کی دلچسپی بڑھتی ہی گئی۔ ثقافتی لحاظ کے علاوہ اس اسکول سے بہت سے تجارتی فائدے بھی حاصل تھے، اس لئے بخارا کے تاجروں نے امیر اپنے اثر ورسوخ کو استعمال کرتے ہوئے اس کی بحالی کے لئے اصرار کیا۔ اصلاحی اسکول کے نصاب میں روسی اور اُزبیگ زبان کے علاوہ حساب اور جغرافیہ کی تعلیم بھی شامل تھی۔ ان مضامین کا حصول روس اور دوسرے ممالک سے تجارت کے لئے بہت کارآمد تھا اور ان میں سے کوئی بھی مضمون مکتبوں میں نہیں پڑھایا جاتا تھا چنانچہ متوسط طبقے کے زیر اثر اور روسی مداخلت کے ڈر سے امیر نے ۱۹۱۲ء میں اصول جدید۔ اسکول قائم کرنے کی اجازت دیدی۔

۱۹۱۳ء میں ایسے دس اسکول قائم ہو چکے تھے۔ دوسرے شہروں میں بھی جدید اسکول قائم ہونے لگے اور ظاہرا یہ نظر آتا تھا کہ "جدید" نے علماء پر فتح پالی ہے لیکن رواداری کا یہ دور بہت مختصر ثابت ہوا۔

امیر بخارا اور علما نے اس مسئلے میں روسیوں اور مسلمانوں کے سیاسی دباؤ کے ڈر سے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ بخارا کے شخصی نظام حکومت سے

روس کے ترقی پسند حلقوں میں بہت غصہ اور بداطمینانی تھی اور ۱۹۱۰ء میں روس میں بے شمار ایسی کتابیں شائع ہوئیں جن میں بخارا کے قدیم نظام حکومت اور کسانوں کی ناگفتہ بہ حالت پر سخت نکتہ چینیاں کی گئیں۔ ان میں سے ایک کتاب میں جو مشہور جغرافیہ داں کرنل لوگوفیت (COL. D. N. LOGOFET) نے لکھی دوما سے روسی مداخلت کی درخواست کی گئی۔ درحقیقت بخارا کا نظام حکومت ازبیک سرداروں، قدامت پسند علما اور مفت میں کام کرنے والے سرکاری ملازمین پر مشتمل تھا جس میں ازبیک فتوحات کے زمانے سے کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوا تھا۔[۱] یورپی روس کے مسلمان اور تاتار بھی اس صورت حال سے سخت نالاں تھے اور انہوں نے بھی روسی مداخلت کی حمایت کی۔ اسمٰعیل بے نے "ترجمان" میں لکھا کہ

> "اگر تاشقند اور پیٹرزبرگ سنجیدگی سے کوشش کریں تو بخارا کو بہت بہتر، منظم اور تہذیب یافتہ ملک بنایا جاسکتا ہے۔"[۲]

ایک اور تاتار صدری مقصودی نے جو دوما میں مسلم گروہ کے قائد تھے اپنے ۱۹۱۰ء کے دورۂ وسطی ایشیا کے بعد کہا کہ روسی وسطی ایشیا کے صوبوں کے مقابلے میں بخارا میں حالات ناقابل برداشت ہیں۔[۳]

---

[۱] SCHUYLER: "TURKISTAN."

[۲] "ترجمان" مورخہ جون ۱۹۰۹ء

[۳] " " "

۱۹۱۰ء میں امیر عبدالاحد کی وفات کے بعد ترکستان کے گورنر جنرل نے حکومت روس کو بخارا کے الحاق کا مشورہ دیا لیکن حکومت زار نے برطانوی ردعمل کی وجہ سے یہ قدم اٹھانا مناسب نہیں سمجھا۔ نئے امیر کو روسی حکومت کی نیت کا پورا پورا علم تھا اس لئے انہوں نے مزید دشمنی مول نہ لینے کی خاطر نہ تو "جدید" کے خلاف سختی سے کام لیا اور نہ نئے اسکول قائم کرنے کی مخالفت کی۔ ان کی یہ خاموشی جبری تھی اور زیادہ عرصے تک قائم نہ رہ سکی اور جوں ہی حکومت روس کی نظر ہٹی انہوں نے علما سے مل کر حریت پسندوں کے خلاف تادیبی کارروائیاں شروع کر دیں۔

۱۹۱۴ء میں روس کی مغربی سرحدوں پر سیاسی حالات میں کھنچاؤ پیدا ہو گیا۔ امیر بخارا نے اس موقع کا پورا فائدہ اٹھا کر حریت پسندوں سے وہ تمام مراعات واپس لے لیں جو ان کو دو سال قبل ملی تھیں اور علماء کے اس مطالبے کو منظور کر لیا کہ "جدید" اسکول بند کر دیئے جائیں — جولائی ۱۹۱۴ء میں امیر نے اصول جدید کے تمام اسکولوں کو بند کرنے کا اعلان کر دیا، بہت سے اساتذہ مشرقی بخارا میں جلاوطن کر دیئے گئے اور کچھ روس فرار ہو گئے[1]۔ چونکہ نئے نظریات اور نئی تعلیم اوپری طبقے تک پہنچ چکی تھی اس لئے اصول جدید کی تعلیم پر مکمل پابندیاں عائد نہ ہو سکیں دولت مند خاندانوں کے بچوں کی تعلیم نجی طور پر "جدید" اتالیقوں کے ذریعے جاری رہی اور اس طرح آزاد خیالی کی روش پروان چڑھتی رہی۔

روسی وسطی ایشیا کے دوسرے صوبوں کی طرح بخارا میں بھی تعلیمی اصلاحات کا مطالبہ آزاد خیال تحریک کا کم سے کم سیاسی مطالبہ تھا اور چنانچہ اس کے فوراً ہی بعد سیاسی سرگرمیاں تیز ہو گئیں۔

---

[1] ان میں عینی بھی شامل تھے جو بعد میں تاجک سائنس اکیڈمی کے صدر ہوئے۔

ان سیاسی تحریکوں میں بخارا کے رئیس خاندان بھی، مثلاً قاسم اور فیض اللہ خواجہ کا خاندان، جو بعد میں بالشویک طرفدار بن گئے اور بخارا کی عوامی جمہوریہ کے منتظم بنے، برابر کے شریک تھے۔ مدرسوں کے بے چین طلبا نے اس تحریک کے لئے مبلغ مہیا کئے اس تحریک کے بہت سے رہنما مثلاً خواجہ بہبودی، عینی، منور قاری، ناصر خاں تورا اور عبدالرؤف فطرت بذات خود مدرسوں کے پڑھے ہوئے تھے جہاں علم مناظرہ کی تربیت نے ان کو منطق اور نظریات کے لئے بدرجہ اتم تیار کر دیا تھا۔

اس نظریاتی گروہ کے تسلیم شدہ قائد فطرت تھے جن کو بخارا کی تعلیم مکمل ہو جانے پر "جدید" امرا نے مزید تعلیم کے لئے قسطنطنیہ بھیجا تھا۔ عثمانی دارالخلافے میں فطرت کا "نوجوان ترکوں" سے رابطہ پیدا ہو گیا اور ان کا پہلا رسالہ "مناظرہ" بخارا کی جدید تحریک کا منشور بن گیا۔ اس رسالے میں فطرت نے اپنے سابق استادوں پر عالم اسلامی کو ثقافتی اور صنعتی و حرفتی ترقی سے الگ رکھنے کا الزام لگایا اور اسلام کے روحانی انحطاط کا مورد الزام گردانا۔ انہوں نے لکھا کہ

> "ذرا سوچو تم نے ہمارے مذہب پر کیسی ضرب لگائی ہے، تمہارے قانون محمدی کو صحیح طور پر نہ سمجھنے کی وجہ سے ہم پر کیا مصیبت آئی ہے۔ بیشک مسلمانوں کی عظمت کا زوال تمہارے ہاتھوں ہوا ہے۔ تمہاری وجہ سے عنقریب اسلام کی تباہی آنے والی ہے۔ تم نے ترقی کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کیں اور مسلمانوں پر جہالت کا پردہ ڈال دیا۔"

فطرت نے علما اور مدرسین کو اسلام کی کمزور فوجی طاقت کا ذمے دار ٹھہرایا،

انہوں نے ان پر الزام لگایا کہ

"تم نے ہمارے ملک کے اسلحہ جات کو تیر و تلوار تک محدود رکھا اور توپ، بندوق، بارود اور دوسرا اسلحہ بنانے سے منع کیا۔ تم نے مسلمان قوم کو شیعہ، سنی، زیدی اور وہابی فرقوں میں منقسم کر کے ایک دوسرے کا دشمن جان بنا دیا تم نے اپنے شرمناک ارادوں کی تکمیل کے لئے قرآن کی ہدایتوں کو بھلا دیا"[1]

ایک اور رسالے میں فطرت نے نہ صرف بخارا کے علما پر بلکہ امیر کی ذات پر بھی نکتہ چینی کی۔

آزاد خیالی کے فروغ اور امیر کی شخصی حکومت کے خلاف تحریک کے علاوہ خواجہ بہبودی اور فطرت کے کاموں میں روسیوں کی مخالفت اور اتحاد اسلامی کی حمایت بھی ملتی ہے۔

یوروپین طاقتوں کے ہاتھ مسلمان ممالک کی تسخیر پر فطرت مستقل نوحہ گر تھے اور وہ بخارا کے نظم و نسق سے اس بات کے لئے سخت نالاں تھے کہ وہ وسطی ایشیا میں عیسائیت کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے سے قاصر تھا۔ انہوں نے لوگوں کو یاد دلایا کہ رسولؐ نے جہاد کو فرض قرار دیا تھا اور انہوں نے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا کہ آزاد خیالی کے فروغ سے "ہم اس بات کے لئے تیار ہو سکیں گے کہ اسلام کی حفاظت کے لئے اسلحہ اور گولہ بارود بنا سکیں اور اپنے وطن عزیز کو ناپاک ہاتھوں سے آزاد

---

[1] فطرت "مناظرہ"

کراسکین[1]:

حالانکہ فطرت اور دوسرے نوجوان بخاریوں کی طرح "جدید" نے اس بات کی تلقین کی کہ بچوں کو تعلیم کے لئے قسطنطنیہ بھیجا جائے لیکن انقلاب سے قبل وسطی ایشیا کے "جدید" کا لائحہ عمل اتحاد اقوام ترک کے بجائے اتحاد اسلامی تھا۔ فطرت کے لئے ان کا آبائی وطن بخارا ایک مقدس سرزمین تھی۔ اور اس کے باہر وہ تمام عالم اسلام کی عزت کرتے تھے۔ اپنی اپیلوں میں انہوں نے "اپنے ہم وطنوں اور دینی بھائیوں" کو مخاطب کیا ہے۔ نوجوان بخاریوں کے لئے مذہب اسلام اور اسلامی تہذیب وتمدن اور وسط ایشیا کی علاقائی ثقافت اتحاد اقوام ترک پر مقدم تھی[2]

فطرت کی سرگرمیوں کی وجہ سے بخارا میں "جدید" سیاسی کارروائیوں کی رفتار تیز ہوگئی۔ امیر سید عالم خاں (۱۹۲۰ – ۱۹۱۰ء) نے تخت نشینی پر اعلان کیا تھا کہ وہ نظم ونسق کی اصلاح کریں گے رشوت خوری کو بند کریں گے ٹیکسوں کے نظام کو سدھاریں گے اور مدرسوں کی حالت بہتر بنائیں گے۔ لیکن انہوں نے اپنا کوئی بھی وعدہ پورا نہیں کیا۔ چنانچہ تنگ آکر "جدید" نے ایک خفیہ حزب اختلاف کی بنیاد ڈالی[3] اس جماعت نے ناخواندگی جہالت اور علما و قاضی کی ناانصافیوں کے خلاف جد وجہد شروع کی اور تہیہ کیا کہ مظلومین کی ہر ممکن اعانت کی جائے۔ انہوں نے امیر کی پالیسیوں کے

---

[1] فطرت "مناظرہ"

[2] " "

[3] یہ جماعت ۱۹۰۹ء میں قائم کی گئی۔

خلاف احتجاج کئے اور امیر کے اخراجات کم کرنے کا مطالبہ کیا۔ اس جماعت نے اخلاقی احیا کی ضرورت کی طرف اشارہ کیا اور توہم پرستی، تعصب اور تنگ نظری کے خلاف جد وجہد کا بیڑا اٹھایا "جدید" کے اس لائحہ عمل کو سب ہی نے سراہا۔

یہ خفیہ جماعت اپنے دولت مند حامیوں سے پیسے جمع کر کے بخاری طلبا کو قسطنطنیہ بھیجتی تھی جہاں بخارا کے سیاسی تارکین وطن نے متوازی جماعت قائم کی۔ قسطنطنیہ میں بخاریوں کا "نوجوان ترکوں" سے قریبی رابطہ پیدا ہوا اور انہوں نے اس تحریک کے کامیاب انقلاب اور حصول اقتدار کو اپنی آنکھوں سے دیکھا چنانچہ بخاری حریت پسندوں نے بھی ان کی نقل میں اپنا نام "جوانان بخارا" رکھ لیا۔

"نوجوان ترک" کے سیاسی اور نظریاتی لائحہ عمل کے زیر اثر "جوانان بخارا" نے وسطی ایشیا میں سیاسی ادب اور مواد تقسیم کرنے کا تہیہ کیا۔ مارچ ۱۹۱۲ء میں روسی علاقے کی آبادیوں میں "بخارائے شریف" نام کا تاجک اخبار پہلی دفعہ شائع ہوا۔ اس کے فوراً ہی بعد ازبکی زبان میں "توران" شائع ہوا۔ یہ دونوں اخبار روسی سفارتی ایجنٹ کی اجازت سے جس کو ان اخباروں کا "جدید" تحریک سے تعلق نہیں معلوم تھا، شائع ہوئے ان کے اڈیٹر مرزا محی الدین اور مرزا حکیم تھے۔ امیر بخارا کے اصرار پر یہ اخبار جلد ہی بند کر دیئے گئے۔

۱۹۱۲-۱۹۱۳ء میں دو تنظیمیں "معرفت" اور "برکت" کے نام سے قائم ہوئیں جن کا ظاہرا کاروبار تجارت اور کتابوں اور رسالوں کی درآمد تھا مگر حقیقت میں پس پردہ یہ خانیت میں آزاد خیال نظریات کا پروپیگنڈا

کرتی تھیں۔

۱۹۱۴ء میں امیر کے جس اعلانیہ کے تحت اصلاحی اسکول بند کر دیئے گئے اس کا مقصد آزاد خیال تحریک کو بھی کچلنا تھا۔ یہ قدم "جوانان بخارا" کے خلاف تھا جن کی سیاسی سرگرمیاں خفیہ تھیں اور کھلے بندوں نجی اجتماع کیا کرتے تھے۔ ان اجتماع پر پابندی لگانے سے خفیہ سرگرمیاں اور بڑھ گئیں اور جلاوطنی کے باوجود "جوانان بخارا" کی سرگرمیاں اور شورشیں تیز تر ہوتی گئیں۔ پہلی جنگِ عظیم کے اوائل میں بہت سے بخاری طلبار اور تارکین وطن قسطنطنیہ سے تاشقند واپس آگئے جو بخارا کی حکومت کے خلاف جدوجہد میں ان کا اڈا بن گیا۔ ان واپس آنے والے تارکین وطن میں فطرت بھی شامل تھے۔

دوسری باجگذار خانیت خیوا میں "جدید" تحریک نے اس صدی کے اوائل میں قدم جمائے۔ حریت پسندوں کو یہاں دو زود اثر حمایتی مل گئے جو خان کے مقرب خاص تھے۔ یہ اسلام خوجہ اور حسین بیگ تھے حسین بیگ نے خیوا کے شہر میں اصلاحی مدرسہ قائم کیا۔ ۱۹۰۸ء میں خیوا میں (چار) "جدید" مکتب تھے جن میں تاتاری اساتذہ تعلیم دیتے تھے۔ چونکہ اہل خیوا کو تعلیمی مسائل سے چنداں دلچسپی نہ تھی اس لئے یہ مکتب جلد ہی ناکام ہو گئے۔ خیوا کے سیاسی منظر پر ازبیک اور ترکمان رقابت نمایاں تھی۔ ۱۹۱۲ء میں روسی افواج کی مدد سے خیوا کو ان ترکمان لٹیروں کی غارت گری سے بچایا جا سکا جو خان خیوا کا تختہ الٹنا چاہتے تھے۔

الغرض پہلی جنگِ عظیم سے قبل اور ۱۹۱۷ء کے انقلاب روس تک وسطی ایشیا کے قلب و ذہن پر اسلام کا غلبہ طاری تھا۔ ازبیکوں اور تاجکوں کو روسی ثقافت میں رنگنے کے لئے حکومت زار نے وقتاً فوقتاً جو کوششیں

گیں وہ سب کی سب ناکام ثابت ہوئیں اور "قدما" نے حریت پسند قومی تحریک کا خاتمہ کر دیا۔ "جدید" کی اولین کامیابیاں صرف ان ہی علاقوں میں محدود تھیں جو روسی نظام کے تحت تھے اور تاتاری مدد کے مرہونِ منت تھے۔ جہاں کہیں بھی ترقی پسند قومی تحریک اور قدامت پسندوں کا علانیہ تصادم ہوا۔ اول الذکر کو زک اٹھانی پڑی۔ علاوہ ازیں وسطی ایشیا میں ابھرتی ہوئی ترک قومیت اسلام کے احیاء اور ارتقاء کی امیدوں تلے دبکے رہ گئی۔

آذربیجان

انیسویں صدی کے دوران روسی آذربیجان میں سیاسی اور ثقافتی نشوونما کی سب سے امتیازی خصوصیت ایرانی اقتدار کا انحطاط تھا۔ ہم پہلے ہی دیکھ چکے ہیں کہ تہذیب و تمدن کو ایرانی اثرات سے پاک کرنے کی جو تحریک قسطنطنیہ میں شروع ہوئی تھی وہ ترکی اور اس کے باہر ترک قومیت کے ارتقار کا اہم جزو تھی۔ روس کے ترک خطوں میں، یہ تحریک آذربیجان کے لئے خصوصی اہمیت رکھتی تھی جہاں ایرانی اثر بہت گہرا اور زود اثر تھا۔

مشرقی ماورائے قفقاسیہ کا یہ چھوٹا سا ملک، جو بحیرۂ کسپین اور آرمینیا کے میدانوں کے درمیان واقع تھا اور دریائے اراس (ARAKS) اس کے اور ایران کے درمیان سرحد بناتی ہے، ہزارہا سال سے ایرانی تہذیب و تمدن کا گہوارہ تھا حالانکہ یہاں کے باشندے ایرانی نژاد نہیں تھے۔ چھٹی صدی قبل مسیح میں موجودہ آذربیجان کا علاقہ سلطنت ایران کا حصہ بن گیا اور اس وقت سے ایرانی تہذیب اور زبان کا غلبہ قائم ہوگیا تھا۔ بعد کی دوسری فتوحات اور تبدیلی آبادی کے باوجود پندرہ سو سال تک آذربیجان کا ایرانی رنگ نہیں اترنے پایا۔ ساتویں صدی میں اس کا الحاق

اسلامی سلطنت میں ہوگیا اور آٹھویں صدی سے تُرک خانہ بدوش آنے شروع ہوگئے مگر اس کے بعد یہاں کے نسلی نقشے میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی[1] ۹۵۰ء میں ایک عرب سیاح نے لکھا کہ "آذربیجان کی تمام تر آبادی فارسی بولتی ہے، صرف تاجر عربی بولتے ہیں۔"

یہ صورت حال ۱۰۵۴ء میں جبکہ سلجوقی ترکوں نے آذربیجان کو فتح کیا بدل گئی۔ سلجوقی سلطان طغرل بیگ نے ایران، شام، عراق، آذربیجان اور ترکی کو اپنی سلطنت میں شامل کرلیا اور اس مضبوط سلطنت کی بنیاد ڈالی، جو عثمانی سلاطین کے تحت دنیا کی بڑی طاقت بن گئی۔ سلجوقیوں کے آنے سے ترک خانہ بدوشوں کو بڑی تقویت پہنچی اور انہوں نے آذربیجانی عوام کو اپنے رنگ میں رنگنا شروع کیا۔ یہ سلسلہ ۴۰۰ سال تک چلتا رہا اور آہستہ آہستہ ایرانی بولنے والوں کی تعداد کم ہوتی گئی۔ مثال کے طور پر ۱۹۲۶ء میں آذربیجان کی کُل آبادی میں ۶۲ فی صدی ترک تھے اور صرف ۵ فی صدی فارسی یا اس سے ملتی جلتی زبان بولتے تھے۔

آذربیجان کی اس "ترکیت" کے باوجود جو سولھویں صدی میں شروع ہوئی ایرانیوں نے مشرقی ماورائے قفقاسیہ کے باشندوں پر اپنا ثقافتی غلبہ رکھنے کی متعدد کوششیں کیں۔ ۱۵۰۱ء میں ایران اور آذربیجان پر صفوی خاندان کا اقتدار قائم ہوگیا، یہ لوگ شیعہ تھے اور انہوں نے آذربیجان کے کٹّر سنیوں کو نیست و نابود کرنے کی کوشش کی۔ شاہ عباس اول کے دورِ حکومت (۱۵۸۷—۱۶۲۸) میں سنّیوں کے خلاف جد و جہد بہت سنگین صورت

---

[1] VERNADSKY: "A HISTORY OF RUSSIA" (NEW HAVEN 1946)

اختیار کر گئی۔ ترک قبائل کے سنی سردار یا تو جلا وطن یا ہلاک کر دیئے گئے اور ہزاروں سُنی آذربیجانی ترک یا تو مار ڈالے گئے یا بالجبر شیعہ بنا لئے گئے۔ اٹھارویں صدی کے آخر میں نظم و نسق اور تعلیم میں پھر فارسی مستعمل ہونے لگی اور تمام تر امرار اور تاجر شیعہ ہو گئے اور فارسی بولنے لگے۔ البتہ مغربی آذربیجان میں جہاں ترک خانہ بدوشوں کی بھاری اکثریت آباد تھی سنی عقائد باقی رہے۔ ۱۹۱۶ء تک آذربیجان کی ۶۰ فیصدی مسلمان آبادی شیعہ ہو چکی تھی۔

۱۸۰۴ء میں افواج زار نے بحیرۂ کیسپین اور آرمینیا کے درمیانی علاقوں کو تسخیر کرنا شروع کیا۔ ۱۸۰۵ء میں باکو فتح ہو گیا اور ۱۸۱۳ء کے "معاہدۂ گلستان" کی رُو سے موجودہ آذربیجان کا بڑا علاقہ سلطنت روس کا حصّہ بن گیا۔

مغربی آذربیجان ۱۸۸۶ء میں تسخیر ہوا اور ۱۸۲۸ء کے "معاہدۂ ترکمان چائے[1]" کی رو سے سلطنت روس میں شامل کر لیا گیا۔ روسی فتوحات کے باوجود ۱۸۴۰ء تک یہاں کی سرکاری زبان فارسی رہی۔ مقامی حکام یا تو خود ایرانی تھے یا مقامی امرار کے طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور فارسی بولتے تھے چنانچہ ۱۸۷۰ء تک عدالتی کارروائیوں میں فارسی استعمال ہوتی رہی۔ ایرانی اثر و رسوخ کے پھیلانے میں شیعہ علمار کا جن کے تحت اسکول اور عدالتیں تھیں بڑا ہاتھ تھا۔ امیر طبقے اور شعر و ادب کی زبان بھی فارسی تھی۔

۱۸۶۰ء — ۱۸۷۰ء کے دوران ایرانی اثر زوال پذیر ہونے لگا اور ترکی زبانوں میں دلچسپی بڑھنے لگی۔ ۱۸۵۹ء میں آذربیجانی طنز نگار فتح علی اخوند زادہ

---

[1] ترکی زبان میں "چائے" بمعنی نالہ، ندی۔

نے متعدد طربیہ آذربیجانی ترکی زبان میں شائع کئے[1]۔ اخوندزادہ نے شیعہ علماء کے تعصب اور تنگ نظری کے خلاف مہم چلائی۔ انہوں نے آذربیجانی عوام کو روسی اور مغربی یوروپ کا تمدن سیکھنے کی تلقین کی اور مشورہ دیا کہ عربی حروف تہجی کے بجائے لاطینی حروف رائج کئے جائیں۔ قومی تھیٹر کے قیام کے بعد اخوندزادہ کی تمثیلوں کے ذریعے ان کی روشن خیالی اور علماء دشمنی کو بڑی شہرت ہوئی۔

آذربیجانی ترک زبان میں پہلے اخبار کی اشاعت بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ ۱۸۷۵ء میں حسن ملک زر بدی نے جو باکو کے روسی اسکول میں استاد تھے اور جنہوں نے اخوندزادہ کی تمثیلوں کو اسکولوں میں پیش کرنے میں نمایاں حصہ لیا، " اکنچی " (دہقان) کے نام سے ایک اخبار شائع کیا۔ حالانکہ یہ اخبار صرف دو سال چلا مگر پھر بھی اس نے ادبی روایات کے قائم کرنے میں بڑا نمایاں کردار ادا کیا۔ اپنے اخبار میں ملک زر بدی نے شیعہ علماء پر سخت نکتہ چینی کی اور ان کی ایران دشمنی اس حد تک بڑھ گئی کہ مقامی امراء اور علماء ان کے سخت خلاف ہو گئے۔ فارسی بولنے والے امراء اور رؤسا نے ان کے اخبار کی "دہقانی زبان" کی شدید مذمت کی۔

۱۸۷۰ء۔ ۱۸۸۳ء کے دوران میں سلطنت کا یہ دور دراز علاقہ اچانک عالمی اقتصادیات کا اہم جز بن گیا۔ تیل کی دریافت نے باکو کو ایک بین الاقوامی صنعتی مرکز بنا دیا۔ ۱۸۸۳ء میں باکو۔ باطوم ریلوے لائن بننے

---

[1] اخوندزادہ نے ترکی ادب کے احیاء میں نمایاں حصہ لیا۔ ان کے ڈراموں کے انگریزی اور فارسی میں بھی ترجمے ہوئے ہیں۔

کے بعد آذربیجان کا روس اور مغربی یورپ کی منڈیوں سے براہ راست رابطہ ہوگیا، قسطنطنیہ کا راستہ بھی کھل گیا اور اس کی وجہ سے ترک اثر کو مزید تقویت پہنچی باکو کی صنعتی ترقی کی وجہ سے مختلف قومی گروہوں کے تعلقات میں پیچیدگی آگئی اور اس سے بھی ترک قومیت کو عروج ہوا۔ آرمینیائی اور روسی مزدور تیل کے نئے مرکزوں میں جوق درجوق آنے لگے اور بیرونی تاجروں اور سرمایہ داروں نے باکو کے تیل کی صنعت کی اجارہ داری حاصل کرلی۔ باکو ایک خموش اور پرسکون شہر سے شور وشغب کا اقتصادی مرکز بن گیا۔ مشرقی ماورائے قفقاسیہ دو حصوں میں تقسیم ہوگیا، ایک علاقہ باکو کے اطراف میں مختلف النوع اقوام پر مبنی صنعتی مرکز بن گیا اور دوسرا ترک زراعتی علاقہ تھا جہاں جاگیردارانہ نظام باقی رہا۔

اس صدی کے شروع میں آذربیجانی امرا اور تاجروں کے طبقے سے مقامی دانشور نکلنے شروع ہوئے۔ ان دانشوروں اور اہل الرائے نے شروع ہی سے اپنے اتحاد اسلامی اور ترک قومیت کے نظریات کا اظہار کرنا شروع کردیا۔ اسمٰعیل بے کے اخبار "ترجمان" نے آذربیجانیوں کے ان جذبات، کو کہ وہ عالم اسلامی اور ترک ملت کے فرد ہیں خوابیدہ کرنا شروع کردیا تھا۔ باکو کے بین الاقوامی ماحول اور اطراف کے ترک دیہاتوں کے نمایاں فرق، صنعت و تجارت میں بیرونی اور آرمینیائی سرمائے کی فراوانی اور ترکی میں ارمینیوں کے خلاف فسادات، ان سب نے مل جل کر آذربیجان کے دانشوروں میں روس دشمنی اور آرمینیا کے خلاف جذبات کو بڑی ہوا دی۔ ایرانی ثقافتی غلبہ اور شیعہ عقائد کے اثرات کے خلاف جن کی وجہ سے آذربیجان سنی ترکی سے علیحدہ تھا معاندانہ جذبات تیزی سے بھڑک اٹھے۔ ۱۹۰۶ء میں قائم شدہ طنزیہ

رسالہ "ملا نصرالدین" نے اخوندزادہ کی ایران اور شیعہ دشمنی کی روایات کو ازسرنو تازہ کردیا۔

آذربیجان میں آزاد خیال نظریات اور ترک قومیت کے اولین مبلغ حسین زادہ علی بے تھے۔ یہ ایک سرگرم سیاسی رہنما تھے جنہوں نے باکو اور پیٹرزبرگ میں تعلیم پائی تھی۔ ۱۸۸۹ء میں یہ ترکی گئے جہاں "نوجوان ترکوں" سے ان کا قریبی رابطہ قائم ہوگیا۔ انہوں نے وہاں ترکی کی سیاسی زندگی میں سرگرمی سے حصہ لیا اور جب ۱۹۰۵ء میں روس میں حریت پسندی کو آزادی ملی تو وہ باکو واپس آگئے جہاں سے انہوں نے ایک مقبول ہفتہ وار رسالہ "فیوضات" طبع کرنا شروع کیا جو قومیت اور آزاد خیالی کا حامل تھا۔ اس کے علاوہ بھی انہوں نے مختلف رسالوں میں مضامین لکھے۔

ان کے علاوہ ایک اور پُرجوش آذربیجانی احمد بے آغا اوغلو ۱۹۰۵ء میں روس سے ۱۵ سال کی غیرحاضری کے بعد باکو لوٹ آئے۔ حسین زادہ کی طرح انہوں نے بھی باکو اور پیٹرزبرگ میں تعلیم پائی تھی جہاں سے وہ مزید تعلیم کیلئے پیرس چلے گئے وہاں مشہور فرنچ تاریخ داں رینان اور مستشرقین جیمس ڈارمیسٹیٹر (JAMES DARMESTAETER) اور باربیر ڈی مینار (BARBIER DE MEYNAR) کے شاگرد رہے۔ رینان کے سیاسی اور قومی افکار کا جس کی تعلیم یہ تھی کہ

"ملت ایک قدرتی گروہ ہے جس کا تعین نسل سے ہوتا ہے"

ان کے نوجوان ذہن پر گہرا اثر پڑا اور وہ بالآخر نہ صرف ترک قبائل بلکہ تمام تورانی قبائل کے اتحاد کا پرچار کرنے لگے۔ پیرس میں آغا اوغلو نے ایران، ترکی اور اسلام پر مقالات لکھے جو چیدہ چیدہ رسائل میں شائع ہوئے انہوں نے "نوجوان ترکوں" کے پیرس کے مرکز میں بھی کام کیا۔ پیرس میں ان کی صلاحیتوں کی بڑی قدر ہوئی۔ اس

وقت تک ان کی مسئلہ اتحاد اقوام ترک سے دلچسپی اور روس دشمنی بالکل ظاہر نہیں ہوئی تھی۔ اپنے بیشتر ہمعصر حریت پسندوں کی طرح انہوں نے بھی مسلم اور خصوصاً شیعہ علماء پر سخت تنقید کی اور ان کو مسلمانان عالم کی غربت و افلاس کا موردِ الزام ٹھہرایا۔ باکو میں بھی ان کے جو مضامین شائع ہوئے ان میں بھی انہوں نے مسلم معاشرے کی اصلاح اور آزادی نسواں کی تلقین کی۔ انہوں نے علماء پر مذہب کو مسخ کرنے کا الزام لگایا اور اس کے خلاف سخت احتجاج کیا۔

تیسری اہم شخصیت علی مردان بے کی تھی جنہوں نے ۱۹۰۵ء میں "اتفاق" کی صدارت کے فرائض انجام دیئے تھے اور دوسری دوما میں مسلمان گروہ کے قائد تھے۔ علی مردان کا خیال تھا کہ یورپین تہذیب، مغربی سامراجیت اور جدید قومیت کے تصادم سے مسلمان جاگ اٹھیں گے اور بالآخر عالم اسلام متحد ہو جائیگا ۱۹۱۸ء ۔ ۱۹۲۰ میں آذربیجان کی مختصر آزادی کے دوران علی مردان نے سیاست میں بڑی سرگرمی اور جوش و خروش سے حصہ لیا اور آخر میں وہ جمہوریہ آذربیجان کے صدر ہوئے۔

روس کے ترک علاقوں میں سب سے پہلے آذربیجان میں آزادی نسواں کی تحریک شروع ہوئی۔ عورتوں کے رسالے "عشق" کی اڈیٹر خدیجہ خانم نے بڑے جوش و خروش سے مسلمان عورتوں کی آزادی کے لئے جد و جہد کی۔ "ملا نصر الدین" کے ناشر کی بیوی حامدہ خانم اور آذربیجان کے ہونے والے وزیر اعظم یوسف بے علی کی اہلیہ سعادت خانم نے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ مل کر اس مہم میں اخبارات

ملہ ۱۹۲۰ء میں آغا اوغلو اتاترک کے اخبار "حکمت ملی" کے مدیر ہو گئے۔ وہ ترکی کی قومی اسمبلی کے ممبر بھی منتخب ہوئے۔

اور سوشل کام کے ذریعے بڑی سرگرمی سے حصہ لیا۔ سوائے مذہبی جرائد کے آذربیجان کے تمام اخبارات نے آزادیٔ نسواں کی مکمل حمایت کی۔

بین اقوامی بغض و عناد اور معاشرتی بے چینی نے آذربیجان میں ۱۹۰۵ء ۱۹۰۷ء کے انقلابی سالوں میں ایک المناک صورت حال پیدا کر دی۔ ۱۹۰۰ء کے بعد باکو کے مزدوروں میں سوشل ڈیموکریٹ کا اثر قائم ہو گیا اور چند سالوں میں ان کا اثر و رسوخ اتنا بڑھ گیا کہ دسمبر ۱۹۰۴ء میں انہوں نے مکمل ہڑتال منظم کی۔ انقلابی سرگرمیوں کی تنظیم اور ہڑتال کی تحریک میں اسٹالین نے بذات خود شرکت کی۔ ۱۹۰۴ء میں سوشل ڈیموکریٹ نے باکو میں ایک مسلم جماعت "ہمت" قائم کی جس کی قیادت نریمان آفندی اور مشہدی عزیز بیگ کے ہاتھوں میں تھی۔ ۱۹۱۷ء کے انقلاب کے بعد عزیز بیگ باکو کے بالشوکوں کے قائد مقرر ہوئے اور انہوں نے ماورائے قفقاسیہ کو سوویٹ دائرۂ اقتدار میں لانے کے لئے اہم کردار ادا کیا۔

ان ہی سالوں میں باکو میں دہشت پسندانہ کارروائیوں، قتل و غارتگری فسادات اور مسلمانوں اور آرمینیائی باشندوں میں تصادم کا دور دورہ رہا اور مختلف گروہوں میں خاصی خونریزی ہوئی یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ آذربیجانی ترکوں کو انقلابی کارروائیوں سے بہت کم دلچسپی تھی اور تمام تر زمینداروں نے انقلابی کارروائیوں کی روک تھام کے لئے روسی حکام سے تعاون کیا۔ آزاد خیال قوم پرستوں نے کیڈٹ پارٹی سے قریبی رابطہ قائم رکھا۔

۱۹۰۶ء میں فلاح و بہبودی کی ایک سوسائٹی "نشر شریف" باکو میں قائم کی گئی اس کا مقصد خیرانہ سرگرمیاں اور تعلیم کو پھیلانا تھا۔ ملک زربدی،

متوسط طبقہ اور روشن خیال علما نے اس کی پوری پوری حمایت کی۔ سوسائٹی کی کوششوں سے کئی نئے اسکول قائم ہوئے۔ چند سالوں کے بعد تعلیمی ترقی میں دلچسپی کم ہوگئی اور ساتھ ہی سرمائے کی کمی کی وجہ سے "نشر شریف" کو اپنی سرگرمیاں محدود کرنی پڑیں لیکن اس سوسائٹی کے ذریعے آذربیجان کے آزاد خیال قوم پرست یکجا اکھٹے ہو گئے اور مستقبل میں اسی کے نمونے پر آذربیجان کی قومی پارٹی کی بنیاد پڑی۔

نژنی نووگراڈ اور پیٹرز برگ میں منعقد ہونے والی کل مسلم کانگریس اور "اتفاق" کے قیام میں آذربیجان حریت پسندوں نے بڑی سرگرمی سے حصہ لیا۔ علی مردان بے نے ان اجلاس میں اپنی قابلیت اور سیاسی سوجھ بوجھ سے سب کو بہت متاثر کیا۔ دوسری دوما کی برطرفی کے بعد آذربیجانی حریت پسندوں نے دوما کی سیاست سے کنارہ کشی کرلی اور کیڈٹ پارٹی سے جو تعلقات قائم ہوئے تھے ان میں ڈھیل ڈال دی حتیٰ کہ "اتفاق" کی طرف بھی بے اعتنائی برتنے لگے۔ اس کے بجائے انہوں نے مقامی سیاست پر توجہ دینی شروع کی اور قسطنطنیہ سے تعلقات کو دوبارہ استوار کیا۔ "نوجوان ترکوں" کے انقلاب کے بعد معاشرتی اور مذہبی مسائل بھول کر آذربیجانی دانشور اتحاد ترک کی تحریک میں غلطاں ہو گئے۔

انقلابی ہنگاموں کے بعد جب حکومت نے سیاسی کارروائیوں کا غور وخوض سے جائزہ لینا شروع کیا تو بہت سے سیاسی رہنما روس سے ترکی چلے گئے تاکہ "نوجوان ترکوں" کی کامیابیوں میں حصہ لے سکیں۔ ۱۹۰۸ء میں آغا اوغلو جن کی اتحاد اقوام ترک مطبوعات کی اشاعت پر پابندی لگا دی گئی تھی اور ۱۹۱۰ء میں حسین زادہ

قسطنطنیہ آگئے۔[1]

۱۹۱۱-۱۹۱۲ء میں چند دانشوروں نے محمد امین رسول زادہ کی قیادت میں بائیں بازو کی ایک خفیہ سیاسی جماعت "مساوات" کی بنیاد ڈالی۔ آغا اوغلو اور دوسرے حریت پسندوں کی طرح اولاً رسول زادہ بھی مسلم اتحاد کے حامیوں میں سے تھے۔ اسٹالن کے ساتھ مل کر "ہمت" کی بنیاد ڈالنے اور باکو میں حکومت کے خلاف مظاہروں میں حصہ لینے کے بعد وہ ایران فرار ہو گئے جہاں انہوں نے شاہ کی مطلق العنانی کے خلاف جد وجہد میں حصہ لیا۔ طہران میں وہ دو رسالوں "ایران عہد" اور "ایران نو" کے اڈیٹر مقرر ہوئے۔ ایرانی انقلاب کی ناکامی کے بعد وہ قسطنطنیہ چلے گئے جہاں انہوں نے اتحاد اقوام ترک کی تحریک میں شمولیت کی اور "نوجوان ترکوں" کے ساتھ جو اقتدار میں تھے تعاون کیا۔ رسول زادہ اتحاد اقوام ترک کے پرجوش حامی بن گئے اور ۱۹۱۰ء میں باکو واپس آکر مقامی سیاست میں نمایاں حصہ لینے لگے۔

اپنے نام اور سوشل ڈیموکریٹ سے تعلق کے باوجود "مساوات" ایک ترک قومیت اور اتحاد اسلامی کی علمبردار جماعت تھی۔ جماعت کے قیام پر اس کے منشور میں "مساوات" کی مرکزی کمیٹی نے کہا کہ

"کسی زمانے میں اسلام کا ایک متبرک بازو پیکنگ تک پھیلا ہوا تھا—— اور دوسرے نے یورپ کے دوسرے

---

[1] ۱۹۲۰ء میں آغا اوغلو نے اتاترک کے اخبار "حکمت ملی" کی ادارت سنبھالی اور اور قومی اسمبلی کے ممبر منتخب ہو گئے۔ حسین زادہ "نوجوان ترکوں" کی مرکزی کمیٹی کے ممبر چنے گئے۔

سرے پر الحمرا کے محلات تعمیر کئے۔"

انہوں نے نوحہ کیا کہ

"ایشیا، یوروپ اور افریقہ کے عظیم خطوں پر حکمرانی کے بعد اب اسلام کا شیرازہ بکھر گیا ہے۔"

لیکن اس کے باوجود "مساوات" کے رہنماؤں نے ہمت نہیں ہاری اور عوام کو دشمنوں کو پسپا کرنے کے لئے تیار رہنے کی تلقین کی۔

"مساوات" کا لائحہ عمل اتحاد مسلمین پر مبنی تھا اور اس کے خاص نکات حسب ذیل تھے۔

۱۔ بلاتفریق قومیت و عقائد کل مسلمانوں کا اتحاد۔

۲۔ مسلم ممالک کی آزادی کی بحالی۔

۳۔ ان اسلامی ممالک کو جو اپنی آزادی برقرار رکھنے کی جد وجہد میں مصروف ہیں ہر ممکن اخلاقی اور مادی امداد بہم پہنچائی جائے۔

۴۔ مسلم عوام کی دفاعی اور جارحانہ قوت کو فروغ دینے کے لئے امداد دی جائے۔

۵۔ ان تمام رکاوٹوں کو دور کیا جائے جو مذکورہ بالا نظریات کے فروغ میں رکاوٹ ڈالیں۔

۶۔ ان جماعتوں سے رابطہ قائم کیا جائے جو مسلمانوں کی ترقی اور اتحاد کے لئے کوشاں ہیں۔

۷۔ ان بیرونی جماعتوں سے تعلقات قائم کئے جائیں اور تبادلۂ خیالات کیا جائے جو نوع انسانی کی خوش حالی اور ترقی کے لئے کام کر رہی ہیں۔

۸۔ مسلمانوں کی بقا کے لئے جو کوششیں جاری ہیں ان کو ہر ممکن طریقے

سے مضبوط بنایا جائے اور مسلمانوں کی تجارتی، صنعتی اور اقتصادی زندگی کو فروغ دیا جائے[۵]

"مساوات" کا منشور اور لائحۂ عمل سیاسی، مذہبی اور معاشرتی نعروں کا گڈمڈ تھا۔ فیروز کاظم زادہ نے ماورائے قفقاسیہ کے انقلاب کے لاجواب تجزیئے میں لکھا ہے کہ "مساوات" کے لائحۂ عمل کی خصوصیت یہ تھی کہ اس کا کوئی واضح نظریہ نہیں تھا اور نہ ہی کوئی سلجھا ہوا سیاسی فلسفہ تھا۔ "مساوات" کے لائحۂ عمل کے مطابق اس کی تمام تر کوششیں ترک اقوام کی آزادی حاصل کرنے اور ایک سلطنت اسلامی کے قیام میں جو بحر اوقیانوس اور مراقش سے لیکر بحرالکاہل اور منگولیا تک پھیلی ہوتی صرف ہونی چاہیئے تھیں۔

حقیقت میں "مساوات" کی سیاسی سرگرمیاں خاصی صلح کُن تھیں۔ ۱۹۱۸ء کے قبل "مساوات" کے رہنماؤں نے آذربیجان کی آزادی یا ترکی سے الحاق کے لئے چنداں کوئی کوشش نہیں کی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آذربیجانی دانشور اپنے ہم مذہب ترکوں سے سیاسی اتحاد کے حامی تھے۔ لیکن ۱۹۱۴ — ۱۹۱۹ء کے دوران آذربیجان کی آزادی کے مطالبے کی کوئی تحریک نہیں تھی۔ "مساوات" کے زیادہ تر حامی متوسط طبقے کے پڑھے لکھے لوگ تھے لیکن امرا اور دیہی آبادی اتحاد اسلامی کے نظریئے کی حامی تھی اور "مساوات" کی کارروائیوں کو شبہ کی نظر سے دیکھتے تھے۔ عموماً دہقانوں کو کسی سیاسی لائحۂ عمل کے بہ نسبت اسلام کے نام پر ابھارنا زیادہ آسان تھا۔ قومی اور مذہبی ہم آہنگی اور ترکی کے ساتھ الحاق کی امید اور روسی عیسائیوں کی حکومت کے خلاف ناپسندیدگی کی

---

۵ GUNEINOV: "PARTIIA MUSAVAT."

وجوہات کی بنا پر "مساوات" کو کامیابی حاصل ہوئی۔

قسطنطنیہ میں "نوجوان ترکوں" کے برسر اقتدار آنے سے عالم اسلام میں امید کی ایک نئی لہر دوڑ گئی کہ مشرق کی عظمت رفتہ لوٹ آئے گی اور اہل یورپ ایشیا کے تہذیب و تمدن کی برتری مان لیں گے۔ دراصل "مساوات" کے رہنما اندر سے ترکی کے والہ و شیدا تھے اور اپنے اُزبک اور تاتاری بھائیوں سے زیادہ ان کو قسطنطنیہ کے مستقبل سے دلچسپی تھی۔ اتحاد اقوام ترک کے سلسلے میں ان کے بحث و مباحثے خیالی پلاؤ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے تھے "مساوات" کی خفیہ سرگرمیوں کی اصل وجہ یہ تھی کہ وہ حکومت سے ٹکر نہیں لینا چاہتی تھی۔ پارٹی نے اپنی ایک ہدایت میں کہا کہ

> "موجودہ حالات میں یہ اشد ضروری ہے کہ ہم اپنی تنظیم کو انتہائی صیغۂ راز میں رکھیں اور "مساوات" اپنے ممبروں کو خبردار کرتی ہے کہ وہ حکومت یا اس کے کارکنوں پر کھلم کھلا تنقید نہ کریں۔"

"مساوات" کا یہ رویہ پہلی جنگ عظیم کے وقت بھی نہیں بدلا۔

"مساوات" بہت جلد آذربیجان کی سب سے بڑی پارٹی بن گئی لیکن ملک میں کئی ایک اختلافی گروہ موجود تھے۔ شیعہ علما جن کا صدیوں سے ایران سے تعلق رہا تھا سُنّی ترکی سے بڑھتی ہوئی ہمدردی کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے تھے۔ علماء اور قدامت پسند مسلمان بھی ایک فوجی اور لادینی مسلم ترک سلطنت کے قیام کو اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ "مساوات" کے ممبروں میں مغربی طریق زندگی کا چلن جو کہ روایاتی اسلامی معاشرے کے منافی تھا لوگوں کو بھڑکاتا تھا۔ آزادی نسواں اور حقوق نسواں کی تحریکوں سے بھی بدظنی تھی۔ مغربی ادب اور ثقافت کی

کشمش، تھیٹر کا شوق جس کی وجہ سے مسجدوں کی حاضری پر بُرا اثر پڑتا تھا اور عربی فارسی کی جگہ جدید ترکی اور فرانسیسی زبان اور ادب سے شغف، ان سب نے مل کر مسلم معاشرے کی قدیم روایات کو تباہ کر دیا۔ صافہ کی جگہ ہیٹ نے لے لی، مسلم گھرانوں میں نیا فرنیچر اور تصاویر نظر آنے لگیں اور قدیم مذہبی نظریات کی جگہ روسی، فرنچ اور ترک افکار و خیالات آگئے۔ حریت پسندوں اور "مساوات" کے ان وعدوں کے باوجود کہ وہ اسلام کی عظمت کو زندہ کریں گے، علماء کو ان کی جدت طرازیوں میں قدیم نظام اور رسم و رواج کا خاتمہ نظر آنے لگا۔ علاوہ ازیں قدیم نظام کے پیروؤں کو جن کو مذہب کی ہمہ آفاقی کا سبق ملا تھا اور جن کی نظروں میں اسلام ایک بین الاقوامی اور وسیع المشرب مذہب تھا اور جو قومیت کی تنگ نظری سے بلند تھا۔ اتحاد اقوام ترک کے حمایتیوں کی نسلی اور لسانی تنگ ذہنی سے بڑی تشویش لاحق ہوئی۔ "مساوات" کے اہل الرائے نے یوسف آقچورہ اور آغا اوغلو کے نقش قدم پر چلتے ہوئے نسلی اور قومی نظریات کو مذہب پر ترجیح دی جس کے نتیجے میں بہت سے قدامت پسند آذربیجانیوں نے روسیوں کی مدد سے حریت پسند نظام کے بجائے موجودہ نظام کو برقرار رکھنے میں مصلحت سمجھی۔ یہ اختلاف رائے اکثر و بیشتر کھلی دشمنی کی شکل اختیار کر لیتا اور علماء حریت پسندوں کے خلاف کفر و الحاد کا فتویٰ لگا دیتے۔

دوران جنگ اور انقلاب میں "مساوات" کے بہت سے حامی بائیں بازو کی سیاسی زندگی سے وابستہ ہو گئے۔ سوشل ڈیموکریٹ کی "ہمت" پارٹی جو رسول زادہ کی قیادت میں تھی، "مساوات" کے مقابلے میں مزدوروں میں زیادہ مقبول تھی ۱۹۰۸ـ۱۹۱۴ء کے دوران "ہمت" کی انقلابی سرگرمیاں بھی بڑی حد تک

ٹھنڈی پڑگئی تھیں۔

الغرض یہ کہ روسی حکام نے آذربیجان میں انقلابی اور قومی ہیجان بڑی حد تک دبا دیا تھا اور شاہی حکومت کے آخری دور میں ۱۹۰۵ء کے انقلاب کے بعد ماورائے قفقاسیہ کے حالات معمول پر آگئے تھے۔ سلطنت روس کے اور دوسرے علاقوں کی طرح یہاں بھی ۱۹۱۴-۱۹۰۷ء کے درمیان تیزی سے بڑھتی ہوئی اقتصادی اور تعلیمی ترقی نے آذربیجانی رہنماؤں کی توجہ سیاسی مسائل سے ہٹا دی حتیٰ کہ پہلی جنگ عظیم میں ترکی کی محوری طاقتوں سے دوستی نے بھی یہاں کے پُر فریب سکوت میں کوئی ردعمل پیدا نہیں کیا۔

اتحاد اقوام ترک اور تاتاری

جون ۱۹۰۷ء میں سیاسی اختلافات کی بنا پر دوسری دوما برخاست کردی گئی اور نئے انتخابی قوانین کا اعلان کیا گیا۔ ان نئے قوانین کے تحت قزاقستان اور وسطی ایشیا کی نمائندگی ختم کردی گئی اور قاف اور والگا۔ یورال خطوں کے مسلمان نمائندوں میں بھی کمی کردی گئی۔ تیسری دوما میں مسلمانوں کے ۹ نمائندے تھے[1] جو چوتھی دوما میں گھٹا کر ۷ کر دیئے گئے۔ مسلمان نمائندوں کی تعداد گھٹانے کی دو بڑی وجوہات تھیں، اول یہ کہ کیڈٹ پارٹی کے ممبر کم ہوجائیں اور دوم یہ کہ مسلمانوں کے بڑھتے ہوئے سیاسی اثر و رسوخ کو زک پہنچے۔ ۱۹۰۵ - ۱۹۰۷ء میں ترک سیاسی سرگرمیوں سے حکومت کو تشویش لاحق ہوگئی۔ یہ بات ظاہر تھی کہ تاتاری تمام روسی مسلمانوں کے اتحاد اور قیادت کے لئے کوشاں تھے۔ تاتاری اسکولوں، اخبارات اور مسلم کانگریس کی کامیابی سے یہ بات بالکل عیاں تھی کہ تاتاری ایک اہم سیاسی طاقت بن چکے ہیں جن کی ہمدردیاں ترکی کے ساتھ تھیں۔ تیسری کل مسلم کانگریس کی اس قرار داد سے جس میں تمام مسلم اسکولوں میں عثمانی ترکی کو رائج

---

[1] تفصیل یہ ہے:- اوفا: ۴ - قازان: ۲ - باکو: ۱ - داغستان: ۱ اور سنبرگ: ۱

کرنے کے لئے کہا گیا ہے یہ بات صاف ظاہر تھی کہ تاتاری قوم پرست تمام مسلمانوں کو ایسے ایک بیرونی اثر کے تحت لانا چاہتے تھے جس کی روس سے دشمنی تھی۔ اسی دوران میں تقریباً ۵۰ ہزار والگا کے تاتاری جو اٹھارہویں صدی میں عیسائی کر لئے گئے تھے اسلام کے حلقے میں واپس آگئے اور اس سے بھی حکومت کو بڑی تشویش ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ عین ماسکو کی نظروں کے سامنے اسلام نے ایک غیر معمولی فتح حاصل کی ہے۔

والگا کے خطے میں اسلام کے بڑھتے ہوئے رسوخ کو حکومت نے کسی طرح سے روکنا چاہا اور اس بات کی کوشش کی گئی کہ مسلم اسکولوں کو حکومت کی تحویل میں لے لیا جائے۔ ۱۹۱۲ء میں اسلام کے اثرات کو روکنے کے لئے ایک خاص کمیشن مقرر کیا گیا۔ اور بیشتر کانفرنسیں منعقد ہوئیں جن میں روسی ثقافت کو پُراثر بنانے کے لئے مختلف اقدامات پر غور کیا گیا۔

دوما میں مسلم نمائندگی کم کرنے اور سیاسی نشر واشاعت، اجتماع اور مظاہروں پر سخت پابندیاں عائد کرنے سے دو نتیجے برآمد ہوئے۔ اولاً بہت سے قوم پرست ترکی چلے گئے اور روس میں ان کی سرگرمیاں خفیہ ہوگئیں اور دوئم یہ کہ قوم پرستی کی تحریک پر پابندیاں لگ جانے سے تاتاری علاقوں میں سکوت ہوگیا۔

ترک رہنما جو ترکی چلے گئے تھے انہوں نے قسطنطنیہ میں پھر سے اتحاد اقوام ترک کی تحریک شروع کی۔ ۱۹۰۸ء "نوجوان ترکوں" کے برسر اقتدار آنے سے اس تحریک کو بڑی تقویت پہنچی۔ "نوجوان ترکوں" نے اتحاد اقوام ترک کو بڑھاوا دینے کے لئے تین مشہور و معروف روسی ترک قوم پرستوں کو اپنی مرکزی کمیٹی کا ممبر منتخب کیا۔ یہ اسمٰعیل بے، حسین زادہ علی بے اور

یوسف آقچورا تھے۔ احمد بے آغا اوغلو کو قسطنطنیہ کے مدارس کا انسپکٹر جنرل مقرر کیا گیا۔

اسمٰعیل بے باغیچہ سرائے ہی میں رہتے تھے لیکن آغا اوغلو، حسین زادہ، آقچورا اور رسول زادہ بخارا اور تاشقند کے تارکین وطن اور طلبا کے ساتھ مل کر قسطنطنیہ میں مصروف عمل تھے۔ یوسف آقچورا نے ان کی قیادت سنبھال لی اور روس میں اتحاد اقوام ترک کے نظریات کو پھیلانے کے لئے مختلف گروہ قائم کئے۔ غرضیکہ جنگ عظیم سے ۵، ۶ سال قبل روسی تارکین وطن کی کوششوں سے قسطنطنیہ اتحاد اقوام ترک کا مرکز بن گیا۔

اتحاد اقوام ترک کے حامی ارنسٹ رینان کی پیروی میں کہتے تھے کہ

"قومیت کی اصل بنیاد اول زبان، دوئم مذہب، اخلاق اور رواج اور سوم مشترکہ تاریخ، وطن اور قسمت پر قائم ہوتی ہے۔"

اور وہ اسلام کو اپنا قومی مذہب کہتے تھے لیکن ان میں سے کوئی بھی نہ تو عالم تھا اور نہ اسلامی روایات کا علمبردار۔

یوسف آقچورا اور ان کے رفقائے کار نے اتحاد اقوام ترک کی کوششوں کے باوجود روس کے خلاف پروپیگنڈے سے احتراز کیا اور حکومت روس کے خلاف معاندانہ جذبات کا اظہار نہیں کیا بلکہ اکثر و بیشتر روسی مدارس، ادب اور زبان کی تعریف کی۔ یوسف آقچورا نے ان لوگوں کو جو ترک تاریخ کا مطالعہ کرنا چاہتے تھے روسی زبان سیکھنے کا مشورہ دیا "کیونکہ یوروپ کی کسی اور زبان میں اس مضمون پر سیر حاصل کتابیں موجود نہیں ہیں"۔ دوسرے ادیبوں نے بھی روسی مدارس اور نظام کو سراہا اور روسی اور

مسلمانوں کے باہمی میل جول کے فوائد کی طرف توجہ دلائی۔

قسطنطنیہ میں مقیم تارکین وطن بالآخر کئی گروہوں میں تقسیم ہو گئے اور ان کے درمیان "ترک"، "تاتار" اور "توران" کی اصطلاحات اور مفہومات پر علمی بحث و مباحثے ہونے لگے۔ یہ تمام تر ادیب اور صحافی جو مغرب کے تعلیم یافتہ تھے اس دور کی قومیت کے نظریات کا شکار رہتے اور اکثر اوقات ان کی شدت پسندی مضحکہ خیز صورت اختیار کر لیتی تھی غرضکہ قسطنطنیہ کی ہیجان خیز فضا میں نسلی اور لسانی تنازعات بڑا اہم مسئلہ بن گئے اور اتحاد اسلامی کی تحریک پس پردہ پڑ گئی۔

۱۹۰۸ء کے لگ بھگ ترک قومی مسائل میں دلچسپی کم ہونے لگی۔ یہ کمی ۱۹۱۱ء کے بعد خاص طور سے محسوس کی گئی۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ ترک سیاسی جماعتوں کا لائحۂ عمل تقریباً وہی تھا جو روسی سیاسی پارٹیوں کا تھا اور یہ کہ دوما میں مسلمان نمائندوں کی سرگرمیاں صرف مذہبی حقوق کے تحفظ تک محدود ہو کر رہ گئیں۔

دوما میں تاتاری گروہ کے قائد صدر الدین مقصودی تھے جنہوں نے روسی ترکوں کو منظم کرنے کے لئے ۱۹۱۲ء میں روس کے طول و عرض کا دورہ کیا۔ دوما کی تقاریر میں انہوں نے اپنے تاتاری رفقاء کو روس کے دو کروڑ مسلمانوں کا نمائندہ قرار دیا انہوں نے حکومت کو خبردار کیا کہ اگر ضرورت پڑی تو تمام مسلمان اپنی جان و مال سے اسلام کی حفاظت کریں گے لیکن انہوں نے اس بات کا اعادہ کیا کہ مسلمان سلطنت روس کے اتحاد کے متمنی ہیں اور سلطنت سے علیحدہ نہیں ہونا چاہتے۔ اس دور میں مسلمانوں کی سیاسی سرگرمیوں کی رفتار عام طور سے مدہم پڑ گئی۔ ۱۹۱۳ء میں چوتھی دوما کے ایک

ممبر جعفر نے اس بے حسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شکایت کی کہ دوما کے مسلم مندوبین کے اخراجات کے لئے دو سو روبل کی رقم بھی جمع نہیں ہو سکی۔ "ترجمان" اور دوسرے اخباروں نے کئی بار مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ اپنے مندوبین کی مالی اعانت کے لئے چندہ دیں۔ "اقبال" نے مسلمانوں کی سیاسی بے حسی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ

"مسلمانوں نے اپنے مندوبین سے تمام تعلقات قطع کر لئے ہیں اور وہ ان کو اپنی ضروریات اور مشکلات سے آگاہ نہیں کرتے ہیں"۔

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نمائندگان نے بھی اپنے کام میں دلچسپی لینی چھوڑ دی۔

۱۹۱۴ء میں کیڈٹ اور دوسرے مندوبین نے مسلمان گروہ کے تعاون سے دوما میں قزاقستان اور وسطی ایشیا کی نمائندگی کو بحال کرانے کی کوشش کی لیکن حکومت نے یہ درخواست نامنظور کر دی۔

قومی اور سیاسی مسائل سے بے تعلقی کا اثر اسکولوں پر بھی پڑا جبکہ انیسویں صدی کے آخر اور ۱۹۰۰–۱۹۰۷ کے دور میں مسلمانوں نے اپنے اسکول قائم کرنے کے لئے سخت اصرار کیا تھا۔ ۱۹۱۰–۱۹۱۴ء کے دور میں وہ روسی اسکولوں کے حامی ہو گئے۔ حتیٰ کہ قوم پرست اخباروں نے بھی روسی اسکولوں کو ترجیح دینی شروع کر دی۔ تاتاری اخباروں نے روسی تاتاری اسکول قائم کرنے کی حمایت کی جبکہ چند سال قبل ہی وہ اس تجویز کے سخت خلاف تھے۔ ۱۹۱۷ء کے انقلاب سے چند سال قبل روسی تعلیمی اداروں میں تاتاری طلباء کی تعداد بڑی تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ تاتاری اخباروں نے خوشحال طبقے سے اپیل کی کہ روسی اداروں میں تعلیم پانے والے تاتاریوں

کو وظائف دیکر ان کی ہمت افزائی کریں۔ مسلمان علمار کے ایک نمائندے نے اس امر پر اطمینان ظاہر کیا کہ روسی اسکولوں میں تاتاری لڑکوں کی تعداد بڑھ رہی تھی۔ تاتار علما کے اخبار "بیان الحق" نے مقامی حکومت کو اس بات پر مبارک باد پیش کی کہ وہ تاتاریوں کے لئے روسی اسکول قائم کر رہی تھی۔ انیسویں صدی کے برعکس اس دور میں کسی نے بھی اس "روسیت" کے خلاف آواز نہیں بلند کی۔

تاتار معاشرے کی اس کیفیت کا یہ مطلب نہیں تھا کہ انہوں نے قوم پرستی کے نظریات کو ترک کر دیا تھا بلکہ ان کے نزدیک مسلمانوں کے تعلیمی مسائل کا عملی حل یہی تھا۔ حقیقت میں دوما میں تاتاری نمائندے روسی اسکولوں کے اثرات سے تاتاریوں کو محفوظ رکھنے کی کوشش کر رہے تھے اور چنانچہ ان کا اپنے رائے دہندوں سے سخت اختلاف تھا۔ تاتاریوں میں یہ احساس پیدا ہو رہا تھا کہ ان کی ثقافتی اور تعلیمی ترقی روسیوں پر منحصر ہے اور یہ حقیقت تاتاریوں کے لئے بہت اہم تھی کیونکہ وہ روسیوں کے درمیان آباد تھے۔ نئی آباد کاریوں اور صنعتی واقتصادی ترقی نے مختلف اقوام کو گڈمڈ کر دیا تھا اور اب مسلمان اور سلافی ایک دوسرے کے لئے اجنبی نہ تھے روسی ادب تاتاری ادب پر اثر انداز ہو رہا تھا۔ تاتاری اور دوسرے ترک زیادہ سے زیادہ روسی کتابیں پڑھ رہے تھے۔ کتابوں میں قازان، اوفا اور تاشقند کے تذکرے کے ساتھ ساتھ والگا اور یورال کا ذکر عام بات تھی قزاقستان کے دہقانوں کے حالات کے ساتھ ساتھ روس کے انقلابیوں کا ذکر بھی آنے لگا۔ قسطنطنیہ اور قاہرہ کے ادیبوں کے مقابلے میں روسی ادیب زیادہ قریب آگئے تھے۔ روزمرہ کے میل جول

عدالتی کارروائیوں اور اخباروں، اشتہاروں اور تجارتی لین دین کی وجہ سے روسی الفاظ ترک زبان میں داخل ہوتے جا رہے تھے۔ حالانکہ سیاستدان عثمانی ترکی پڑھنے کی ہدایت کر رہے تھے لیکن زندگی کے کاروبار میں روسی جزو لاینفک بن چکی تھی۔ روسی تجارتی، فنی، ادبی اور سیاسی اصطلاحات روز بروز اختیار کی جا رہی تھیں۔ ترک زبان میں اس قدر روسی الفاظ آچکے تھے کہ ایک اوسط تاتاری چند منٹوں کے مختصر مکالمے میں کم از کم ۵۰ روسی الفاظ استعمال کرتا تھا۔ قازان کے ایک اخبار "یلدز" کے ایک مضمون میں ۲۰ سے زائد روسی الفاظ اور اصطلاحات مستعمل ہوئیں۔

حکومت زار کے آخری سالوں کا تجزیہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عام طور پر روس۔ ترک تعلقات تسلی بخش تھے۔ اس وقت ترک اقوام میں تاتاری ایک ممتاز حیثیت رکھتے تھے اور ان کو یہ احساس ہو چلا تھا کہ جس طرح قرآن ان کو عرب نہ بنا سکا اسی طرح روسی اسکول ان کے مذہب اور ثقافت کو نہیں مٹا سکتے ہیں جبکہ روسی تعلیم سے ان کو متعدد فائدے پہنچ سکتے ہیں۔ آخر کو ان کے زیادہ تر رہنما مثلاً اسمٰعیل بے، آغا اوغلو، اسحاقی اور حسین زادہ روسی اسکولوں کے تعلیمیافتہ ہی تو تھے۔ ادھر ۱۹۱۷ء ۱۹۱۲ء کے دوران روسیوں کو بھی یقین ہو چلا تھا کہ تاتاری سلطنت کے لئے خطرہ نہیں ہیں۔ دوما اسکول اور اقتصادی زندگی میں مستقل میل جول سے تاتاری اور روسی ایک دوسرے کو بہتر سمجھنے لگے۔ لیکن وسطی ایشیا میں یہ صورت حال مختلف تھی۔ پہلی جنگ عظیم کے شروع میں تاتاریوں کے معاشرتی اور ثقافتی کامیابیاں خاصی معقول تھیں اور ۱۹۱۷ء تک مسلمانوں

کو روسیوں کے تقریباً برابر شہری حقوق حاصل ہو چکے تھے۔ ۱۹۱۲ء میں ۲۵ ہزار ترک اسکول قائم تھے اور اسی سال ۶۰۰ کتابیں "مسلم زبانوں" میں شائع ہوئیں۔ قازان ترک مطبوعات کا مرکز بن گیا اور روس کے طول وعرض میں ترک اخبار وجرائد شائع ہوتے تھے۔ آرک انجل (ARKHANGELSK) ولاڈی واسٹک (VLADIVOSTOK) چیتا (CHITA) ارکٹسک (IRK-UTSK) پیٹرزبرگ، ولنو، ماسکو اور دوسرے متعدد مقامات میں مسلم جماعتیں اور مساجد قائم ہو چکی تھیں۔ سلطنت کے غیر ترک علاقوں میں بھی مدرسے اور مکتب نظر آنے لگے۔ جنرل چنگیز، عینن کیف (ENI-KEEV) صمد میخمندروف (MAKHMENDAROV) یوسف، اور خان نخچیوان (NAKHICHEVAN) وغیرہ روسی جنرلوں کے ہم پلہ تھے۔ حسین اور تاجیوف روس کے لکھ پتی خاندانوں میں تھے، ان کے علاوہ بیشمار مسلمان صنعت کار اور تاجر اپنے کاروبار میں بیحد کامیاب تھے اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں کی کوششوں کے باوجود مسلم مذہبی ادارے کو حسب خواہ آزادی نہ مل سکی لیکن روسی چرچ بھی حکومت کے اختیار سے آزاد نہیں تھا۔

نسلی امتیاز نہ ہونے کی وجہ سے بھی تاتاریوں کو بڑی سہولت ہوئی۔ تاتاری دانشور، تاجر یا طالب علم روسی ساتھیوں اور دوستوں میں پوری طرح قابلِ قبول تھا۔ روسی معاشرے کے کسی طبقے میں بھی نسلی امتیاز کا تصور نہ تھا۔ جب ایک آذربیجانی مسلمان خانِ نخچیوان کو زارنکولس کے شاہی محافظ دستے کا کمانڈر مقرر کیا گیا تو ماتحت افسران کو جو بہت چیدہ چیدہ ہوتے تھے قطعاً کوئی اعتراض نہیں ہوا۔ روس، جاپان،

کی جنگ میں ایک مسلمان جنرل ارس خاں علی نے روسی سپہ سالار کے بیمار پڑنے پر منچوریا میں تمام روسی افواج کی کمان سنبھالی اور تمام افسر ان کی بے انتہا عزت کرتے تھے۔ پشکن، ٹالسٹائی اور ڈسٹوو سکی جیسے روسی ادیبوں نے قفقاز کے مسلمانوں کی جد و جہد آزادی کو پوری طرح سراہا۔

پہلی جنگِ عظیم اور وسطی ایشیا

۱۹۰۷ء–۱۹۱۴ء کے دوران میں روسیوں اور ترک اقوام میں جو دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے تھے پہلی جنگ عظیم کے چھڑنے سے ان پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ جنگ کے اولین ہفتوں میں ہر محب وطن شہری کی طرح ترکوں نے بھی حکومت کو اپنی وفاداری کا یقین دلایا اور رضاکار جماعتوں میں شمولیت کی پیش کش کی۔ "اتفاق" کے پرانے اور کہنہ مشق رہنما سید آلین اُن پہلے لوگوں میں سے تھے جنہوں نے اخبارات کے ذریعے مسلمانوں کو حکومت کی مدد کی تلقین کی اور زخمی سپاہیوں کی دیکھ بھال کرنے کے لئے شفاخانہ کھولنے کو کہا۔ انہوں نے لوگوں کو یاد دلایا کہ جب قازان کے تاتاری حصے میں آگ لگی تھی تو روسیوں نے بلا لحاظ ان کی مدد کی تھی۔[1]

مسلم اخباروں، مفتیوں اور معاشرتی انجمنوں نے آلین کی صدا پر لبیک کہا اور سلطنت کے مسلمان خطوں سے چندہ آنے لگا۔ تاتاری اور دوسرے

---

[1] KAZANSKII TELEGRAF مورخہ ۲۸ر اگست ۱۹۱۴ء

ترک سیاسی رہنماؤں نے بھی اپنی وفاداری پر حرف نہیں آنے دیا آلین کے نقش قدم پر چلتے ہوئے متعدد سیاسی رہنماؤں نے حکومت کی امداد کے لئے اپیل کی اور شفاخانے منظم کرنے کے لئے کہا۔ دوما کے مسلمان مندوبین نے بھی دو اپیلیں شائع کیں جن میں مسلم عوام سے کہا گیا کہ

"وہ روس کی عظمت اور سالمیت کے لئے خون کا آخری قطرہ تک بہانے کو تیار ہو جائیں۔"[ل]

امرار اور فقرا سب نے حسب حیثیت حکومت کی مالی امداد کی — تاجیوف نے اپنے ذاتی خرچہ سے باکو میں ایک فوجی ہسپتال قائم کیا اور جرمنوں کے خلاف لڑنے کے لئے آذربیجانی رضا کاروں کے دستے کے اخراجات برداشت کئے۔ وسطی ایشیا اور قزاقستان کے عوام نے ۲۴ لاکھ روبل، ۷۰ ہزار گھوڑے، ۱۲ ہزار اونٹ، روئی، گوشت اور دوسری ضروریات بہم پہونچائیں[ع]۔ دسمبر ۱۹۱۴ء میں کل روسی مسلم کانگریس کے خاص اجلاس میں فوجی ہسپتالوں کی تنظیم کی قرارداد منظور کی گئی۔ زخمیوں کو طبی امداد پہنچانے کے لئے جو کمیٹی مقرر ہوئی اس میں ممتاز ترک رہنما شامل تھے۔

روسی مسلمانوں نے نہ صرف روپے پیسے سے بلکہ ملک کے دفاع کے لئے اپنی جانوں کی پیش کش بھی کی۔ اس آمادگی کو ثابت کرنے کے لئے روسی فوج میں رضاکاروں کا طومار لگ گیا۔ قفقاز کے مسلم رضاکاروں پر مشتمل ۶ رجمنٹوں کا ایک گھوڑ سوار ڈویژن تیار کیا گیا جس نے آسٹریا کے محاذ

ل تاتاری اخبار "تورموش" مورخہ ۷ر اکتوبر ۱۹۱۴ء

ع KRASNYI ARKIV جلد ۳۴ (۱۹۲۹ء)

پر بے مثال جرأت کا مظاہرہ کیا۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ قفقاز کے ان باشندوں کے لئے فوجی ملازمت لازمی نہیں تھی۔ مسلمان سپہ سالاروں نے میدانِ جنگ میں اپنی قابلیت کا لوہا منوالیا۔ آذربیجانی جنرل مینحمند روف کا جنگ کے بہترین جنرلوں میں شمار ہوتا ہے۔ خان نخی چیوان کا پہلے بھی ذکر آچکا ہے، فروری ۱۹۱۷ء کے پُر آشوب زمانے میں یہ ان چند کمانڈروں میں سے تھے جنہوں نے اپنی اور اپنی افواج کی خدمات زار نکولس دوم کو پیش کی تھیں۔

کریمیائی تاتاری، ترکمان اور باشقیریا فوجیوں نے روسی افواج کے شانہ بہ شانہ محاذ جنگ پر اپنی بہادری کے جوہر دکھائے روسی افسروں نے جنہوں نے ان سپاہ کی کمان کی مسلمان سپاہیوں کے نظم اور جنگجو یانہ خصوصیات کی بڑی تعریف کی۔

روسی مسلمان جرمنی اور آسٹریا کے خلاف جنگ میں پوری طرح متحد تھے۔ حریت پسندوں اور "اتفاق" کے رہنماؤں کو جرمنی کی قیصر شاہی سے چنداں ہمدردی نہ تھی اس کے برعکس ان میں سے اکثریت کو جمہوریہ فرانس سے جہاں بیشتر تعلیم پاچکے تھے ہر ممکن ہمدردی تھی۔ البتہ ترکی کے ساتھ جذباتی صورت حال نازک تھی جہاں کے لوگ ان کے ہم مذہب تھے اور عرصہ دراز سے روسی ترکوں کے لئے مشعلِ راہ تھے۔ اگست ۱۹۱۴ء میں پیٹرزبرگ میں جہاں ہمیشہ سے قدامت پسند علمار کا زور تھا مقامی مسلمانوں نے ایک بڑے جلسے میں ترکی کے روس کے خلاف جنگ میں شامل ہونے کے عزائم کے خلاف احتجاج کیا۔ علما کے گروہ نے سلطان کو ایک تار بھیجا جس میں ترکی کے جنگی عزائم کے خلاف احتجاج کیا گیا تھا حالانکہ یہ

تار ایک محدود گروہ نے بھیجا تھا لیکن تذبذب کی یہ کیفیت اکثر و بیشتر مسلمانوں میں پائی جاتی تھی۔

جب روسی ساحلوں پر جرمن جہازوں کے حملے کے بعد ترکی نے روس کے خلاف اعلان جنگ کر دیا تو مفتی یار محمد سلطان نے روسی مسلمانوں کی تسلی و تشفی کے لئے ان کو سمجھایا کہ

"چندے معدودے اشخاص نے جن کے ہاتھوں میں سلطنت عثمانیہ کی باگ ڈور ہے جرمنوں کے بہکاوے میں آ کر روس کے خلاف جنگ چھیڑ دی ہے ــــ تمام روسی مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ وطن کی حفاظت کریں"۔

سید آلین نے اس کی تائید کی اور مزید کہا کہ

"اتحاد اسلامی" ایک روحانی رشتہ ہے ــــ مسلمانوں پر اپنے ہم مذہبوں کی حفاظت سیاسی اغراض کے لئے نہیں بلکہ محض اسلام کی بقا کے لئے لازم ہے"۔

چونکہ ترکی نے روس پر سیاسی اغراض کی نیت سے حملہ کیا تھا اور اس کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں لہٰذا بقول آلین روسی مسلمانوں پر اپنے ترک بھائیوں یا سلطان ترکی کی مدد فرض نہیں تھی۔ باکو، اورن برگ، پیٹرزبرگ، طفلس قازان اور دوسرے شہروں میں مختلف جلسوں اور اعلانوں میں مفتی سلطان اور سید آلین کے بیانات کی تائید کی گئی۔

آذربیجان میں "مساوات" نے بھی روسی مسلمانوں کو جرمنی اور ترکی کے خلاف جنگ میں حصہ لینے کی ہدایت کی اور لوگوں کو سمجھایا کہ مسلمانانِ ہند کی طرح مسلمانانِ روس کو بھی سلطان ترکی کو خلیفۃ المسلمین نہیں ماننا چاہیئے

کیونکہ عالم اسلام نے ان کا انتخاب نہیں کیا ہے۔[1] بہت سے ترک اخباروں نے عوام کی توجہ اس امر کی طرف دلائی کہ ہندوستان، مصر اور الجیریا کے مسلمان جرمنی، آسٹریا اور ترکی کے خلاف متحد ہیں۔[2] غرضکہ مختلف دلائل و براہن سے پُرجوش مسلمانوں کے جذبات ٹھنڈے پڑ گئے۔

مسلمان رہنماؤں کی یہ خواہش کہ، اس جنگ کو سیاسی اغراض و مقاصد حاصل کرنے کے لئے آلۂ کار نہ بنایا جائے۔ "مساوات" کے قائد رسول زادہ کے قول و فعل سے بخوبی ظاہر ہوتی ہے جو کچھ عرصہ پہلے ہی آذربیجانیوں کو اُکسا رہے تھے کہ

"الحمرا سے پیکنگ تک اسلام کا بول بالا کرنے کے لئے
اپنے گھوڑوں کی زینیں کس لو۔"[3]

اکتوبر ۱۹۱۵ء میں انہوں نے قوم پرستوں کا نیا لائحہ عمل شائع کیا جس کا متن یہ تھا۔[4]

۱۔ نئے سرکاری اسکول قائم کئے جائیں جن میں ذریعۂ تعلیم قومی زبان ہو۔

۲۔ حکومت کی مدد سے دارالعلوم قائم کئے جائیں۔

۳۔ حکومت کی مداخلت کے بغیر عوام اپنے علماء کا انتخاب کر سکیں۔

---

[1] علی مردان اور تاجوف کا اخبار KASPii

[2] اخبار "توروش" مورخہ ۲۶ر اکتوبر ۱۹۱۴ء

[3] "مساوات" کی تاریخ از حسین

[4] " " " "

۴۔ مسجدوں اور دوسرے مذہبی اداروں کی جائداد واپس کی جائے
اور جو روپیہ پیسہ ضبط کیا گیا تھا وہ واپس کیا جائے۔

اس منشور میں اتحاد اقوام ترک یا اتحاد اسلامی کا کوئی تذکرہ نہیں تھا اس کے مطالبات تقریباً وہی تھے جو مسلمانوں کے مذہبی اداروں اور نظام تعلیم کے سلسلے میں ۱۹۰۶ء کی تیسری مسلم کانگریس اور "اتفاق" نے پیش کئے تھے۔ "اتفاق" کے نمائندوں نے دوما میں بھی ان مطالبات کو پیش کیا۔ لیکن لڑائی کے نازک حالات کی وجہ سے اصلاحات پر زور نہیں دیا۔

اس کے باوجود روس کے تقریباً ۲ کروڑ مسلمانوں میں ایسے عناصر بھی تھے جو اس صورت حال سے مطمئن نہیں تھے۔ واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۹۱۴-۱۹۱۶ء کے دوران کریمیا میں متعدد جگہوں پر مسلمانوں کے اتحاد اور ترکی کو مدد دینے کے لئے شدید احتجاج اور ہنگامے ہوئے۔ قازان اور اس کے اطراف میں یہ سرگرمیاں کافی نمایاں تھیں اور عوام میں متعدد رسالے اور اشتہار تقسیم کئے گئے جن میں ترکی کی امداد کے لئے اپیل کی گئی تھی اور کہا گیا کہ

"وقت عمل آن پہنچا ہے، ملحد روسیوں سے آزادی حاصل کرنے کا یہی موقع ہے"

فرغانہ میں متعدد ترک اور جرمن جاسوس ایران اور افغانستان کے راستے آکر لوگوں کو بھڑکا رہے تھے۔ خیوا میں ایسے ہی جاسوسوں کے کہنے میں آکر ترکمان خانہ بدوشوں نے خان خیوا اور ازبیگ آبادی کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔ خان خیوا کو بھاری نقصانات اٹھانے پڑے اور بالآخر اپریل ۱۹۱۶ء میں روسی افواج کی مدد سے یہ بغاوت کچل دی گئی۔ صرف ایک واقعے کے

کہیں اور ایسی کارروائیاں نہیں ہوئی۔ جن سے حکومت یا مقامی نظم ونسق کو پریشانی لاحق ہوئی۔ علاوہ وسطی ایشیا کے ہر جگہ امن و امان رہا۔

بیرونی ممالک خصوصاً ترکی میں روسی سیاسی تارکین وطن کا رویّہ اپنے روسی رفقا کے صلح کن رویئے سے بہت مختلف تھا۔ ۱۹۱۵ء میں قسطنطنیہ کے تارکین نے یوسف آقچورا کی قیادت میں "مجلس برائے تحفظ حقوق ترک وتاتار مسلمانان روس" قائم کی۔ آقچورا کے علاوہ اس میں رشید ابراہیم جنہوں نے ۱۹۰۴ء میں مسلمان اور روسی حریت پسندوں کے مابین تعاون شروع کیا تھا حسین زادہ، آغا اوغلو اور دوسرے ممتاز رہنما شامل تھے "نوجوان ترک" جن کو یہ امید تھی کہ "مرکزی طاقتوں" (جرمنی۔ آسٹریا ترکی) کی فتح کی صورت میں تمام ترک علاقوں کا سلطنت عثمانیہ کے ساتھ الحاق ہو جائے گا۔ اس تحریک کو دلچسپی اور ہمدردی سے دیکھتے تھے۔ اعلان جنگ کرتے ہوئے "نوجوان ترکوں" نے کہا تھا کہ

> "ہمارا مطمح نظر یہ ہے کہ اپنے روسی دشمنوں کو شکست فاش دے کر سلطنت کی طبعی حدود قائم کریں اور ان تمام عوام کو جو ہمارے قرابت دار ہیں اپنی حدود میں متحد کریں"۔[۵۷]

"نوجوان ترکوں" کے ان جذبات میں "مجلس برائے تحفظ حقوق ترک وتاتار مسلمانان روس" کے بیشتر ممبر برابر کے شریک تھے اور ان میں سے اکثر "نوجوان ترکوں" کی مرکزی مجلس کے ممبر تھے۔ حسین زادہ نے بذات خود ترکی کے اعلان جنگ کی پُرجوش تشہیر کی اور لوگوں کو روس

---

۵۷ ZAVERAND: TURTSII & PANTURANISM

کے خلاف اکسایا۔

۱۹۱۵ء کے آخر میں "مجلس برائے تحفظ حقوق" نے اپنی کاروائیاں وسطی یورپ میں بھی شروع کر دیں۔ دسمبر میں اس کے رہنماؤں نے آسٹریا کے وزیر اعظم اور وزیر خارجہ سے ملاقات کی اور ایک یادداشت پیش کی۔ اس میں کہا گیا کہ

"موجودہ صدی تک تہذیب وتمدن کے علمبردار ہم ترک۔تاتار اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ مغربی تہذیب روسی، بازنطینی تہذیب پر غالب آئے گی ——— ہم کو امید ہے کہ موجودہ عہد میں مغربی تہذیب کے علمبردار جرمنی، آسٹریا اور ہنگری جلد ہی ایشیا کے مستقبل کو بدل دیں گے ——— ہم دعا مانگتے ہیں کہ ہمارے اتحادی شہنشاہان جرمنی و آسٹریا، فرمانروائے ہنگری و بلغاریہ، خلیفۃ المسلمین اور ان کے بہادر عوام ہم کو روسی شکنجہ سے آزادی دلائیں"۔[۵]

یہ وفد ہنگری کے وزیر اعظم اور جرمن حکام سے بھی ملا جرمن اخبارات نے مجلس کے اغراض و مقاصد کو بڑا سراہا۔ جرمن اور آسٹرو ہنگری فوجی حکام نے ان کو اس بات کی اجازت دیدی کہ وہ روس کے ترک جنگی قیدیوں میں سیاسی سرگرمیاں جاری کریں اور ان میں سے بالآخر مجلس کی مدد سے مسلمان رضاکاروں کا ایک خاص دستہ تیار کیا گیا۔ برلن کے نزدیک

---

۵ MEMORANDUM OF THE COMMITTEE FOR DEFENSE OF MOSLEM RIGHTS. (1916)

زوسن (ZOSSEN) کے کیمپ میں بارہ۔ پندرہ ہزار تاتاری قیدی تھے جن میں مجلس کے ممبران نے شد و مد سے روس دشمنی کا پرچار کیا۔ منصوبہ یہ تھا کہ روسی تاتاریوں کی ایک خاص فوج تیار کی جائے لیکن بہت تھوڑے تاتاری ترکی فوج میں شمولیت کے لئے راضی ہوئے یہ عراق میں انگریزوں کے خلاف لڑے[۵۱]۔ روسی محاذ پر کوئی تاتاری نہیں بھیجا گیا غالباً اس کی وجہ یہ بھی کہ کوئی تاتاری رضاکار اس محاذ پر لڑنے کو تیار نہیں ہوا۔ پہلی جنگِ عظیم کے دوران روسی ترکوں کی سیاسی کیفیات کے تجزیئے کے لئے اس تجربے کی ناکامی خاصی سبق آموز ہے۔

۱۹۱۶ء میں "مجلس برائے تحفظ حقوق ــــ" نے سوئٹزرلینڈ کے مقام لوزان میں "روسی عوام" کی ایک کانگریس منعقد کی۔ اس وقت یا تو مجلس میں اندرونی خلفشار پیدا ہو چکا تھا یا اس کی پالیسی دوغلی تھی کیونکہ اوپر ذکر کی ہوئی یادداشت کے برعکس یوسف آقچورا نے اپنے خطبے میں یہ خواہش ظاہر کی کہ روسی مسلمانوں کو قانونی برابری دی جائے اور مکمل ثقافتی خود مختاری ہو ــــ صدر ولسن اور دوسرے مغربی رہنماؤں کو جو تار بھیجے گئے ان میں بھی ان ہی مطالبات کا اعادہ کیا گیا[۵۲]۔ اس کانگریس میں چار ممتاز تارکین وطن یوسف آقچورا، رشید ابراہیم، آغا اوغلو اور حسین زادہ شامل تھے۔ مسلمانان روس کے نام پر انہوں نے مکمل مذہبی اور ثقافتی خود مختاری، تمام قانونی پابندیاں اٹھانے اور انتخابی اداروں

---

۵۱ B. SPULER: "IDEL URAL" (BERLIN 1942)

۵۲ REVUE DU MONDE MUSULMAN (1922)

میں تبدیلی کا مطالبہ کیا۔ اس بات کی بھی شہادت ملتی ہے کہ ان میں سے چند نے یہ امید بھی ظاہر کی کہ روسی ترکوں کا سلطنت عثمانیہ کے ساتھ وفاق قائم ہو جائے۔[۵۱]

مجلس کے ان احتجاجات اور اعلانات کے خلاف مسلمانان روس میں سخت ردعمل ہوا اور دوما کے مسلم مندوبین نے متفقہ طور پر اعلان کیا کہ روس میں کسی بھی مسلم تنظیم کا اس مجلس سے کوئی تعلق نہیں ہے اور روس کے مسلمان حکومت اور اس کے اتحادیوں کی طرف اپنا فرض ادا کریں گے ۔ اکتوبر ۱۹۱۵ء میں رسول زادہ نے بھی اس قسم کے جذبات کا اظہار کیا اور اکتوبر ۱۹۱۷ء کی شورش تک سوائے چندے معدودے مسلمانوں کے تمام مسلم جماعتیں محوری طاقتوں کے خلاف جنگ جاری رکھنے کی پرزور حامی تھیں۔

اگرچہ اتحاد ترک کے حامی اور بیرونی جاسوس عوام کو حکومت کے خلاف اکسانے اور بھڑکانے میں ناکام رہے لیکن جنگ کے دوران ترک اقوام سے رابطہ قائم رکھنے میں حکومت نے جس بے حسی کا ثبوت دیا اس کی وجہ سے مسلمانان روس کے چند فرقوں اور حکومت میں شدید جھڑپیں ہوئیں۔ ترک روسی تعلقات میں یہ تصادم انتہائی خونریز، المناک اور بے معنیٰ تھا جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ نہ تو حکومت مسئلہ اقوام ترک سے بخوبی آگاہ تھی اور نہ اس سلسلے میں اسے کوئی تشویش تھی۔

۱۹۱۵-۱۹۱۴ء میں روسی افواج نے جو بھاری نقصانات اٹھائے

---

۵۱ E. INSOLATO: L'ISLAM ET LA POLITIQUE DES ALLIES (PARIS 1920)

اس کی وجہ سے حکومت روس کو آبادی کے بڑے حصے کو جبراً فوج میں بھرتی کرنا پڑا۔ تقریباً ۱½ کروڑ آدمی جس میں ۴۰ فیصدی صنعتی کاریگر تھے فوج میں بھرتی کئے گئے۔ اس کا نتیجہ جو کہ بعد میں ظاہر ہوا، یہ نکلا کہ بہت زیادہ لوگوں کی بھرتی ہو گئی اور شہروں میں فالتو فوجیوں کا اجتماع ہو گیا۔ صرف پیٹرز برگ میں ۳ لاکھ محفوظ فوج متعین تھی۔ یہ ایک وجہ تھی جس نے فروری کے انقلاب کو ہوا دی۔ لیکن ۱۹۱۶ – ۱۹۱۵ء میں فوجی کمان کو فوجِ محفوظ اور فالتو مزدوروں کے سلسلے میں سخت پریشانی تھی۔ مزدوروں کی کمی پوری کرنے کے لئے انہوں نے مسلمانان ماوراء قفقاسیہ، قزاقستان اور وسطی ایشیا کی جبری بھرتی کا مشورہ دیا۔ کوہ قاف اور وسطی ایشیا کی فتوحات کے دوران میں جب سلطنت میں جبری بھرتی لازمی قرار دی گئی تو حکومت نے وعدہ کیا تھا کہ ان صوبوں کے مسلمانوں کو فوجی خدمت کے لئے نہیں بلایا جائے گا۔ ۱۸۸۶ء میں اس وعدے کی توثیق کی گئی چنانچہ افواجِ محفوظ کی کمی کے باوجود حکومت نے طے کیا کہ مسلمانان روس کی بھرتی مزدوری جماعتوں میں کی جائے جو محاذ جنگ کے پیچھے خندقیں کھودنے، بیرکیں اور شفاخانے بنانے میں استعمال ہوں۔ جبری بھرتی کی اس خبر سے مسلم عوام میں طرح طرح کی افواہیں پھیل گئیں اور شہر شہر قریہ قریہ اس پر چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ مواصلاتی بدانتظامی کے باوجود اس منصوبے کے خلاف عوامی ردعمل جلد ہی مقامی اخبارات میں ظاہر ہونے لگا۔ قزاقستان کے مشہور اخبار "قزاق" نے اس جبری بھرتی پر سخت غم و غصہ کا اظہار کیا۔ اس نے مطالبہ کیا کہ اگر یہ بھرتی لازمی ہی ہے تو قزاقوں کو اس کا مناسب معاوضہ ملنا چاہیئے۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ نو آبادکاری بند کی جائے اور دو ماہین

قزاق نمائندگی بحال ہو جائے۔ بہت سوں نے اصرار کیا کہ قزاقوں کو بجائے مزدوروں کی جماعت کے سوار رسالے میں بھرتی کیا جائے۔ الغرض یہ کہ قزاق اخبارات کا کہنا یہ تھا کہ قزاقوں کو اس فوجی خدمت کے صلے میں مناسب سیاسی معاشرتی اور اقتصادی مراعات جس سے وہ اب تک محروم ہیں ملنی چاہئیں[1]۔

قزاق اور قرغیزیوں کو اس سے بھی زیادہ بد اطمینانی حکومت کی زمینی پالیسی سے تھی۔ کسی حد تک وہ یہ بات سمجھ سکتے تھے کہ قومی خدمت نہ کرنے کے معاوضے میں ان کی زمین حکومت کی تحویل میں چلی جائے حالانکہ یہ بڑی نامنصفانہ بات ہوتی لیکن اب تو اس کا بھی سوال نہیں تھا اور اسی لئے قزاق رہنماؤں نے اپنے مضامین اور مطالبات میں زمین کا سوال فوجی خدمت سے مربوط کر دیا۔ آخر میں یہ افواہیں گشت کرنے لگیں کہ آبادکاران کی غیر حاضری میں نہ صرف ان کی زمینوں پر تسلط کر لیں گے بلکہ ان کے خاندانوں کو غلام بنا لیں گے اور محاذ جنگ پر ان کو سور کا گوشت کھانے کو دیا جائے گا۔ بہت سوں کے لئے، خصوصاً خانہ بدوش جو زیادہ چلنے پھرنے اور محنت و مشقت کے عادی نہیں تھے مزدوروں کی جماعت میں کام کرنا قابل ذلت تھا۔ زمین کے پرانے جھگڑے اور ان نئے حالات نے مل کر ایک انتہائی خطرناک صورتحال پیدا کر دی۔

صلاح و مشورہ کے بعد قزاق رہنماؤں نے ایک وفد فروری ۱۹۱۶ء میں پیٹرزبرگ بھیجا جہاں اس وفد نے مختلف حکام سے مل کر جبری بھرتی

---

[1] "قزاق" مورخہ ۲۴ جنوری ۱۹۱۵ء

کے متعلق وضاحت طلب کی۔ وزیر دفاع سے گفتگو کے دوران وفد نے ان کو قائل کرنے کی کوشش کی کہ قزاقوں کی جبری بھرتی کی راہ میں نفسیاتی اور خصوصی مشکلات حائل ہیں، انہوں نے اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ مزدوری کے بجائے قزاق فوج میں لڑنا پسند کریں گے۔ وفد کے کچھ ممبروں نے جبری بھرتی کو رکوانے کی کوشش بھی کی۔

اس وفد کو کوئی یقینی جواب نہیں دیا گیا لیکن کچھ امیدیں ضرور دلائی گئیں کیوں کہ "قزاق" نے لکھا کہ جبری بھرتی کا نفاذ نہیں ہوگا۔ لیکن اس کے باوجود اخباروں اور بازاروں میں چہ میگوئیاں بند نہ ہوئیں، جلد ہی افواہ پھیل گئی کہ قزاق اور دوسرے مسلمانوں کو محاذ جنگ کے پیچھے نہیں بلکہ گولیوں کی بوچھاڑ میں محاذ جنگ کے آگے خندقیں کھودنی ہونگیں۔

مسلمانوں کی جبری بھرتی کا فرمان جون ۱۹۱۶ء میں شائع ہوا، یہ فرمان انتہائی عجلت میں نکالا گیا اور اس کے غیر مبہم الفاظ نے لوگوں کے ذہنوں میں انتشار پھیلا دیا۔ اخباروں میں مختلف النوع خبروں، وعدوں، غیر محتاط باتوں اور جرمن اور ترک جاسوسوں کی کارروائیوں سے ہر طرف سخت ہیجان پھیل گیا۔ عوام میں شک و شبہ کی لہر دوڑ گئی، ادھر حکومت نے ان کو اس بھرتی کے مقصد سے بھی بےخبر رکھا چنانچہ جب فہرستیں بننی شروع ہوئیں تو لاقانونیت پھیل گئی۔

سب سے پہلے مظاہرے ازبک کی شہری آبادیوں میں ہوئے۔ جولائی میں خوجند میں فسادات ہوئے جو دوسرے شہروں میں پھیل گئے۔ ۱۳ر جولائی کو جو بھرتی کا پہلا دن تھا جزاخ میں سنگین فساد ہوئے۔ مسلمان آبادی نے مقامی سربراہ حکومت روکن (RUKIN) کو آگاہ کر دیا کہ

وہ طلبی کا جواب نہیں دیں گے۔ چند دنوں کے بعد مسلمانوں کے ہجوم نے نئے شہر کے اس علاقے پر جہاں سرکاری دفاتر واقع تھے حملہ کر دیا۔ روکن اور ان کے ساتھ مسلم حکام مار ڈالے گئے۔ ہجوم نے ریلوے اسٹیشن تباہ کر دیا اور پٹرول کی ٹنکیوں کو آگ لگا دی۔ ہجوم نے اس کے بعد سمرقند کا رخ کیا اور راستے میں جتنے پل، ریلوے لائینیں اور ٹیلیگراف کے کھمبے تھے ان کو تباہ و برباد کر دیا۔ جلد ہی یہ بغاوت پورے ضلع میں پھیل گئی۔ تقریباً ۸۰ روسی ہلاک کر دیئے گئے۔ مذہبی جنون نے اس بغاوت کو اور ہوا دی اور باغیوں نے جہاد کا اعلان کر دیا۔ ترکستان کے گورنر جنرل نے سمرقند اور تاشقند سے فوج کی کمک بھیجکر جولائی کے آخر تک اس بغاوت کو کچل دیا۔ لاقانونیت وسطی ایشیا کے دوسرے ازبیک شہروں میں بھی پھیل گئی لیکن حالات نے جزاخ والی صورت نہیں اختیار کی۔ قرغیز کے پہاڑی خطوں میں قرغیزیوں نے ایک منظم فوجی تحریک کے تحت شورش کر دی جو فی الفور ایک عوامی بغاوت بن گئی۔[۱]

قرغیز کی خانہ بدوش آبادی نے جو تیان۔شان پہاڑوں کے مغربی ڈھلوان مشرقی فرغانہ کے پہاڑوں تلے اور شمالی سیمرچی کی وادیوں میں آباد تھے زمین کی بیدخلی کے سلسلے میں قزاقوں سے بھی زیادہ تکلیف اور نقصان اٹھایا تھا۔ چراگاہوں کے کم ہو جانے کی وجہ سے مال مویشی کم ہو گئے اور قرغیزیوں پر غربت و افلاس چھا گیا۔ زمین کی کمی کی وجہ سے قرغیزیوں اور نئے آبادکاروں میں شروع ہی سے

---

[۱] SOKOL: THE REVOLT OF 1916 IN RUSSIAN CENTRAL ASIA.

جھگڑا فساد چلا آرہا تھا۔ جبری بھرتی کے اعلان سے حالات اور سنگین ہوگئے
قرغیزیوں کو خطرہ لاحق ہوگیا کہ تندرست مردوں کے محاذ پر جانے کے بعد
آبادکاران کی زمینوں پر قبضہ کرلیں گے۔ جولائی کے وسط میں سمیرچی کے
مسلمانوں کی بڑی تعداد بھرتی سے بچنے کے لئے چین چلی گئی۔ اگست میں
پشپک کے نواح سے شورش شروع ہوئی اور جلد ہی دوسرے علاقوں
میں پھیل گئی حتیٰ کہ کل قرغیزیہ اس کی لپیٹ میں آگیا۔ باغیوں نے آبادکاروں
کو مار ڈالا اور ان کی املاک کو آگ لگادی۔ ستمبر میں روسی فوجوں کے
آنے کے بعد بغاوت ختم ہوگئی لیکن قرغیزیوں نے چین جانا شروع کردیا۔
ان فسادات میں بڑا جانی مالی نقصان ہوا، دو ہزار سے اوپر آبادکار اور
تقریباً ۸۰ فوجی ہلاک ہوئے۔ قرغیزیوں کے نقصانات کے متعلق اعداد و
شمار موجود نہیں لیکن جس بربریت سے اس شورش کو کچلا گیا اس سے اندازہ
ہوتا ہے کہ چھ سات ہزار قرغیز ہلاک ہوئے۔ اس کے علاوہ جو قرغیز نقل
مکانی کرکے چین چلے گئے تھے ان کی املاک ضبط کرلی گئیں۔ اندازہ کے
مطابق قرغیزیہ کی ایک تہائی آبادی، تقریباً ۳ لاکھ باشندے ترک وطن
کرگئے۔ ان میں سے بیشتر فروری ۱۹۱۷ء کے انقلاب کے بعد مفلوک الحال
واپس لوٹ آئے۔[1]

قرغیزیہ کی یہ شورش اس لئے منظم اور وسیع ہوگئی کہ ان کے یہاں قبائلی
نظام ابھی تک باقی تھا اور قبائلی سرداروں کی اطاعت و فرمانبرداری
لازم تھی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ کامیابی کی صورت میں لوگوں کو اپنی زمینیں

ل[1] LESNAIA: ISTORIIA KIRGIZII (FRUNZE. 1956)

واپس مل جانے کی امید تھی۔

آبادی اور رقبے کو مدنظر رکھتے ہوئے قزاقستان میں شورش کی نوعیت بہت معمولی تھی اور زیادہ پیمانے پر نہیں پھیلی۔ بعض علاقوں کے خانہ بدوش جبری بھرتی سے بچنے کے لئے چین چلے گئے۔ ریگستانی میدانوں میں کمیونسٹوں نے روسی فوجوں سے جھڑپیں کیں جو کئی ماہ تک چلتی رہیں۔ ۱۹۱۷ء کے انقلاب کے بعد جب عام معافی کا اعلان ہوا تو ان لوگوں نے بھی ہتھیار ڈال دیئے۔

اس عرصے میں قزاق رہنماؤں نے جس صبر و ضبط سے کام لیا وہ قابل ذکر ہے۔ جبری بھرتی کے فرمان کے شائع ہونے سے قبل انہوں نے مزدوروں کی بھرتی روکنے کے لئے ہر ممکن کوشش کی تھی لیکن اس کے بعد انہوں نے بھرتی کی مشکلات میں عوام کا ہاتھ بٹانے کی کوشش کی، اکثر علاقوں میں ان کی کوشش سے بھرتی ملتوی کردی گئی اور عموماً انہوں نے حکام سے تعاون کرکے حالات کو بہتر بنانے کی کوشش کی۔ انہوں نے بھرتی کے قواعد وضوابط میں چند تبدیلیوں کی درخواست بھی کی جو بالآخر حکومت نے منظور بھی کرلیں۔ شورشوں اور بغاوتوں کے دوران کیڈٹ پارٹی کے شانہ بشانہ انہوں نے لاقانونیت اور خونریزی کو روکنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ ان کی کوششوں سے قزاقوں کا مالی اور جانی نقصان بہت محدود رہا۔ وسطی ایشیا کے دوسرے علاقوں کی بہ نسبت ان رہنماؤں کی حکمت عملی سے روس اور قزاق آبادیوں کے تعلقات استوار رہے۔ بغاوت کے دنوں "قزاق" نے ہدایت کی۔

"ضبط و تحمل سے کام لو، قانون پر عمل کرو، دشمنوں سے ہوشیار رہو اور اللہ کے نیک بندوں کو برائی سے محفوظ رکھو۔"

اخبار" قزاق" نے لکھا کہ

"ان بے معنی فسادات میں قزاق تباہ ہو گئے ہیں۔ اس مصیبت کی بڑی وجہ قزاقوں کی پسماندگی اور جہالت ہے۔"

قزاق رہنما اور مدبر سمجھتے تھے کہ نو آباد کاری، زمینی مسائل اور حکام کی حماقتوں کے باوجود قزاقوں کے نقصانات کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ان میں کوئی مشترکہ زبان نہیں ہے اور قزاق واقعات اور حالات کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ قزاقوں کو خود بھی ان حقائق کا احساس تھا اور اس لئے انقلاب اور خانہ جنگی کے دوران انہوں نے اپنے قائدین پر مکمل اعتماد رکھا۔

ان شورشوں اور نقصانات کی ذمّہ داری بڑی حد تک روسی حکام پر عائد ہوتی ہے۔ مسلمان مزدوروں کی بھرتی کا فرمان بہت ہی غیر مبہم تھا اور بھرتی کے قواعد وضوابط بہت ہی گنجلک تھے علاوہ ازیں فرمان کے شائع ہونے اور بھرتی کے شروع ہونے میں صرف ایک ماہ کا ناکافی وقفہ تھا۔ متعلقہ منتظمین نا اہل تھے اور اعلیٰ حکام نہ تو مقامی زبان سے اور نہ مقامی رسم ورواج سے واقف تھے۔ قزاقستان اور وسطی ایشیا میں روس کی نصف صدی حکومت کے دوران روسی زبان اور ثقافت کا مناسب پرچار نہیں کیا گیا اور زیادہ تر مسلمان ان سے نابلد تھے۔ ادھر روسی معاشرہ اپنی سیاسی شطرنج میں مصروف تھا اور مسلمانوں کے مسائل پر زیادہ دھیان نہیں دیا گیا چنانچہ مسلمانوں کی جبری بھرتی کے سوال پر کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی تھی۔ البتہ جب شورش اور بغاوت شروع ہوئی تو جنرل کوروپاٹکن (A.N. KUROPATKIN) کو روسی وسط ایشیا کا گورنر جنرل اور سپہ سالار مقرر کیا گیا اور دوما نے کرینسکی (KERENSKY) کی قیادت میں ایک

خاص مشن روانہ کیا۔ جس میں "اتفاق" کا تاتاری نمائندہ شامل تھا۔ اس کمیشن نے جو رپورٹ پیش کی اس پر بھی کوئی خاص توجہ نہ دی گئی۔

ان بغاوتوں پر متعدد کتابیں لکھی جاچکی ہیں لیکن پھر بھی یہ بتانا مشکل ہے کہ باغیوں کا مقصد کیا تھا۔ صرف یہ بات یقینی طور پر کہی جاسکتی ہے کہ یہ شورشیں اور ہنگامے مقامی نوعیت کے تھے اور کسی مرکزی تحریک کے تحت نہیں تھے کیوں کہ جون سے لے کر ستمبر تک مختلف مقامات پر مختلف اوقات میں وارداتیں ہوئیں۔ چند مورخین کی رائے کے باوجود یہ بات مصدقہ ہے کہ "جدید" نے ان شورشوں میں قطعاً کوئی حصہ نہیں لیا، غالباً جزاخ کے طلباء میں اکثریت قوم پرست روشن خیالوں کی تھی۔ اس وجہ سے یہ غلط فہمی پیدا ہوئی۔ ان تحریکوں کے بانیوں کو بخوبی علم ہونا چاہیے تھا کہ روسی حکام فوج کی مدد سے ان شورشوں کو سختی سے کچل دیں گے۔ لہٰذا باغیوں کی کامیابی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ تاریخ میں ان شورشوں اور بغاوتوں کو ایک بے معنی اور خونریز غلط فہمی ہی کہا جاسکتا ہے۔

انقلاب ۱۹۱۷ء

۱۹۱۷ء کے انقلاب فروری نے روسی معاشرے میں جوش و خروش اور امید کی لہر دوڑا دی۔ ہر شخص کو یقین تھا کہ روس کے جمہوری ارتقار کا نیا دور شروع ہو چکا ہے جس میں قوم کی روحانی اور اقتصادی ترقیوں کو مزید فروغ ہوگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انقلاب فرانس کا نعرہ "آزادی، مساوات، اخوت" ایک دفعہ پھر انسانیت کے ایک بڑے گروہ کو فیضیاب کر رہا تھا۔ یہ وہ الفاظ تھے جو ایک درخشندہ ستارے کی مانند روس کے افق پر آزادی اور جمہوریت کی نئی صبح کا اعلان کر رہے تھے۔ فروری اور نومبر ۱۹۱۷ء کے درمیان جس قدر تقاریر، عرضداشتیں اور اعلان پڑھے یا لکھے گئے مشرقی یوروپ کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملتی ہے۔ عوام الناس جمہوریت اور انصاف کے مثالی تصور سے سرشار ہو رہے تھے، صرف چندے معدودے ہی اس بات کو سمجھ رہے تھے کہ ایک خوش آئند مستقبل کے لئے ہمت و جفاکشی سے حقائق کا سامنا کرنا اتنا ہی ضروری تھا جتنا کہ مثالی نظریات پر یقین محکم۔

دوسروں کی طرح روس کے مسلمان رہنماؤں نے بھی "مطلق العنانی سے پرامن اور عظیم الشان رہائی" پر خوشی کا اظہار کیا۔ روس کے دوسرے قومی

رہنماؤں کی طرح مسلم رہنماؤں کو بھی نو مولود جمہوریہ کی جمہوری تعمیر نو پر پورا یقین تھا اور انہوں نے مسلمانان روس کے باہمی اتحاد و تعاون کا خاکہ تیار کیا۔ ۱۹۱۷ء میں جبکہ سیاسی اور قومی اغراض کو مذہب کی آڑ میں چھپانے کی ضرورت نہیں رہی تھی اس وقت بھی ترک اور غیر ترک مسلمان مذہب کے نام پر متحد رہے اور اسلام ہر دوسرے نسلی لائحۂ عمل سے قوی تر ثابت ہوا۔

نئی جمہوریہ روس کے اولین دنوں میں اتحاد اسلامی کے خواہشمند "اتفاق" کے پرانے اور آزمودہ کار رہنما تھے۔ زار نکولس دوم کی دستبرداری کے دو ہفتے بعد دُوما میں "اتفاق" کے نمائندوں نے پیٹروگراڈ میں مسلمانان روس کے رہنماؤں کی ایک کانفرنس طلب کی۔ یہ کانفرنس ۱۵ مارچ کو منعقد ہوئی اور تین روز جاری رہی۔ اس میں ایک "عارضی مرکزی محکمہ برائے مسلمانان روس" کا انتخاب ہوا اور طے پایا کہ شروع مئی میں کل مسلمانان روس کی کانگریس منعقد کی جائے۔ اس کانگریس کے مندوبین کے لئے کانفرنس نے چند بنیادی ضوابط وضع کئے اور ایجنڈا تیار کیا۔ انتخابی ضوابط یہ تھے:

۱۔ روس میں ہر قومیت کے مسلمانوں کو اس کانگریس میں شرکت کے لئے مدعو کیا جائے۔

۲۔ جہاں تک ممکن ہو متناسب نمائندگی کے اصول پر عمل کیا جائے۔

۳۔ ثقافتی اور تعلیمی انجمنوں، طلبہ کی جماعتوں، امداد باہمی کی انجمنوں اور دوسری اسی قسم کی جماعتوں اور اداروں کے

مسلمان نمائندوں کو شرکت کے لئے بُلایا جائے۔

دوما کے مسلمان مندوبین، نئے قائم شدہ مرکزی محکمہ اور مسلم افواج کے نمائندوں کو بھی شرکت کے لئے مدعو کیا گیا۔ ہونے والی کانگریس کی "کل مسلمانان روس" نوعیت کو اجاگر کرنے کے لئے بجائے کسی ترک کے ایک داغستانی احمد سالک کو ۲۸ ممبروں پر مشتمل مرکزی محکمہ کا صدر چُنا گیا۔ کانگریس کے ایجنڈا میں نئے دستور اور ریاستی نظم ونسق، مسلمانوں کی ثقافتی خود مختاری، تعلیمی مسائل، مسلم انتظامیہ کی تعمیر نو، مزدوروں سے متعلق اور زراعتی سوالات اور نوآبادکاری کے مسئلوں پر بھی غور وخوض شامل تھا۔

روس میں خصوصاً یوروپی حصے میں انتہا پسند معاشرتی نظام کے نظریات کو جو فروغ ہو رہا تھا مسلمانان روس میں بھی اس کے حامیوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ بائیں بازو کے انتہا پسندوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کی وجہ سے جن میں تاتاری، باشقیری اور آذربیجانی نمایاں تھے ان میں اور روشن خیال قوم پرستوں میں جھگڑا فسا د رہنے لگا۔ ان دونوں گروہوں کے درمیان پہلا تصادم صوبۂ قازان کے نظم ونسق پر ہوا۔ دوما کے مسلمان مندوبین کی سیاسی کمیٹی صوبے کے پہلے گورنر کو برقرار رکھنے کے حق میں تھی اس کے برعکس قازان کے سپاہیوں اور مزدوروں کی سوویٹ جس میں اکثریت روسیوں کی تھی اور تاتاری بہت کم تھے، عہد زار کے تمام حکام کو برخاست کر دینا چاہتی تھی۔ مارچ کے اوائل میں اس سوویٹ نے جس میں سوشلسٹ انقلابیوں اور منشویک (MENSHEVIKS) کا زور تھا، اعلیٰ فوجی حکام کی گرفتاری کا مطالبہ کیا اور اس کے فوراً ہی بعد گورنر

کو برخاست کر دیا گیا۔ ان حالات کو دیکھ کر سوشلسٹ تاتاریوں نے ایک خاص مسلم سوشلسٹ کمیٹی منظم کی جس نے مقامی سپاہیوں اور مزدوروں کی سوویٹ سے قریبی رابطہ قائم کیا اور تمام انتہاپسند تاتاری اس کے گرد اکٹھے ہو گئے۔ اس کمیٹی کا پہلا اجلاس ۷ مارچ کو ہوا جس میں تاتار سوشلسٹ ملا نور وحید نے "جفاکش مسلمانوں" کو آنے والے معاشرتی انقلاب میں شمولیت کی دعوت دی۔

قازان اور دوسرے شہروں میں مسلم سوشلسٹ کمیٹیوں کا قیام اور ملا نور وحید اور ان کے رفقا کی تقاریر اس بات کا مظہر ہیں کہ یوروپی روس اور قفقاسیہ کے مسلمانوں کے معاشرتی اور سیاسی اتحاد کا شیرازہ تیزی سے بکھر رہا تھا اور مسلمانوں کا سیاسی محاذ کئی حصوں میں بٹ گیا۔ انتہائی دائیں بازو میں علما اور قدامت پسند شامل تھے جن کا ابھی تک شمالی قفقاز اور وسطی ایشیا میں گہرا اثر و رسوخ تھا۔ درمیان میں متوسط طبقے کے اعتدال پسند روشن خیال افراد تھے جو کہ پہلے "اتفاق" میں شامل تھے اور اب حالیہ قائم شدہ "اتحاد" کے کارکن تھے۔ ان کے قائد دوما کے ممبر صدری مقصودی تھے۔ بائیں بازو میں سوشلسٹ گروہ تیزی سے بڑھ رہا تھا اور اس میں سب سے مقبول سوشلسٹ انقلابیوں کا گروہ تھا جن کی تمام تر توجہ اور دلچسپی بجائے مزدوروں کے قومی اور زرعی مسائل پر مرکوز تھی۔ انتہائی بائیں بازو میں بالشویک اور منشویک گروپ تشکیل میں آرہے تھے لیکن ۱۹۱۷ء کے موسم بہار میں یہ انتہاپسند بازو بہت کمزور تھا۔

ترک سیاسی اتحاد میں ایک بڑی رکاوٹ "مرکزیت" اور "علاقائیت"

کے حامیوں کا اختلاف بھی تھا۔ سرحدی علاقوں کے ترک رہنما خصوصاً "قفقاز" کریمیا، قزاقستان، باشقیریا اور وسطی ایشیا کے مسلمان علاقائی خود مختاری کے اصول کے حامی تھے۔ یہ لوگ چاہتے تھے کہ کریمیا آذربیجان باشقیریا اور دوسرے سرحدی علاقوں کو وفاقی جمہوریۂ روس میں منقسم کر کے علاقائی خود مختاری دی جائے۔ تاتار اس اصول کے خلاف تھے انہوں نے تجویز پیش کی کہ مرکز کے زیر تحت مسلمانان روس کو ثقافتی اور تمدنی خود مختاری حاصل ہو۔ ان کا مقصد ترک مسلمان اتحاد کو برقرار رکھنا تھا اور چاہتے تھے کہ مسلمانان روس کے لئے ایک مرکزی نظم ونسق قائم کیا جائے ان لوگوں کا خیال تھا کہ علاقائی تقسیم آبادی سے قطع نظر کرتے ہوئے کل مسلمان ایک قومی، ثقافتی جماعت میں منظم ہو جائیں جو حکومت روس کے ایک خود مختار ادارے کے تحت ہوں گے۔ تاتاریوں کے لئے جو تمام روس میں تتر بتر تھے صرف اس قسم کا مرکزی نظام مناسب تھا اور اسی طریقہ کار سے وہ خود مختاری حاصل کر سکتے تھے کیوں کہ اس سے مسلمانوں کا نظم ونسق مرکز کے ہاتھ میں آجاتا۔ علاوہ ازیں گذشتہ ایک دو صدی سے تاتار مسلمانوں کی قیادت ونیابت کر رہے تھے اور ان کو امید تھی کہ مرکزی نظم ونسق میں ان کی یہ ممتاز حیثیت برقرار رہ سکے گی۔ عرصۂ دراز سے قازان مسلمانان روس کا ثقافتی مرکز تھا اور تاتاریوں کو خطرہ لاحق ہو گیا کہ علاقائی خود مختاری قائم ہونے سے قازان کی اہمیت جاتی رہے گی۔ قازان کے گرد ونواح میں ایک تہائی تاتار آباد تھے اور بقیہ تمام روس میں پھیلے ہوئے تھے۔ والگا یورال کے خطے میں تاتار آبادی کے ۱۵ فی صد تھے[1]

---

[1] صوبہ قازان کی ۲۰ لاکھ آبادی میں تقریباً ۶۸ ہزار تاتاری تھے۔ اورنبرگ میں ۱۶ لاکھ میں ۹۰ ہزار تاتاری تھے۔ اوفا میں ۲۲ لاکھ کی آبادی میں دو لاکھ تاتاری تھے

مارچ اور اپریل ۱۹۱۷ء کے مہینے ایک نئی کل مسلمانان روس کانگریس کی تیاریوں میں صرف ہوئے۔ اس دفعہ تمام سیاسی، سماجی اور قومی جماعتوں کے نمائندے بلائے گئے۔ اس دوران میں تمام تر مسلم علاقوں میں مقامی کانفرنسیں منعقد ہوئیں جن میں اس کانگریس میں شرکت کے لئے نمائندوں کا چناؤ ہوا اور مختلف مذہبی اور ثقافتی امور پر خیال آرائی ہوئی۔ تاتاریوں اور دوسرے ترک مسلمانوں کے شانہ بشانہ غیر ترک مسلمان از قسم قفقاز کے پہاڑی اور وسطی ایشیا کے تاجک بھی اس کانگریس میں شرکت کے لئے مدعو تھے۔

ہر مقامی کانفرنس میں دو بنیادی نکات زیر بحث آئے۔ اول مذہبی مسلم انتظامیہ کی تجدید اور دوم ہر علاقے کی قومی۔ ثقافتی تنظیم۔ اپریل کے وسط میں سب سے اہم کانفرنس تاتاریوں نے قازان میں منعقد کی اس میں کانگریس کے لئے مندوبین کا انتخاب ہوا اور اوفا میں مسلم مذہبی انتظامیہ کی تجدید اور مرکز کے زیر تحت مسلمانان روس کی ثقافتی خودمختاری کے منصوبوں کی وضاحت کی گئی۔ باشقیر کانفرنس میں نوآبادی کا مسئلہ زیر بحث رہا اور ان طریقوں پر غور و خوص کیا گیا جن سے یہ زمین یوروپی آبادکاروں سے واپس حاصل کی جاسکے ترک تاشقند میں وسطی ایشیا کے مسلمانوں کی کانفرنس میں بھی آبادکاری کا سوال زیرِ بحث آیا لیکن قدامت پسند علما نے اوقاف کے سوال اور عوام اور تعلیمی اداروں میں اسلامی اثر و رسوخ اور فروغ کے مسائل پر زیادہ زور دے کر آبادکاری کو پس پشت ڈال دیا۔ کریمیا میں کانفرنس سمرپول (پرانا نام آق مسجد) (SIMFEROPOL) کے مقام پر ہوئی جس میں کریمیا اور لتھونیا (LITHUANIA) کے مفتی کا انتخاب ہوا اس کے علاوہ

اوقاف کی آمدنی کو کریمیا کے مسلمانوں کی فلاح وبہبودی پر خرچ کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور کریمیا کے تاتاریوں کی ثقافتی اور علاقائی خودمختاری کی جدوجہد کے لئے ۴۵ ممبروں کی ایک انتظامیہ کمیٹی بنائی گئی۔[۱] تاتار رہنماؤں کی ذہنیت کا اندازہ مفتی "ملا جہاں" کے انتخاب سے جو کہ انتہا پسند قومی گروپ "وطن" سے وابستہ تھے اور ترک پسند حلقے کے قریب تھے بخوبی ہوتا ہے۔

پہلی کانگریس یکم مئی ۱۹۱۷ء کو ماسکو میں منعقد ہوئی، اس میں تقریباً ۹۰۰ مندوبین نے شرکت کی جو روس کے تمام علاقوں سے آئے تھے۔ مقبول اور روشن خیال تاتار عالم موسیٰ جار اللہ نے اس کانگریس کا افتتاح کیا۔ تلاوت کلام پاک کے بعد احمد سالک نے جو "عارضی مرکزی محکمہ برائے مسلمانان روس" کے صدر تھے خطبۂ استقبالیہ پڑھا۔ احمد سالک نے جو بائیں بازو کے سوشل ڈیموکریٹ اور پیٹرو گراڈ کے سپاہیوں اور مزدوروں کی سوویٹ کے ممبر تھے اپنی تقریر میں مسلمانوں کی آرزوؤں اور امیدوں کے ساتھ ساتھ نئے انقلابی عزائم کا بھی ذکر کیا۔ انہوں نے "اس تاریخی اجتماع" کے افتتاح اور "زاریت کی زنجیروں سے" رہائی" پر مندوبین کو مبارکباد دی۔

"صدیوں تک ہم نے قومیت کے جس تاریک قیدخانے میں مصیبتیں اٹھائیں وہ اب عوامی انقلاب کے ہاتھوں برباد ہو چکا ہے۔ ہمارا یہ اجتماع صبح آزادی کی کرنوں سے ضیاپاش ہے۔ خوشی کے جن جذبات سے ہمارے دل لبریز ہیں وہ نہ تو ہماری سیاسی ذمے داری کو کم کرا سکتے ہیں اور

---

[۱] تاتار کریمیا کی آبادی کا ۱/۴ حصہ تھے۔

نہ صدیوں کے تاریخی سبقوں کو فراموش کرا سکتے ہیں۔ آج تک عیسائی مسلمانوں کو حقارت کی نظروں سے دیکھتے آئے ہیں اور مسلمانوں کو ادنیٰ ترین شہریوں کی حیثیت دی گئی"۔[1]

خطبۂ استقبالیہ کے بعد مندوبین نے علی مردان (قزاق) اختیاموف، (تاتار) دوست محمد (قزاق) عبداللہ خواجہ، اوزبیگ سالک (داغستان) اور سات دوسرے نمائندوں کو "پریسیڈیم" کا ممبر منتخب کیا۔ اس کے بعد مختلف گروہوں اور سیاسی جماعتوں کے نمائندوں نے تقریریں کیں جن میں جوش وخروش سے ایک جمہوری مستقبل کی امیدیں ظاہر کی گئیں سارج کوٹلیا روسکی (SERGE KOTLIAREVSKY) نے جو غیر عیسائی مذاہب کے محکمے کے سربراہ تھے عارضی حکومت کی طرف سے مندوبین کو خوش آمدید کہا اور مسلمانان روس کی ثقافتی اور سیاسی زندگی کی اصلاح و تجدید کے سلسلے میں ان کی بھاری ذمّہ داریوں کا احساس دلایا۔

علی مردان نے حکومت کے نمائندے کا شکریہ ادا کیا اور انتہائی تلخ لفظوں میں کوٹلیا روسکی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ

"ان کے محکمے کی کارروائیوں کی وجہ سے روس کے لاکھوں مسلمان صدیوں سے خاموش تھے ـــــ لیکن اب آزادی کا سورج طلوع ہو چکا ہے اور اب ہم دنیا کو دکھائینگے کہ پولیس کی بندشوں سے چھوٹنے کے بعد ہم کیا نہیں کر سکتے ہیں

PROCEEDINGS OF THE ALL-RUSSAIN MOSLEM CONGRESS IN MOSCOW. (BÜTÜN RUSYA MÜSÜLMANLARININ) [1]

سب سے پہلے ہم مکمل مذہبی آزادی چاہتے ہیں اور آپ کو
جو حکومت روس کے نمائندہ ہیں جلد از جلد مسلمانوں کے
معاملات کا نظم و نسق ہم کو سونپ دینا چاہیئے۔"[1]

علاوہ ازیں علی مردان نے مسلم اسکولوں کی تعلیمی آزادی پر بھی اصرار کیا حالانکہ انہوں نے نصاب میں روسی زبان کی مناسب درس و تدریس کی ضرورت کا اقرار کیا۔ تاتار سوشلسٹ اسحاق نے اپنی تقریر میں مندوبین کو تین کروڑ مسلمانوں کی طرف ان کے فرائض کی یاد دہانی کرائی اور ان کو "اسلام کی عظمت و شوکت" دو بالا کرنے کی تاکید کی[2]۔ مزدوروں کے ایک نمائندے خواجہ نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بناتے ہوئے کہا کہ

"آزادی مزدوروں کی جد و جہد سے حاصل ہوئی
ہے اور یہ بدقسمتی ہے کہ ہر قوم میں ابھی تک ظالم و مظلوم
طبقات موجود ہیں"[3]

کانگریس کے پہلے دو دن تقاریر اور مختلف انتخابات میں صرف ہوئے اور تیسرے دن مورخہ ۳ مئی سے سیاسی امور پر کارروائی شروع

---

[1] PROCEEDINGS OF THE ALL-RUSSIAIAN MOSLEM CONGRESS IN MOSCOW. (BÜTÜN ROSYA MÜSÜL MANLARININ)

[2] ایضاً

[3] PROCEEDINGS OF THE ALL RUSSIAN MOSLEM CONGRESS IN MOSCOW. (BÜTÜN ROSYA MÜSÜ LMANLARININ)

ہوئی۔ مسلمانوں کی تنظیم وخود مختاری اور مستقبل کے سیاسی ڈھانچے کے اصولوں پر باقیماندہ دنوں میں غور وخوض ہوتا رہا۔

صدری مقصودی اور ان کے تاتاری رفقار نے بڑی احتیاط سے کانگریس کے سامنے مرکزیت کے اصولوں کی وضاحت کی۔ یہ نظریہ کانگریس کے سامنے سب سے پہلے داغستانی احمد سالک نے پیش کیا۔ انہوں نے اپنی زوردار تقریر میں مغربی طاقتوں پر سامراجیت اور اہل اسلام میں افراتفری پھیلانے کا الزام لگایا۔ تقریر کے خاتمے پر انہوں نے خود مختاری کا مسئلہ چھیڑا اور کہا کہ ہر قوم کو آزادی کا حق ہے۔ آگے چل کر انہوں نے کہا کہ

"اس وقت مسلمانوں میں کوئی اہم سیاسی جماعت نہیں ہے جو روس سے علیحدگی کی خواہاں ہو۔"

اس کے بعد انہوں نے وفاق اور خود مختاری کی وضاحت کی۔

"آج کا مقبول ترین سیاسی نظام وفاقی ہے جو علاقائی خود مختاری پر مبنی ہو۔ وفاق کے حامیوں کا دعویٰ ہے کہ اس سے روس کے تمام قومی اور وطنی مسائل حل ہو جائیں گے اور ہر قوم کو اپنی ترقی کا زیادہ سے زیادہ موقع مہیا ہوگا۔"

جرمنی، امریکہ اور آسٹریلیا کے نظام کا تجزیہ کرتے ہوئے انہوں نے اس بات پر شک وشبہ کا اظہار کیا کہ علاقائی خود مختاری سے مسلمانوں کی ضروریات اور خواہشات واقعی پوری ہو سکیں گی۔ کیونکہ اس طرح وہ کئی قومی گروہوں اور علاقوں میں بٹ جائیں گے۔ انہوں نے نمائندوں کو "پھوٹ ڈال کر حکومت" کا اصول یاد دلایا کہ کس طرح اس اصول کے تحت لوگوں کو غلام

رکھا گیا۔ انہوں نے ان باتوں سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ مسلمانان روس کی بھلائی و بہبودی اس میں ہے کہ وہ سماجی معاشرتی اصول پر متحد ہوں نہ کہ علاقائی بنیاد پر اس طرح جغرافیائی تقسیم کے باوجود مسلمانان روس ایک متحدہ اور مرکوز ثقافتی، مذہبی فرقہ بن سکیں گے جس کی اپنی عدلیہ، انتظامیہ اور قانون ساز ادارے ہوں گے اور اس کی قومی پارلیمنٹ "مجلس" کے انتخابات کل مسلمانان روس کریں گے۔

آذربیجان کے رہنما رسول زادہ محمد امین نے وفاق کی حمایت کی اور اس بات سے اتفاق کیا کہ مسلمانان روس کو اپنے سیاسی تعلقات روس سے برقرار رکھنے چاہئیں اور ان سے مل کر ایک عوامی جمہوریہ کی بنیاد ڈال لیں انہوں نے کہا کہ

"خود روسی غیر مرکزیت کے اصول کے قائل ہیں —— میری رائے میں مستقبل میں روس کو ایک وفاقی ریاست ہونا چاہیئے، جس میں خود مختاری علاقے شامل ہوں۔ مستقبل میں روس کے سیاسی نظام میں ہر قوم کو اپنی خواہشات پوری کرنے کا موقع مہیا ہونا چاہیئے اور ان میں سے ہر ایک کا اپنا وطن ہو —— روس کے اندر رہ کر تمام مسلم اقوام اپنا ثقافتی اور سماجی وفاق قائم کر سکتی ہیں —— مختصر یہ کہ میری رائے میں آذربیجان داغستان ترکستان اور قزاقستان وغیرہ کی خود مختار ریاستیں قائم کی جائیں کیونکہ ان میں سے ہر قوم کی اپنی خصوصیات ہیں۔ ہر خود مختار ریاست اپنے مقامی اور قومی نظم ونسق کی ذمہ دار ہو۔ ان ریاستوں کی مذہبی اور ثقافتی بہبودی کے لئے کل

روس کی ایک مسلم کونسل قائم کی جائے[۱]۔"

مرکزیت کے حامی جن میں اکثریت تاتاریوں کی تھی اور جن کی قیادت صدری مقصود کر رہے تھے 'رسول زادہ کی قومی علاقائی خود مختاری کے منصوبے پر اس قدر چراغ پا ہوئے کہ وہ اپنے قفقازی رفقا کے ساتھ جن کی قیادت سالک کر رہے تھے اجلاس چھوڑ کر باہر نکل گئے اور قرارداد پر رائے شماری نہ ہوسکی۔ مرکزیت اور علاقائیت کے حامیوں میں مزید نااتفاقی روکنے کے لئے "پریسیڈیم" نے رسول زادہ اور سالک کی قراردادوں کو ایک قانون ساز کمیشن کے حوالے کر دیا۔ تاکہ ان پر مزید غور و خوض ہو سکے۔

۷ رمئی کو قزاق نمائندہ دوست محمد نے بحث کا آغاز کرتے ہوئے مرکزیت کی مخالفت کی اور تاتاریوں پر مرکزیت کی آڑ میں اقتدار و غلبہ حاصل کرنے کا الزام لگایا۔ ترکستان کے نمائندے عبداللہ خواجہ نے بھی دوست محمد اور رسول زادہ کی حمایت کی۔ انہوں نے اس سلسلے میں امریکہ کی مثال پیش کی اور کہا کہ علاقائی خود مختاری سے مسلمانوں کی سالمیت پر کوئی اثر نہیں پڑیگا۔ کیوں کہ ہر ریاست کے دروازے مسلمانوں کے لئے کھلے رہیں گے۔ انہوں نے آگے چل کر روس اور ترکی کے مسلمانوں کی مثال دی جو سیاسی اور جغرافیائی تقسیم و حدود کے باوجود ایک دوسرے سے ہمیشہ نزدیک رہے[۲]۔ حرف

---

[۱] PROCEEDINGS OF THE ALL RUSSIAN MOSLEM CONGRESS IN MOSCOW. (BÜTÜN ROSYA MÜ SÜLMANLARININ)

[۲] ایضاً

ایک تاتار مندوب خواد تکتار نے مرکزیت کی مخالفت کی۔ انہوں نے اپنے تاتاری رفقا کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ اگر مرکزیت کے اصول کو تسلیم کر لیا گیا تو وسطی ایشیا کے مندوبین اس کانگریس سے علیحدہ ہو جائیں گے جس سے مسلمانوں کے مفاد کو ناقابل تلافی نقصان پہنچے گا۔ فواد نے اپنے رفقا سے کہا کہ ان کو اپنے قول وفعل سے یہ ثابت کر دینا چاہیئے کہ وہ تاتاریوں کے مفاد کے لئے نہیں بلکہ مسلمانوں کی سالمیت اور خود مختاری کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں[۵۱]۔

باشقیریا کے احمد ذکی ولیدی نے بڑے شد ومد سے علاقائی خود مختاری کی حمایت کی۔ انہوں نے کہا کہ

"ہم کو یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ روس میں صرف ایک مسلمان قوم نہیں بستی ہے بلکہ مسلمانوں میں ترک اور غیر ترک دونوں گروہ شامل ہیں جن میں سے ہر ایک کی اپنی زبان اپنی جنوبی گروہوں میں منقسم ہیں اور ان میں سے ہر ایک کی اپنی زبان، اپنی ثقافت اور اپنی تاریخ ہے۔ بعض علاقوں میں ترک آبادی ۶۰ سے ۹۶ فیصدی تک ہے۔ اگر ہم قومی خود مختاری چاہتے ہیں تو اس کی بنیاد تاریخی اور نسلی اساس پر ہونی چاہیئے۔

مندوبین نے ولیدی کی اس تقریر کو بہت سراہا اور علی مردان نے

---

۵۱ PROCEEDINGS OF THE ALL RUSSIAN MOSLEM CONGRESS IN MOSCOW. (BUTUN ROSYA MU SULMANLARININ)

ان کو مبارک باد پیش کی۔

ترکستان، قزاقستان اور قفقاز کے قدامت پسند مندوبین وفاقی یا علاقائی خود مختاری کی موافقت میں تھے لیکن تمام تر تاتار مرکزیت کے حق میں تھے ایک تاتار نمائندے ابراہیم ہتاسو نے کہا کہ

"مسلمانان روس کی علاقائی تقسیم سے مختلف سیاسی پارٹیوں کو یقیناً فائدہ پہنچے گا لیکن عوام کو نظم ونسق کے اخراجات اٹھانے پڑیں گے لہٰذا مسلمانوں کو متحد ہو کر مزدور طبقے سے تعاون کرنا چاہیئے۔"

ابراہیم کی اس تقریر پر بڑا ہلڑ ہنگامہ ہوا اور جلسے کی کارروائی بمشکل تمام جاری رکھی جاسکی۔

تاتار مندوب اسحاقی نے رسول زادہ اور زکی ولیدی کی علاقائی اور لسانی بنیادوں پر خود مختاری کے منصوبے پر کڑی نکتہ چینی کی اور بتایا کہ اگر اس اصول پر عمل کیا گیا تو صرف قفقاز میں ۴۸ اور وسطی ایشیا میں ۱۲ خود مختار ریاستیں قائم ہو جائیں گی۔ اس کے بعد احمد سالک نے پھر تقریر کی اور کہا کہ علاقائی خود مختاری پر عمل کرنے سے اقتدار ترکستان کے امرار طبقے کے ہاتھوں میں آجائے گا۔ اس کے برعکس عارضی حکومت میں روسی سوشلسٹوں کی اکثریت ہونے کی وجہ سے مرکزی نظام حکومت میں مزدور پیشہ اور کسانوں کو زیادہ نمائندگی اور حقوق حاصل ہوں گے کیوں کہ یہ حکومت مسلمانوں کے ادنیٰ طبقے کی بھی سرپرستی کرے گی۔ ان کی رائے میں مرکزی جمہوریہ روس کے نظم ونسق میں مسلمان بھی شریک ہوں گے اور تب ہی وہ اپنی ثقافتی خود مختاری کے منصوبوں کو عملی جامہ

پہنا سکتے ہیں۔

خواتین مندوبین میں سے بیشتر نے مرکزیت کی حمایت کی اور فاطمہ احمد نے سالک کی قرارداد کی حمایت کرتے ہوئے کہا کہ صرف مرکزی نظم ونسق ہی آزادی نسواں کی ضمانت کر سکتا ہے خصوصاً مشرقی صوبوں میں جہاں ابھی تک عورتیں شوہروں کے ہاتھ فروخت کی جاتی ہیں اور ان کے ساتھ جانوروں سے بھی بدتر سلوک ہوتا ہے۔ انہوں نے اس امر پر بھی احتجاج کیا کہ مسلمانان قفقاز کی گذشتہ کانفرنس میں جو باکو میں منعقد ہوئی تھی اور جو کہ روس کا سب سے ترقی یافتہ مسلم شہر سمجھا جاتا ہے عورتوں کے نمائندوں کے ساتھ بدسلوکی کی گئی، ان کو تقریر کرنے کی اجازت نہیں دی گئی اور بالآخر ان کو اجتماع سے نکال دیا گیا۔

مسلمانان روس کی خود مختاری کے سوال پر آخری رائے شماری انتہائی جذباتی، مضطرب اور بد اعتمادی کے ماحول میں ہوئی۔ انتخابی صندوق دوست محمد اور الیاس الکن کی تحویل میں رکھے گئے۔ رسول زادہ کی قرارداد کو سالک [illegible]ی اپنی ز[illegible] ۲۷۱ ووٹوں کے مقابلے میں ۴۴۶ ووٹ حاصل ہوئے [illegible]
ہیں [illegible] کے خلاف مرکزیت کے حامیوں کو شکست ہوگئی۔ اس قرارداد کی س[illegible] اور اس طرح [illegible] کہ عارضی حکومت کو مسلمانوں کے سیاسی لائحہ عمل کے [illegible] عارشات کا متن [illegible]ب ذیل تھا۔

[illegible] طور پر بھیجا گیا [illegible] اور وفاقی اصولوں پر خود مختار جمہوریتوں کا [illegible]
[illegible] قومی، علاقا[illegible]

۲۔ [illegible] ن کا اپنا علحدہ وطن نہیں ہے ان کو قومی اور ثقافتی [illegible] مختاری حاصل ہو۔

۲۔ مسلمانانِ روس کی ثقافتی، تمدنی اور دینوی امور کی نگرانی اور بند وبست کے لئے مرکز میں ایک مسلم انتظامیہ قائم کی جائے۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ خود مختاری کے متضاد منصوبوں کے باوجود سب سے نزاعی مسئلہ آزادیٔ نسواں ثابت ہوا اور اس پر خوب گرما گرم تقریریں ہوئیں۔ فاطمہ لوطاش (یہ اولین اشتراکی خواتین میں سے تھیں) نے اس سوال پر بحث کا آغاز کیا اور مسلم خاندان میں عورت کی کمتر اور حقیر حیثیت پر سخت احتجاج کیا، انہوں نے ایک قرار داد پیش کی جس میں مطالبہ کیا گیا کہ مسلم معاشرے میں عورتوں کو مکمل سیاسی اور معاشرتی آزادی دی جائے اور تعداد ازدواج پر پابندی عائد کی جائے۔ اجتماع میں جتنے آزاد خیال مندوبین تھے ان کی حمایت سے یہ قرار داد بھاری اکثریت سے منظور ہو گئی لیکن ۱۰ مئی کو قدامت پسندوں نے اس قرارداد پر دوبارہ غور و خوض کرنے کا مطالبہ کر دیا۔ امام عبداللہ حاجی نے وسطی ایشیا کے ایک کروڑ مسلمانوں کے نام پر کہا کہ

"اتنا اہم اور سنگین مسئلہ ایک دن میں حل نہیں کیا جا سکتا اور یہ قرار داد اسلام کی اخلاقی بنیاد کے خلاف ہے۔"

تقریباً دو سو اماموں نے کانگریس کو ایک احتجاجی مراسلہ بھیجا جس میں اس قرار داد پر نظر ثانی کرنے کو کہا گیا۔ وسطی ایشیا اور قفقاز کے بہت سے نمائندوں نے بھی اس مطالبے کی حمایت کی۔

کانگریس نے مسلم مذہبی انتظامیہ کو حکومت کی نگہداشت سے علاحدہ

کرنے اور تنظیم نو کے منصوبے کو بلا کسی بحث و مباحثہ کے منظور کر لیا۔ اس نئے منصوبے کے مطابق مسلمانوں کی ایک خاص اسمبلی کو مذہبی انتظامیہ کے لئے ایک مفتی اور ۶ قاضیوں کا انتخاب کرنے کا اختیار دیا گیا۔ حالانکہ حکومت روس نے ابھی یہ منصوبہ منظور نہیں کیا تھا لیکن کانگریس نے عالم جان بارودی کو، جو کہ آزاد خیال تاتاریوں علماء کے قائد تھے اور جنہوں نے ۱۹۰۵ء سے لے کر اب تک مسلمانوں کی ہر سیاسی کانفرنس میں شرکت کی تھی، نیا مفتی منتخب کر لیا۔ ۹۰۰ مندوبین میں سے صرف ۳۰۰ نے ان کے حق میں ووٹ دیئے، ۲۵۰ مندوبین نے مخالفت کی اور بقیہ نے رائے شماری میں حصہ نہیں لیا۔ ان اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ روشن خیال تاتار علما کو قدامت پسندوں کا سخت مقابلہ درپیش تھا۔

مسلمانوں کے طریق تعلیم کی تنظیم نو کا مسئلہ بھی بلا کسی مزاحمت کے حل ہو گیا اس مسئلے پر جو کمیشن مقرر کیا گیا تھا اس نے واضح کر دیا کہ مسلمانوں کی تعلیم کلی طور پر ایک خود مختار قومی ادارے کے زیر نگرانی ہو گی۔ مسلم اسکولوں کا نصاب تعلیم روسی اسکولوں کے متوازی اور مطابق رکھا گیا تاکہ مسلمانوں کو روسی اداروں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے خاص امتحان نہ پاس کرنے پڑیں۔ اس قرارداد کا تیسرا حصہ بڑا اہم تھا جس میں تاتاری اور اتحاد ترک کے حامیوں کے اصرار پر کہا گیا کہ چھوٹی بڑی جماعتوں میں مقامی قومی زبان میں تعلیم دی جائے اور سیکنڈری وہائی اسکولوں میں عثمانی ترکی لازمی قرار دی جائے۔ روسی زبان کی تعلیم بھی لازمی قرار دی گئی لیکن قومی اور عثمانی زبانوں کے مقابلے میں اس کو کم حیثیت دی گئی۔

کانگریس کے بیشتر مندوبین نے جنگ جاری رکھنے کی مخالفت کی ، احمد سالک نے امور خارجہ پر تقریر کے دوران مندوبین کی اکثریت کے خیالات کی بہترین ترجمانی کی اور تقریر کے دوران میں ان کی بے پناہ مقبولیت برسر عام آئی کسی اور نمائندے کی تقریر کو اس قدر نہیں سراہا گیا جتنا کہ احمد سالک کی تقریر کا پُرجوش خیر مقدم ہوا۔ انہوں نے اپنی تقریر میں یوروپی شہنشاہیت پر حملے کئے اور اتحادیوں پر ترکی کے حصے بخرے کرنے کی سازش کا الزام لگایا۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ انگلینڈ، فرانس، اٹلی اور روس کے مابین وہ تمام خفیہ معاہدے اور دستاویزات فوراً شائع کی جائیں جن میں ان طاقتوں نے سلطنت عثمانیہ کے حصے الحاق کرنے کے منصوبے بنائے ہیں۔ سالک نے تجویز کیا کہ تاوان جنگ وصول کئے بغیر یا نئے علاقے الحاق کئے بغیر صلحنامے پر دستخط کئے جائیں۔ انہوں نے کہا کہ

"دنیا میں موجودہ ہلاکت وتباہی کا سبب یوروپ ہے۔ یوروپ کا حکمراں طبقہ تمام بنی نوع انسان کو غلام بنانے پر تُلا ہوا ہے — مسلم ممالک پہلے ہی یوروپی شہنشاہیت کا شکار ہو چکے ہیں — چنانچہ ہمیں اس سامراجی جنگ کے خلاف پُرزور احتجاج کرنا چاہیئے۔"

احمد سالک کے دلائل اتفاق رائے سے منظور ہو گئے اور طے پایا کہ اسٹاک ہوم میں ہونے والی "امن کانگریس" کو اس کی کارروائیوں پر تہنیت کا پیغام بھیجا جائے۔ سالک کی تقریر نے اجلاس میں بڑا جوش و خروش پیدا کر دیا اور ان کو بے انتہا داد دی گئی۔

اجلاس کے آخری دن ۱۱ مئی کو طے پایا کہ کل روسی قانون ساز

اسمبلی کے انتخابات میں ایک متحدہ مسلم پارٹی انتخاب لڑے۔ اس امر کی بھی سفارش کی گئی کہ روس کی سوشلسٹ پارٹیوں سے تعاون حاصل کیا جائے۔ خود مختار مسلم انتظامیہ کے قائم ہونے تک مسلمانوں کی سیاسی حکمت عملی ایک عارضی قومی شوریٰ کے ذمے کی گئی۔ تاتاریوں اور اتحاد ترک کے حامیوں نے تجویز کیا کہ اس شوریٰ کا صدر مقام قازان ہو۔ اس پر بڑا ہنگامہ ہوا اور یہ تجویز مسترد ہوگئی مزید قرار پایا کہ اس شوریٰ کا نام "ملی مرکزی شوریٰ" ہو اور اس کا صدر مقام پٹروگراڈ مقرر ہوا۔

قومی خود مختاری اور رسول زادہ کا متحدہ ترک قوم کا خواب پورا نہ ہوسکا اور جلد ہی ترک اقوام میں اتحاد کے بجائے نفاق اور پھوٹ نے ڈیرا ڈال دیا۔ ملی مرکزی شوریٰ میں اختلافات پیدا ہوگئے اور وہ بے اثر ثابت ہوئی۔ روس کے دوسرے لوگوں کی طرح مسلمانان روس بھی سیاسی بھول بھلیوں میں بھٹک کر رہ گئے۔ ہر ایک آزادی اور مساوات کا اس قدر خواہاں تھا کہ اس کی جستجو میں معاشرتی اور ملکی تعمیر کے مواقع گنوا بیٹھا۔ انفرادی جمہوریت جلد ہی طوائف الملوکی میں تبدیل ہوگئی، اصولوں کی پابندی اور رہنماؤں کی قیادت بے معنی ہوگئی، آزادی کے جنون میں لوگ اپنے فرائض بھول گئے اور تمام معاشرتی اور انتظامی بندھن ٹوٹ گئے۔

جون میں شوریٰ میں مختلف قومی گروہوں کے اختلافات سنگین صورتِ حال اختیار کر گئے اور تاتاریوں اور قزاقوں میں اختلافات بڑے وسیع ہوگئے قزاق اپنی علاحدہ کانگریس منعقد کرنا چاہ رہے تھے

لیکن تاتاریوں نے اس کی مخالفت کی اور کہا کہ کسی مقامی کانگریس کے بجائے دوسری مسلم کانگریس بلائی جائے صدری مقصود کا[1] خیال تھا کہ شوریٰ کو مسلمانوں کے کُل انتظامی امور کا اختیار رہے۔ علاقائی خود مختاری کے حامیوں نے اس نکتے سے اتفاق نہیں کیا اور صدری مقصود کی کوششوں کے باوجود مقامی تحریکوں کو فروغ ہوتا رہا دوسری مسلم کانگریس کا اجلاس قازان میں منعقد ہوا جس میں ایک نمائندے نے شکایت کی کہ شوریٰ کے گذشتہ اجلاس میں ۳۰ میں سے صرف ۱۵ ممبروں نے شرکت کی اور اس کی ۵ ممبروں پر مشتمل مرکزی کمیٹی میں صرف ۳ ممبر کام کر رہے ہیں۔ خود شوریٰ میں نفاق اس حد تک بڑھ چکا تھا کہ جب روس کی عارضی حکومت نے ترکستان کی کمیٹی کے لئے صدر نامزد کرنے کو کہا تو کسی مسلمان پر اتفاق نہ ہو سکا اور یہ عہدہ ایک روسی کو تفویض کیا گیا۔ عارضی حکومت اور روس کی سیاسی پارٹیوں سے لین دین میں بھی شوریٰ کو کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی۔

شوریٰ اور عارضی حکومت کے درمیان قابل ذکر مذاکرات جولائی میں ہوئے جبکہ پیٹرو گراڈ کی فوج نے اشتراکیوں کی حمایت میں مظاہرے کئے اور کیڈٹ پارٹی کے وزراء مستعفی ہو گئے۔ شوریٰ نے پرنس لووف کے ساتھ تعاون کرنے کی کوشش کی جو اس وقت سربراہ حکومت تھے۔ اسحاقی اور سالک کی قیادت میں شوریٰ نے حکومت کو مسلمان جماعتوں اور فوجیوں کے تعاون کا یقین دلایا۔ ان کا خیال تھا کہ اس کے صلے میں

A. POPOV: ISTORIIA REVOLIUTSII. ۱ے.

مخلوط حکومت میں مسلمانوں کو دو وزارتی نشستیں مل جائیں گی ۔
پرنس لووف (PRINCE LVOV) نے اس پیشکش پر ہمدردانہ غور وخوض کیا وہ مظاہروں اور ہنگاموں سے تنگ آچکے تھے لیکن جب انہوں نے پٹروگراڈ کی سوویٹ کے صدر سے مشورہ کیا تو انہوں نے مسلمانوں سے تعاون کی پیش کش کو اس بنا پر مسترد کر دیا کہ حکومت کی تشکیل قومیت کے اصول پر نہیں ہوسکتی بلکہ سیاسی جماعتوں کے تعاون سے ہونی چاہیئے دوسرے لوگوں نے بھی مسلمانوں کے اشتراک کی مخالفت کی چنانچہ جب کرنسکی نے مخلوط حکومت قائم کی تو اس میں کوئی بھی مسلمان شامل نہیں تھا[۵۱]

شوریٰ اور احمد سالک کا تذکرہ آخری مرتبہ ستمبر کے جمہوری اجتماع میں ملتا ہے جو پیٹروگراڈ میں سوشلسٹ پارٹیوں نے کیا۔ ایک انتہائی جذباتی تقریر میں سالک نے اجتماع سے قزاق اور قرغیزیا کے لوگوں کے تحفظ کی درخواست کی۔ انہوں نے قزاقستان کے میدانوں میں آباد کاری بند کرنے کی بھی درخواست کی لیکن سوشلسٹ مندوبین نے جو اپنی اپنی مصیبتوں میں پھنسے ہوئے تھے سالک کی درخواست پر کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ اس رویہ سے مایوس ہوکر سالک نے تھوڑے عرصے کے لئے بالشویک سیاست دانوں اور اسٹالن سے جن سے وہ قفقاز سے واقف تھے رابطہ بڑھایا لیکن یہ دوستی تھوڑے ہی دن قائم رہی۔
قازان میں منعقد شدہ مسلمانان روس کی دوسری کانگریس میں آپس

---

۵۱ A. ISKHAKOV MEMOIRS

کے اختلافات کی وجہ سے صرف والگا اور یورال کے نمائندوں نے شرکت کی، آذربیجان، قزاقستان اور وسطی ایشیا کے نمائندوں نے تاتاریوں سے عدم تعاون کے اظہار میں اس کانگریس میں شرکت سے انکار کر دیا۔ اس کانگریس میں باشقیریوں کا بھی تاتاریوں سے جھگڑا ہو گیا اور وہ واپس اوفا چلے گئے۔ انہوں نے اس امر پر سخت احتجاج کیا کہ تاتاری انہیں ایک علاحدہ ترک قوم ماننے پر تیار نہیں ہیں۔ اس کے باوجود اس کانگریس نے تمام فیصلے "کل مسلمانان روس و سائبیریا" کے نام پر کیئے۔ اسی دوران میں قازان میں دو اور کانگریسیں، دینوی اور فوجی، بھی ہو رہی تھیں اور ان کے نمائندگان بھی اس دوسری کانگریس کے اجلاس میں شریک ہو گئے۔ اس مشترکہ اجلاس میں مسلمانان وسطی ایشیا و سائبیریا کی ثقافتی خودمختاری کا اعلان سرعام کیا گیا۔ اس اعلان پر بڑے جوش و خروش کا اظہار ہوا اور "والگا۔ یورال زندہ باد" کے نعرے بلند کیئے گئے۔

ثقافتی خودمختاری کا منصوبہ اور مسودہ صدری مقصودی نے تیار کیا تھا جو مرکزیت کے حامی تھے۔ اس کی بنیاد قومی اور تمدنی خودمختاری کے اصولوں پر تھی۔ منصوبے کے مطابق :۔

۱۔ یورپی روس اور سائبیریا کے مسلمان ایک علحٰدہ قومی گروہ تھے جن کو اپنے عوام پر دینوی اور تمدنی امور میں پورا پورا قانونی حق حاصل تھا۔

۲۔ خودمختار علاقے کا نظم و نسق ایک مجلس ملی کے ذمے ہوگا جس کا انتخاب تاتاری علاقوں کی مقامی مجالس کریں گی۔ جن

علاقوں یا اضلاع میں تاتاری اکثریت تھی وہاں ۵۰۰۰ پر ایک نمائندہ مقامی مجلس میں منتخب ہوگا۔ تاتاری علاقوں میں ثقافتی اور تمدنی امور کا انتظام مجلس ملی کے ہاتھوں میں ہوگا۔ لیکن انتظامیہ اور عدلیہ کے امور روسی حکام کے اختیار میں ہوں گے۔ مجلس ملی کا غیر مسلموں پر کسی قسم کا اختیار نہ ہوگا۔

۳۔ مسلم خود مختاری کا نظم و نسق مسلم مذہبی انتظامیہ اور تعلیم و خزانہ کے خصوصی محکموں کے ہاتھوں میں ہوگا۔ محکمہ خزانہ مسلمانوں کی ثقافتی ضروریات کی دیکھ بھال اور اسکولوں کی تنظیم کا ذمہ دار ہوگا۔ مسلمانوں کی آبادی کے تناسب کے لحاظ سے مالی امداد سرکاری اداروں یا مسلمانوں پر خصوصی ٹیکس سے حاصل کی جائے گی۔ محکمہ تعلیم مسلم طریق تعلیم کی نگرانی کرے گا۔

۴۔ یوروپی روس اور سائبیریا کے مسلمانوں کو تناسب کے اعتبار سے روسی پارلیمنٹ میں نمائندگی دی جائے اور حکومت میں ایک سکریٹری جس کا درجہ وزیر کے برابر ہو مسلم امور کی دیکھ بھال و نگہداشت کے لئے مقرر کیا جائے۔

اس منصوبے کے تحت آزاد خود مختار علاقے قائم کئے بغیر مسلمانان روس کی ثقافتی و تمدنی خود مختاری کی ضمانت ہوسکے گی اور ان کی مرکزی انتظامیہ کو یوروپی روس و سائبیریا کے کل مسلمانوں پر کلی اختیار ہوگا۔ کانگریس نے اپنے ان فیصلوں سے عارضی حکومت کو آگاہ کر دیا۔ اور قانون ساز

اسمبلی کے انعقاد کا انتظار کئے بغیر ثقافتی خودمختاری کے لئے اقدامات اٹھانے کا اعلان کردیا۔ کانگریس نے ۱۹۱۷ء کے موسم خزاں میں مجلس ملی کا اجلاس باشقیریا کے تاریخی شہر اوفا میں طلب کرنے کا فیصلہ کیا۔ ایک قرارداد کے ذریعہ دن میں ۸ گھنٹے کام اور جاگیروں کو قومی ملکیت میں لینے کی سفارش کی گئی۔ ساتھ میں روس کی سوشلسٹ جماعتوں کے ساتھ تعاون کا مشورہ بھی دیا گیا۔

دوسری کانگریس کے ساتھ ساتھ جولائی کے وسط میں مسلمانان روس کی فوجی کانگریس بھی قازان میں منعقد ہوئی جس میں زیادہ تر نمائندے اور قازان میں متعین مسلم افواج سے تھے۔ اس کانگریس نے حربی شوریٰ اور مسلمانوں کے علاحدہ فوجی دستے قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ حربی شوریٰ کے صدر الیاس آلین اجلاس سے قبل ہی مسلمانوں کی علاحدہ فوج بنانے کے لئے کرینسکی سے درخواست کرچکے تھے چنانچہ جولائی میں اس درخواست کا اعادہ کیا گیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا گیا کہ اگر حکومت نے اجازت نہ دی تو حربی شوریٰ حکومت کے فیصلے کو تسلیم نہیں کریگی کیوں کہ موجودہ حالات کی نزاکت دیکھتے ہوئے مسلمانوں کے لئے اپنی علاحدہ فوج کا قیام اشد ضروری ہے لیکن حکومت نے یہ درخواست منظور کرلی اور جلد ہی تمام مسلمان فوجیوں کو ایک خاص دستے میں منتقل کرکے جنرل سلیمان کے زیر کمان رومانیہ کے محاذ پر بھیجد یا گیا۔

انقلاب اکتوبر سے قبل یہ آخری کانگریس تھی اور ابھی مجلس ملی کے

۱۔ ZAVERAND

اجلاس کی تیاریاں ہو ہی رہی تھیں کہ بالشویک انقلابیوں نے عارضی حکومت کا تختہ الٹ دیا۔

اکتوبر ۱۹۱۷ء میں واقع ہونے والے انقلاب کے نتیجے میں پٹروگراڈ کا مرکزی نظم ونسق اور نظریاتی طور پر کل روس پر لینن اور ان کے سوویٹ رفقا کا اقتدار قائم ہو گیا۔ اول اول اس تبدیلی کا تاتاریوں کی وطن پرست سرگرمیوں پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ حالانکہ صرف تھوڑے ہی سے تاتاری اور آذربیجانی لینن اور مارکس کے فلسفے سے واقف تھے پھر بھی مسلمانوں کا ردعمل معاندانہ نہیں تھا البتہ آزاد خیال متوسط طبقہ جس کے رہنما صدری مقصودی تھے "جفاکش طبقے" کی "فتح" کو شک وشبہ کی نظروں سے دیکھ رہا تھا لیکن اس طبقے کا اثر ورسوخ ختم ہو چلا تھا۔ متعدد مسلمان سیاست دان بالشویک اعلانات کو ہمدردی کی نظروں سے دیکھ رہے تھے اور قومی مسائل پر ان کے افکار وخیالات کو درست سمجھتے تھے دراصل سوائے بالشویک کے کسی اور سیاسی پارٹی نے قومی مسائل کو حل کرنے پر توجہ ہی نہیں دی تھی۔ لینن نے ۱۴-۱۹۱۳ء ہی میں مختلف مقالات اور اعلانات کے ذریعے اس بات کی تلقین کی تھی کہ قومیت اور وطن پرستی کے جذبات کا احترام رکھا جائے۔ لینن کے دوررس ذہن نے یہ نکتہ بہت پہلے بھانپ لیا تھا کہ اشتراکیت کو کامیاب بنانے کے لئے غیر روسی اقوام کا تعاون بیحد فائدہ مند ہوگا چنانچہ شروع ہی سے ان عناصر کی دوستی حاصل کرنے کا منصوبہ عمل میں لایا گیا۔ ۱۹۱۳ء میں بالشویک پارٹی نے ایک قرارداد منظور کی جس میں کہا گیا کہ

"روس میں جتنی اقوام آباد ہیں ان سب کو علحدگی اور آزادی

کا پورا پورا حق حاصل ہونا چاہیئے۔ ان کو اس حق سے محروم رکھنا یا اس میں رکاوٹیں کھڑی کرنا جبری الحاق کے مترادف ہوگا۔"

قرارداد کی یہ شق بڑی مشہور ہوئی لیکن اسی میں آگے چل کر لینن نے کہا (اور جس پر لوگوں نے خاص توجہ نہیں دی) کہ

"اقوام کی علاحدگی کا حق کسی ملک و ملت کی ضروریات سے خلط ملط نہیں کیا جا سکتا اور عوام الناس آزادانہ طور پر اس بات کا فیصلہ کریں گے کہ مجموعی طور پر سوشل جمہوریت اور طبقاتی جدوجہد کے لئے کونسی بات منفعت بخش ہے۔"

مطلب یہ کہ لینن کے خیال میں حق خود اختیاری کا فیصلہ اقوام خود نہیں کر سکتیں بلکہ کمیونسٹ پارٹی کی ضروریات اور فیصلوں پر اس کا انحصار تھا۔

۱۹۱۷ء میں سوئٹزرلینڈ سے روس واپس آنے پر لینن نے اپنی پارٹی کے قومی لائحہ عمل کا از سر نو پرچار شروع کیا اور اپریل ۱۹۱۷ء میں جبکہ مسلمانان روس کی پہلی کانگریس شروع ہونے والی تھی ۱۹۱۳ء کی قرارداد اور حق خود اختیاری کا اعادہ کیا گیا اور اس دفعہ لینن نے خود اختیاری اور خود مختاری کی مزید وضاحت کی۔ انہوں نے "ثقافتی اور تمدنی خود مختاری" کے منصوبے کے خلاف سخت احتجاج کیا کیوں کہ ان کے خیال میں اس سے مزدور پیشہ اور متوسط طبقے کے درمیان تعلقات مستحکم ہونے کا امکان تھا جبکہ سوشل جمہوریت کا مقصد دنیا میں ادنیٰ طبقے کے بین الاقوامی تمدن کو فروغ دینا تھا۔

سیاسی اغراض و مقاصد کو مدنظر رکھتے ہوئے حق خود اختیاری کی اس وضاحت کو زیادہ تشہیر نہیں دی گئی بلکہ جون میں بالشویک فوجی تنظیم کے اجلاس میں حق خود اختیاری کے دعویٰ کو بہت ہوا دی گئی ساتھ ہی صلح، سوویٹ کے ہاتھوں میں انتقال حکومت اور جاگیروں کی فوری ضبطی کا مطالبہ بھی کیا گیا۔ تاتاریوں میں مُلا نور وحید نے اس اشتراکی نظریئے کی بڑی نشرو اشاعت کی۔

نومبر ۱۹۱۷ء میں اقتدار اُس سوویٹ کے ہاتھوں میں، جو کہ مزدوروں اور کسانوں کی عارضی حکومت کے نام سے مشہور تھی، آگیا اور اس نے مشہور عام "اعلان حقوق برائے عوام الناس روس" شائع کیا جو لینن اور اسٹالن کی مشترکہ کوششوں کا نتیجہ تھا۔[۵۱] اس میں کہا گیا:۔

۱۔ مساوات اور حکومت روس کے عوام کا حق ہے۔

۲۔ روس کے عوام کو حق خود اختیاری حاصل ہے۔ اور اگر وہ چاہیں تو علاحدگی آزاد ریاستیں قائم کرسکتے ہیں۔

۳۔ تمام قومی اور مذہبی مراعات اور پابندیاں ختم ہوگئیں

۴۔ روس میں بسنے والی تمام قومی و نسلی اقلیتوں کو اپنی ترقی کے لئے پورے پورے مواقع فراہم ہوں گے

اس حکومت نے قومیت اور وطن پرستی کے مسائل پر خاص توجہ دی اور اسٹالن کی سربراہی میں ایک خاص محکمہ "برائے امور اقوام" قائم ہوا چونکہ اسٹالن کا تعلق جارجیا سے تھا لہٰذا مشرقی صوبوں کے مسائل سے ان کو

---

۵۱ DEUTSCHER: STALIN (LONDON 1949)

خاص دلچسپی تھی۔ نومبر میں اسٹالن کے کہنے پر حکومت نے "روس اور مشرق کے جفاکش مسلمانوں" کے نام ایک منشور شائع کیا جس میں "مسلم کامریڈوں اور رہنماؤں" کو خطاب کیا گیا تھا۔ اس میں دہریت اور مارکس کی تعلیمات کو قطعاً نظرانداز کر کے مسلمانوں کے مذہبی اور قومی جذبات سے اپیل کی گئی۔

"غارت گر لٹیروں کا اقتدار جنہوں نے بنی نوع انسان کو غلام بنا رکھا تھا ختم ہو رہا ہے۔ انقلاب روس کی ضربوں سے غلامی کا نظام شکست ہو رہا ہے۔ جفاکش اور آزاد انسانوں کی ایک نئی دنیا جنم لے رہی ہے ـــــ مسلمانان روس، قرغیزیہ وسطی ایشیا و سائبیریا کے ترک و تاتار اور قفقاز کے کوہستانیو تم سب جن کی مسجدیں اور عبادت گاہیں تباہ و برباد کر دی گئی تھیں اور جن کے عقائد اور رسم و رواج پاؤں تلے روند دیئے گئے تھے ـــــ آج سے تمہارے عقائد، تمہارے نظریات تمہاری قومی و ثقافتی روایات ـــــ سب آزاد ہیں۔ بغیر کسی رکاوٹ کے تم اپنی قومی زندگی کو سنوار سکتے ہو۔ روس کے دوسرے عوام کی طرح تمہارے حقوق کی حفاظت انقلاب کی تمام تر قوت کے ذمّہ ہے۔ یہ انقلاب تمہارا ہے، یہ حکومت تمہاری ہے ـــــ مسلمانان مشرق، ایرانیوں، ترکوں، عرب اور ہندو ـــــ تم میں سے وہ سب جن کی جان و مال، وطن و آزادی یوروپ کے غارت گروں کا شکار تھی، ہمارے پرچم تلے آزادی کی سانس لو۔"

ان اعلانات کی صداقت و خلوص کو ثابت کرنے کے لئے اسٹالن نے چند عملی قدم اٹھائے۔ حضرت عثمانؓ کے ہاتھ کا لکھا ہوا قرآن شریف جو پٹرو گراڈ کے شاہی کتب خانے میں تھا مسلمانوں کے حوالے کر دیا گیا۔ محکمہ برائے امور اقوام کے احکامات پر قازان میں تاتاریوں کی قدیم عمارتیں مقامی مسلم کمیٹیوں کو واپس کر دی گئیں۔ جنوری ۱۹۱۸ء میں اس محکمے کے اندر مسلم امور کے لئے ایک خاص کمیٹی مقرر کی گئی۔ اسٹالن کا ارادہ تھا کہ مسلمانوں کے امور کا انتظام ساجد انگلیچوف کے حوالے کر دیا جائے مگر ساجد نے اچانک تین مشہور مسلم شخصیتوں کو گرفتار کر لیا تاکہ وہ قانون ساز اسمبلی کے انتخابات میں حصہ نہ لے سکیں ان میں داغستان کی جنگِ آزادی کے مشہور رہنما شامل کے بھانجے بھی شامل تھے۔ چنانچہ احمد سالک نے بحیثیت صدر شوریٰ اسٹالن کو مشورہ دیا کہ ساجد کے انفرادی انتظام کے بجائے ایک کمیٹی مقرر کی جائے۔ اسٹالن نے اس مشورے کو قبول کر لیا اور مُلا نور وحید کی صدارت میں ایک کمیٹی برائے امور مسلمین قائم کی۔ ملا نور مشرق میں انقلاب کے پرجوش حامیوں میں سے تھے اور وہ پُرانے سوشل ڈیموکریٹ ہونے کے علاوہ قازان میں مسلم انقلابی ہیڈ کوارٹر کے سربراہ بھی تھے اور وہ مارچ ۱۹۱۷ء سے مسلمانوں کو اس انقلاب میں حصہ لینے پر اکسا رہے تھے۔ کمیٹی کے دوسرے ممبر علیم جان ابراہیم تھے جو تاتار۔ باشقیریا کی علاقائی خود مختاری کے شدید حامیوں میں سے تھے۔ تیسرے ممبر شرف مناطوف تھے جن کے تعلقات ملا نور وحید اور علیم جان ابراہیم سے اکثر و بیشتر کشیدہ رہتے تھے۔

سوویٹ حکومت کے ان اقدامات اور مشاق دہزمند نشرو

اشاعت کی وجہ سے اسلام و اشتراکیت کے حیرت انگیز تعاون کی ایک تحریک ظہور میں آئی۔

لینن کے اقتدار میں آنے کے بعد سب سے زیادہ اہم اور سنگین سیاسی مسئلہ سوویٹ حکومت سے تحریک افتراق تھی جو دن بدن زور پکڑتی گئی۔ تمام روس میں قومی رہنماؤں نے بالشویک حکومت سے علحدگی کی کوششیں شروع کر دیں۔ ان کے خیال میں " اعلان حقوق " سیاسی علحدگی کا کھلا اعلان تھا۔ سب سے پہلے فن لینڈ نے اس حق کو استعمال کیا اور ۶ر دسمبر ۱۹۱۷ء کو اپنی آزادی کا اعلان کر دیا۔ فن لینڈ کی تقلید میں دوسری اقوام نے بھی آزادی کا حق استعمال کرنا شروع کر دیا۔ ۱۱ر دسمبر کو لتھوینیا (LITHUANIA) ۱۲ر جنوری کو لٹویا (LATVIA) ۲۲ر جنوری کو یوکرین اور ۲۴ر فروری کو اسٹونیا (ESTONIA) نے اپنی اپنی آزادی کا اعلان کر دیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ چند اضلاع نے بھی اپنی خودمختاری کا اعلان کر دیا۔ ۱۵ر نومبر ۱۹۱۷ء میں باشقیریوں اور ۱۰ر دسمبر کو قزاقوں نے اپنی آزادی کا اعلان کر دیا۔ وسطی ایشیا کے روسی اور مسلمان عوام نے خوقند کے اجتماع میں اپنی خود مختاری کا اعلان کر دینے کا فیصلہ کیا۔ اس کے فوراً ہی بعد محتاط پسند تاتاریوں نے بھی اعلان کر دیا صرف ماوراء قفقاسیہ نے جس کے روس سے دیرینہ اور پختہ تعلقات تھے اپنا فیصلہ ملتوی رکھا لیکن جرمنی اور ترکی کے دباؤ کے زیر اثر ان لوگوں نے بھی ۲۵ر اپریل ۱۹۱۸ء میں حق خود مختاری کا دعویٰ کر دیا۔

ان خود مختار اور آزاد ریاستوں کی زندگی صرف چند روزہ ہی ثابت

ہوئی کیونکہ سوویٹ حکومت نے پراگندہ حالات کو فوراً بھانپ لیا اور افراتفری اور انتشار کو روکنے کے لئے تاکہ ملک کی سالمیت خطرے میں نہ پڑ جائے لینن کی خود مختاری کی وضاحت کی روشنی میں "عوام الناس کی طبقاتی جد و جہد" کی بقا کے لئے حق خود مختاری کو معطل کر دیا۔



دو ترکمان لڑکیاں



ترک بیلے کا ایک منظر
(تاجکستان)

والگا۔یورال

پیٹروگراڈ میں انقلاب آنے کے ساتھ ہی ساتھ والگا۔یورال خطے میں بھی حکومت کی باگ ڈور بالشویک ہاتھوں میں آگئی۔ اکتوبر کے آخر تک قازان اور اوفا پر ان کا مکمل تسلط ہو چکا تھا۔ قازان میں اشتراکیت کا پرچار بہت پہلے سے ملا وحید کر رہے تھے اور سال کے شروع ہی سے وہاں سیاسی اور فوجی جماعتیں منظم ہو چکی تھیں۔ حربی شوریٰ کی غیر جانبداری کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے قازان میں متعین تاتاری افواج نے نہ تو کرینسکی کی عارضی حکومت کا ساتھ دیا اور نہ اشتراکیوں کی طرفداری کی۔ اوفا میں بھی انتقال حکومت چپ چپاتے ہو گیا اور دونوں مقامات پر سوویٹ اقتدار قائم ہو گیا۔

اس انقلاب کے چند ماہ تک تو مقامی حکام اور مرکزی حکومت کے درمیان تعلقات بڑے خوشگوار رہے مگر اس کے فوراً ہی بعد عجیب و غریب حالات پیدا ہو گئے اور ہر طرف افراتفری پھیل گئی۔ نظم ونسق پر نہ تو اشتراکیوں کا اور نہ مقامی قوم پرستوں کا اثر تھا۔ سوویٹ حکومت نے عملاً مقامی تاتاری نظم ونسق کو تسلیم کر لیا تھا جس کی مثال اس سے ملتی ہے کہ حضرت عثمانؓ کا قرآن پاک مسلم مجلس کے نائب صدر کے

حوالے کیا گیا مگر قانوناً یہ مجلس تسلیم نہیں کی گئی۔

اس مرحلے پر سوویٹ حکومت نے مصلحتاً تاتاریوں اور دوسری اقوام پر اقتدار قائم کرنے کی کوشش نہیں کی کیوں کہ اس وقت سوائے ماسکو اور پٹروگراڈ کے سوویٹ افواج کہیں اور موجود نہ تھیں۔ دراصل خود مختار تاتاریہ سوویٹ اقتدار سے کہیں زیادہ مضبوط تھا کیوں کہ حربی شوریٰ کے پاس ہزاروں مسلمان فوجی تھے جو انقلاب سے قبل والگا یورال خطے میں تعینات کئے گئے تھے۔ اس کے علاوہ ہزاروں مسلمان فوجی محاذ جنگ سے لوٹ رہے تھے اور ان سب کی کمان حربی شوریٰ کے ہاتھوں میں تھی تاتار سوشلسٹ اپنے بالشویک رفقا کی کامیابی سے زیادہ خوش نہیں تھے اور نہ ہی وہ ان کا اقتدار ماننے کو تیار تھے چنانچہ قازان میں منعقد شدہ مسلمانان روس کی دوسری کانگریس کے فیصلوں کے بموجب نومبر ۱۹۱۷ء میں نوساخت ملی مجلس کی کارروائیاں اوفا میں شروع ہوئیں۔

مجلس کا پہلا (اور آخری) اجلاس ۲۰ نومبر کو شروع ہوا۔ صدری مقصودی نے خطبۂ استقبالیہ میں "اندرون روس و سائبیریا کے ترک و تاتار مسلمانوں کی اولین قومی مجلس" کو خوش آمدید کہا اور امید ظاہر کی کہ مندوبین دور رس اور دیرپا فیصلے کریں گے۔ کارروائی شروع ہونے کے فوراً ہی بعد مندوبین تین سیاسی گروہوں میں بٹ گئے۔ اعتدال پسند جن میں علما، متوسط طبقے کے نمائندگان اور آزاد خیال دانشور تھے، صدری مقصودی کے گرد جمع ہو گئے اور "مرکزی جتھا" قائم کیا جو مسلمانان روس کی غیر علاقائی ثقافتی خود مختاری کا حامی تھا۔ مجلس کے ۹۶ ممبروں میں سے ۵۰ اس گروہ میں

شامل تھے۔ بائیں بازو میں جو سوشلسٹ نظریات کا حامی تھا تقریباً ۳۰ نمائندے شامل تھے۔ جن کی قیادت الیاس آلین اور غلیم جان ابراہیم کر رہے تھے یہ گروہ والگا۔ یورال خطے میں ایک خودمختار ریاست قائم کرنے پر مصر تھا اور یہ لوگ اپنے علاقے میں باشقیریوں کو بھی شامل کرنا چاہتے تھے تیسرا اور آخری گروہ جس میں ۸ , ۱۰ مندوبین شامل تھے کھلم کھلا اشتراکیوں کا حامی تھا۔ انہوں نے لینن کی حکومت کو تسلیم کر لینے کے لئے پُرزور وکالت کی لیکن ان کی کوششوں اور احمد سالک کے تار کے باوجود جس میں مجلس کو سوویٹ حکومت سے رابطہ قائم کرنے کے لئے کہا گیا تھا، مندوبین کی اکثریت غیر جانبداری پر قائم رہی۔ بائیں بازو کے گروہ کا اشتراکی حکومت کی طرف ردعمل غیر مبہم ہی رہا اور وہ کوئی قطعی فیصلہ نہ کر سکے۔ مجلس کی ناکامی اور خاتمے کے بعد خصوصاً خانہ جنگی کے اختتام پر ان میں سے اکثر و بیشتر نے جن میں الیاس آلین اور غلیم جان ابراہیم جیسے ممتاز رہنما بھی شامل تھے سوویٹ حکومت سے نہ صرف تعاون کیا بلکہ کمیونسٹ پارٹی میں بھی شریک ہو گئے۔

اسی دوران روس میں خانہ جنگی شروع ہو گئی، ادھر مجلس میں تاتاریوں اور باشقیریوں کا خودمختاری کے سوال پر جھگڑا اس قدر طول کھینچ گیا کہ مجلس اور اسکے قانون ساز کمیشن کی کارروائیاں التوا میں پڑ گئیں حتیٰ کہ مارچ ۱۹۱۸ء میں بالشویک حکومت نے مجلس کو توڑ دیا۔ خانہ جنگی کے دوران تاتاریوں نے انتہائی غیر جانبداری سے کام لیا جس سے اس علاقے میں سوویٹ اقتدار کو مستحکم ہونے کا موقع مل گیا۔ فروری کے آخر تک سوائے ٹرانس کاکیشیا کے تمام علاقوں پر سوویٹ اقتدار قائم ہو چکا تھا۔ انقلاب کے وقت

مجلس اور حربی شوریٰ کو تاتاری علاقوں کے ہزاروں لاکھوں مسلمانوں کی حمایت حاصل تھی اس کے علاوہ کئی ایک مسلم رجمنٹ بھی یہاں موجود تھیں[1]۔ اگر ان مسلمان دستوں نے خلاف کمیونسٹ عناصر کی مدد کی ہوتی تو شاید سوویٹ اقتدار قائم نہ ہو پاتا اور اشتراکیوں کا انجام بہت مختلف ہوتا۔ لیکن اشتراکی پروپیگنڈا کے زیر اثر ان فوجوں میں بھی بددلی پھیلنے لگی اور سپاہیوں نے فرار ہونا شروع کر دیا، نوبت یہاں تک پہنچی کہ مہینوں میں پوری پوری فوج غائب ہوگئی۔ مثال کے طور پر، ۱۹۱۷ء میں جنرل سلیمان کی کمان میں جو مسلمان فوج منظم کی گئی تھی اور جس میں تقریباً ۳۰ ہزار سپاہی تھے، چند ماہ میں مفقود ہوگئی۔

اس مرحلے پر حربی شوریٰ کو ایک نئی صورت حال کا سامنا کرنا پڑا۔ جوں جوں اشتراکیوں کا اقتدار مستحکم ہوتا گیا ویسے ہی ان کے طور طریق بدلنے لگے اور انہوں نے مقامی نظم و نسق سے مسلمانوں کو بیدخل کرنا شروع کر دیا۔ اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے حربی شوریٰ نے مسلمانانِ روس کی ایک نئی کانگریس کے انعقاد کی درخواست کی۔ درحقیقت اس کانگریس کا مقصد فوجی قوت کو منظم کرنا تھا اور اس کانگریس کو فوجی کانفرنس کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ مسلمان افسروں کو ہدایت کی گئی کہ وہ عمدہ تاتاری سپاہیوں کے "آہنی دستے" تیار کریں۔ فوج کے نظم و نسق اور تنظیم کے لئے مالی امداد حاصل کرنے کے لئے بینکوں میں ذاتی سرمائے پر جو سوویٹ حکومت پہلے ہی قومی ملکیت قرار دے چکی تھی، قبضہ کر لیا

[1] اندازے کے مطابق مسلمان فوجوں کی تعداد ۱۴ ہزار سے لیکر ۵۰ ہزار تک تھی۔

گیا اور جابجا تاتاری حکام مقرر کر دیئے گئے۔ ان حالات کو دیکھ کر سوویٹ حکام کو بہت تشویش ہوئی اور انہوں نے نفاق پھیلانے کا منصوبہ بنایا چنانچہ فوجی کانفرنس میں کمیونسٹ حامیوں نے سوویٹ اقتدار کو تسلیم کرنے کا مطالبہ کیا۔ حسب امید اس حکمت عملی سے حربی شوریٰ میں پھوٹ پڑ گئی اور سوویٹ حکومت نے والگا۔ یورال خطے میں اپنا اقتدار قائم کرنے کے لئے جنگ کا اعلان کر دیا۔ تاتاری خودمختاری کے حامی قازان کے اطراف میں جمع ہو گئے اور تاتاری فوجیں زبولاچی (ZABU-LACHIE) میں قلعہ بند ہو گئیں۔ چند معمولی جھڑپوں کے بعد فریقین میں حسب ذیل شرائط پر صلح ہو گئی۔

۱۔ سر دست والگا۔ یورال کی خودمختاری کے منصوبے ترک کر دیئے جائیں۔

۲۔ جمہوریۂ قازان میں سوویٹ اقتدار تسلیم کر لیا جائے۔

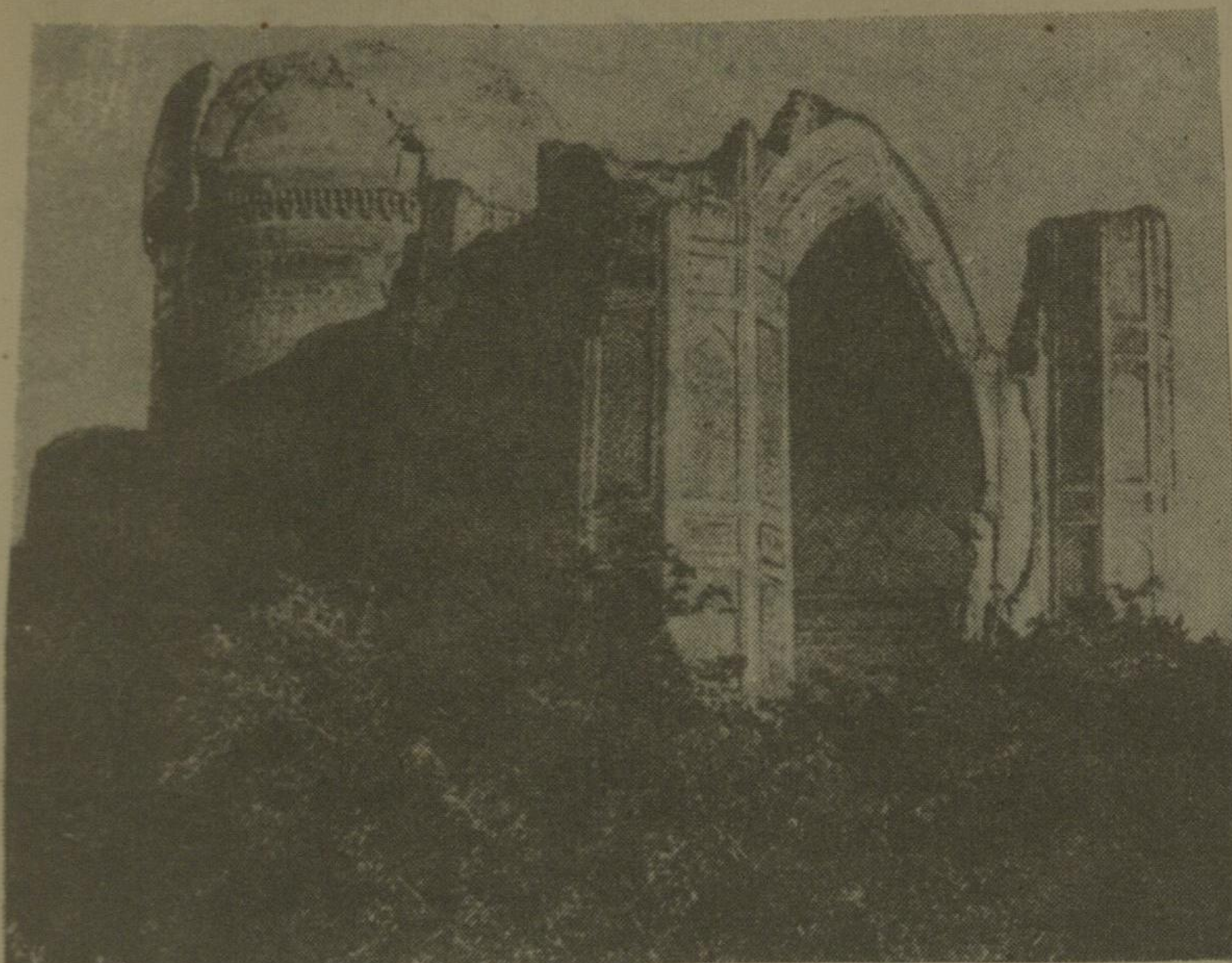
۳۔ حربی شوریٰ کے حمایتی روسی افسروں کو سوویٹ کے حوالے کر دیا جائے۔

ان سب شرائط کے بدلے میں اشتراکیوں نے تقریباً ۲۰۰ تاتاری رہنماؤں کو رہا کر دیا جو بغاوت کے شروع میں گرفتار کر لئے گئے تھے۔

بالشویکوں نے یہ صلح وقت حاصل کرنے کے لئے کی تھی کیوں کہ وہ جرمنی ترکی اور آسٹریا سے صلح کئے بغیر تاتاریوں کے خلاف جنگی کارروائیاں نہیں شروع کرنا چاہتے تھے۔ اس وقت ٹراٹسکی کی قیادت میں ایک سوویٹ وفد برسٹ لٹوسک (BREST-LITOVSK) میں صلح کی بات چیت کر رہا تھا، چونکہ جرمنی آسٹریا نے سخت شرائط پیش کیں لہٰذا مذاکرات ملتوی ہو گئے۔ اور ۱۸ فروری کو جرمنی نے پورے محاذ پر پیش قدمی شروع

کر دی۔ قدرتاً سوویٹ حکومت کو تاتاری مسئلے سے زیادہ جرمنی کے حملے سے پریشانی تھی۔ تمام بالشویک فوجیں محاذ پر روانہ کر دی گئیں اور اس کے ساتھ ساتھ حکومت نے تمام فوجی و اقتصادی ذرائع کو اپنے اختیار میں لینے کے احکامات جاری کر دیئے۔ چند ہی دنوں کے بعد لینن کے زور ڈالنے پر بالشویک پارٹی اور سوویٹ حکومت نے جرمنوں کی شرائط تسلیم کرلیں اور ۳ مارچ ۱۹۱۸ء کو صلحنامہ پر دستخط ہو گئے۔ اب سوویٹ حکومت کو کسی قسم کا ڈر یا خطرہ نہیں رہا اور اس نے اندرونی دشمنوں سے نمٹنے کا منصوبہ بنایا۔

تاتاری قوم پرستوں کو نظریاتی جوڑ توڑ میں شکست دے کر اشتراکیوں نے ان کی قومی تنظیموں کو ختم کرنے کے لئے قدم اٹھائے۔ مارچ ۱۹۱۸ء کے آخر میں محکمہ برائے امور اقوام نے استالن اور مُلا وحید کے دستخط سے ایک فرمان جاری کیا جس کی رُو سے حربی شوریٰ توڑ دی گئی چند دنوں کے بعد بحری بیڑے کے کئی سو جوان قازان میں داخل ہو گئے اور حربی شوریٰ کو جو زبولاچی میں محصور ہو گئی تھی چند گھنٹوں کی جھڑپوں کے بعد ختم کر دیا۔ مئی ۱۹۱۸ء میں ایک اعلان کے ذریعے مسلمانان روس کی کانگریس جو احمد سالک کے زیر قیادت تھی اور بڑی امیدوں اور جوش و خروش سے قائم ہوئی تھی توڑ دی گئی اور اس طرح تاتاریوں کی قومی خودمختاری کا خواب ادھورا رہ گیا۔



مسجد بی بی خانم، سمرقند



ایک تفریح گھر۔ عشق آباد

تاتاریہ

۱۹۱۸ء میں تاتاریوں کے قومی نظم ونسق کے ختم ہو جانے کے بعد مسلمان اشتراکیوں نے ایک علٰحدہ مسلم اشتراکی پارٹی منظم کرنے کا منصوبہ بنایا۔ ان میں سے بہت سے اسٹالن کے "مسلم خود مختاری" کے وعدوں پر تاتاری قوم پرستوں کا ساتھ چھوڑ کر مسلمان انقلابیوں کے ساتھ شامل ہو گئے۔ ان کی قیادت مُلا وحید کے ہاتھوں میں تھی اور اس میں بہت سے ممتاز تاتاری دانشور و مفکر شریک تھے۔ ان کو اسٹالن کی پشت پناہی حاصل تھی جو تاتار۔ باشقیریا کی خود مختار سوویٹ جمہوریہ کے قیام کے حامی تھے۔ اسٹالن نے اپنی اس حمایت کا اظہار ۲۳ر مارچ کے "پراودا" میں کیا تھا۔ جنوری ۱۹۱۸ء میں سوویٹ کی تیسری کانگریس میں اسٹالن نے سوویٹ روس کی تشکیل کے لئے وفاقی اصول کا پرچار کیا تھا اور تاتار۔ باشقیریا میں وہ اس اصول کو آزمانا چاہتے تھے۔ ان کا اور پارٹی کا خیال تھا کہ اس نئے اصول کے اطلاق سے ان کو مشرقی علاقوں کی ہمدردی وتعاون حاصل ہو سکے گا۔ "پراودا" نے اس بات کا بھی اظہار کر دیا کہ وسطی ایشیا اور قفقاز

کے لئے بھی اسی قسم کے منصوبے تیار کئے جا رہے ہیں[1]۔ لیکن اس وقت اشتراکی پارٹی میں اسٹالن کا اقتدار مستحکم نہیں تھا۔ اور مختلف مخالف گروہوں کی خواہشوں پر اولاً یہ منصوبہ ملتوی ہوگیا۔ اور بعد میں بالکل ہی ختم کر دیا گیا۔ غالباً اسٹالن کا ارادہ یہ تھا کہ ایک بڑی مسلم جمہوریہ قائم کر کے بحیثیت سربراہ محکمہ امور برائے اقوام وہ بڑی طاقت و اقتدار حاصل کر سکیں گے لیکن تمام باشقیریوں اور روسی اشتراکیوں نے والگا۔ یو ال وفاق کے قیام کے منصوبے کی مخالفت کی البتہ تاتاری اشتراکی اس منصوبے کے حق میں تھے۔

۱۹۱۸ء کے اوائل میں اورن برگ پر سرخ فوجوں کے قبضے کے بعد باشقیریا کے اشتراکیوں نے اپنی سرگرمیاں تیز کر دیں اور فروری میں انہوں نے باشقیریا کی جمہوری سوویٹ کے قیام کا اعلان کر دیا۔ یہ پہلی خود مختار سوویٹ جمہوریہ تھی۔ مارچ میں ان لوگوں نے ایک وفد ماسکو بھیجا جس نے وہاں خود مختار باشقیریا کے قیام کی وکالت کی اور خاصی حمایت حاصل کر لی۔ باشقیریا کے اشتراکیوں نے کھلم کھلا اسٹالن کے منصوبے پر تنقید کی۔ ۱۹۲۰ء میں اسٹالن اور تاتاریوں کے باشقیریا کو وفاق میں شامل کرنے کے منصوبے کے خلاف باشقیریا کے قوم پرستوں نے بغاوت کر دی۔ روسی اشتراکی بھی خصوصاً وہ جن کا ٹراٹسکی کے بائیں بازو سے تعلق تھا تاتار باشقیریا کی خود مختار جمہوریہ کے قیام کیخلاف تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ایسے مرحلے پر جبکہ عالمی انقلاب رونما ہونے والا ہے قومی خود مختاری

---

[1] "پراودا" مورخہ ۲۳ مارچ ۱۹۱۸ء

کے سوال میں الجھ کر قیمتی وقت نہیں ضائع کیا جا سکتا۔ اس مسئلہ پر ان کو ان گروہوں کی حمایت بھی حاصل تھی جن کا اپنا کوئی خصوصی قومی علاقہ نہ تھا۔

اس کے علاوہ خود مختاری کے حامیوں کی مخالفت باشقیریا قزاقستان اور دوسرے مشرقی خطوں کے کسانوں اور مزدوروں نے بھی کی کیونکہ ان کو خطرہ تھا کہ ان کو انقلاب کے تحت جو مراعات حاصل ہوئی ہیں وہ چھین لی جائیں گی۔ اس مخالفت میں اشتراکیوں کے ساتھ ساتھ مسلمان کسان بھی برابر کے شریک تھے۔ وسطی ایشیا میں روسی آباد کاروں نے مسلمانوں پر ناتجربہ کاری کا الزام لگا کر ان کی خود مختار حکومت کے قیام کی مخالفت کی۔

تاتاری اشتراکی اسٹالن کے تاتار۔ باشقیریا منصوبہ کے سخت حامی تھے اور اس کے اطلاق کے لئے متحد اور مُصر تھے۔ اس منصوبے میں ان کو تاتاری نظریات کی جیت نظر آتی تھی اور ان کا خیال تھا کہ یہ انقلاب مشرق میں دور دور تک پھیل جائیگا اور یوروپ کی غلامی کا طوق ان کی گردنوں سے اتر جائیگا۔ ان کو اپنی وقعت اور قسمت پر اس لئے بھروسہ تھا کہ کمیونسٹ پارٹی اور سوویٹ حکومت ان کو اسلامی ایشیا میں ایک مثال کے طور پر پیش کرنا چاہتی تھی۔ ویسے یہ امر قابل شبہ ہے کہ تاتاری اشتراکی صحیح معنوں میں مارکسسٹ تھے۔ وہ انقلاب کے پکے حامی تھے لیکن وہ اس انقلاب کو یوروپی آباد کاروں کے خلاف مسلمانان مشرق کی فتح تصور کرتے تھے۔ ۱۹۲۰ء میں اسٹالن کے ممد و معاون ملا نور وحید کے متعلق ایک مورخ نے لکھا کہ

"وحید کو اس بات کا پکا یقین تھا کہ سوشلسٹ تعمیر عالم کی بنا پر جو تہذیب و تمدن ظہور میں آئے گا۔ اس پر قدیم عرب تہذیب کا گہرا اثر ہوگا ان کے تصور میں عظیم الشان اسلامی تہذیب و ثقافت جو عرب کی سرزمین سے لے کر گنگا کے کناروں تک اپنی گوناگوں خوبیوں سے فروزاں و جلوہ نما تھی۔ بہت پُر اثر تھی۔ وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ اس تہذیب کا شیرازہ بکھر سکتا ہے یا وہ مفقود ہو سکتی ہے ان کو اس امر پر یقین کلّی تھا کہ مستقبل میں تمام انسانیت اس تہذیب سے فیضیاب ہوگی"[۵]

ملا وحید کے قریب ترین رفیق مشہور تاتاری ناول نویس غلیم جان ابراہیم بھی اسلام اور مشرق سے روحانی طور پر وابستہ تھے اور اپنے دوسرے رفقا کے ساتھ ان کا بھی عقیدہ تھا کہ مسلمانان مشرق ہی انقلاب کی کامیابی کی ضمانت کر سکتے ہیں چنانچہ یہ تاتاری اشتراکی اپنے کو اسلام کا انقلابی سمجھتے تھے اور ان کا مقصد ایک عالمی انقلاب بپا کرنا نہیں تھا بلکہ مسلمانوں کو یوروپ کی غلامی سے آزاد کرانا تھا۔

تاتاری اشتراکیوں کو اسٹالن کی حمایت اور تعاون حاصل تھا اور انہوں نے (اسٹالن) ان کی مطبوعات اور تقاریر شائع کروائیں حالانکہ اسٹالن کو یہ بخوبی علم تھا کہ مسلمان اشتراکیوں کے مقاصد و نظریات یوروپی اشتراکیوں سے بالکل مختلف تھے اور انہوں نے اپنے رفقا سے ان خدشات کا ذکر بھی کیا۔ لیکن ۱۹۱۸ء کے مشکل دور میں اشتراکی ہر طرح

---

[۵] تاسموف کا مضمون "ملا نور وحید"

اور ہر طرف سے مدد حاصل کرنے پر تلے ہوئے تھے، وہ ہر اس طبقے کی مدد لینے کو تیار تھے جو عالمی انقلاب کی حمایت کرے اور سامراجی زد کی کے خلاف جنگ کرنے کو تیار ہو۔ چنانچہ خدشات وشبہات کے باوجود اسٹالن نے تاتاری معاونین کی ہر ممکن مدد کرنے کی کوشش کی[۱]۔

مئی کے وسط میں[۲] اسٹالن نے مسلمان اشتراکیوں کی کانفرنس طلب کی۔ اس کانفرنس کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ شرکت کے دعوت نامے لینن اور اسٹالن کے نام پر بھیجے گئے۔ کانفرنس کا آغاز اسٹالن کی تقریر سے ہوا جس میں انہوں نے اس امر کی صاف وضاحت کی کہ خود مختاری سوویٹ اقتدار کے زیر نگین ہوگی اور تاتار باشقیریا کے معاملات میں قوم پرستوں کو دخل اندازی نہیں کرنے دی جائیگی۔

"خود مختاری ایک طرز عمل ہے۔ سوال یہ ہے کہ کس طبقے کو اس میں جگہ دی جائے۔ سوویٹ اقتدار خود مختاری کے خلاف نہیں ہے بلکہ وہ اس کے حق میں ہے لیکن ایسی خود مختاری کے حق میں جس میں تمامتر اقتدار و قوت، مزدوروں کاریگروں اور کسانوں کو حاصل ہو اور جس میں متوسط طبقے کو نہ صرف حکومت و اقتدار سے باز رکھا جائے بلکہ حکومت کے انتخابات میں بھی حصہ نہ لینے دیا جائے۔

---

[۱] در اصل اسٹالین کا درپردہ مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کی تنظیم کو منتشر کردیا جائے۔ از سوانح حیات محمد امین بیگ۔

[۲] ۱۰-۱۶ مئی کے درمیان۔

صرف ایسی ہی خود مختاری سوویٹ اصولوں پر مبنی ہوگی"۔[1]

مُلا وحید کی تقلید کرتے ہوئے اسٹالن نے آگے چل کر کہا کہ

"یہ خود مختار جمہوریہ مسلمانان مشرق کے لئے مشعل راہ ثابت ہوگی۔ جس کی روشنی میں مظلوم آزادی کی راہ پائیں گے"

اسٹالن کی تجویز کے مُطابق کانفرنس نے ۸ ممبروں پر مشتمل ایک کمیشن منتخب کیا جس کے صدر ملا وحید تھے[2] اس کا مقصد تاتار۔ باشقیریا کی قانون ساز کانگریس کے انعقاد کی تیاری کرنا تھا۔ تاتاری اپنے خوابوں کو شرمندۂ تعبیر ہوتا ہوا دیکھ کر خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے[3] سوویٹ تاتاریہ بالفاظ دیگر تاتار باشقیریا والگا کے خطے میں تقریباً ایک کروڑ نفوس پر مشتمل بین قومی ریاست بننے والی تھی جس میں تمامتر اقتدار تاتاری اقلیت کے ہاتھوں میں ہوتا۔

اس کانفرنس کے انعقاد کے کچھ ہی دنوں بعد ملک میں خانہ جنگی کے آثار پیدا ہوگئے۔ مُلا وحید نے فوجی تنظیم کی غیر معمولی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے ہوئے مسلمانوں مزدوروں اور کسانوں کی فوج تیار کر لی اس کے ساتھ ہی ساتھ انہوں نے مسلم کمیونسٹ پارٹی قائم کرنے کی بھی کوشش کی جس کا پہلا جلسہ ۲۰ جون کو قازان میں منعقد ہوا۔ اس میں طے پایا کہ کل مسلمانان روس کی کمیونسٹ پارٹی تنظیم کی جائے۔ ملا وحید

---

[1] اسٹالن "SOCHINENIIA"

[2] "پراودا" مورخہ ۲۴ مئی ۱۹۱۸ء

[3] " " " "

کے زیر نگرانی ماسکو، استرخان، سمارا اور دوسرے شہروں میں مسلمان اشتراکی گروہ قائم کئے گئے۔ اولاً رہنماؤں میں اس امر پر اختلاف رائے تھا کہ مسلمانوں کی کمیونسٹ پارٹی الگ ہو یا روسی کمیونسٹ پارٹی کا جز و ہو لیکن بالآخر ملا وحید[1] اور ان کے ہمنواؤں کو کامیابی ہوئی[2]۔

نومبر ۱۹۱۸ء میں کل مسلمانان روس کی کمیونسٹ پارٹی (بالشویک گروہ) کا اجلاس ماسکو میں منعقد ہوا جس میں ۴۶ مندوبین نے حصہ لیا۔ اس کانگریس کا اولین مقصد مسلم کمیونسٹ پارٹی اور روس کی کمیونسٹ پارٹی کے درمیان اتحاد والحاق قائم کرنا تھا۔ خانہ جنگی کے بعد سے بالشویک اس بات کے حق میں نہیں تھے کہ ملک میں آزاد خود مختار سیاسی جماعتیں قائم ہوں۔ چنانچہ اس کانگریس میں قرار پایا کہ مسلم کمیونسٹوں کا نام بدل کر "روسی کمیونسٹ پارٹی کا مرکزی محکمہ برائے تنظیم مسلمانان" رکھ دیا جائے اور اس مرکزی محکمے کا پارٹی کی مرکزی کمیٹی سے براہ راست

---

[1] خانہ جنگی کے دوران کمیونسٹ دشمن فوجوں نے قازان کی طرف پیش قدمی کی تو ملا وحید ماسکو سے قازان آگئے تاکہ شہر کے دفاع کو منظم کرسکیں لیکن ۷؍ اگست کو قازان فتح ہوگیا اور ملا وحید گرفتار کر لئے گئے۔ ان کو سزائے موت دی گئی اور کوششوں کے باوجود الیاس آلبین نے جو قازان کے تاتار کمشنر تھے مداخلت نہیں کی۔ ۲۵؍ اگست کو ملا وحید کو گولی مار دی گئی۔

[2] "ازوستیا" مورخہ ۳۰؍ جون ۱۹۱۸ء

R. PIPES: "THE FORMATION OF THE SOVIET UNION." (CABRIDGE 1954)

تعلق ہو۔ لیکن اس کے باوجود اس قرار داد میں بڑی گنجائش رکھی گئی اور حالانکہ مسلم کمیونسٹ، پارٹی کے زیر احکام آگئے مگر پھر بھی ان کو بڑی حد تک خود مختاری حاصل تھی اور مقامی تنظیمات کو برقرار رہنے دیا گیا اور سب سے بڑی بات یہ کہ "مسلم کمیونسٹ" نام کو باقی رہنے دیا گیا۔ مارچ ۱۹۱۹ء میں مرکزی محکمے کو توسیع دی گئی اور اس کا نام "کمیونسٹ تنظیم کا مرکزی محکمہ برائے اقوام مشرق" کر دیا گیا۔

مسلمان اشتراکیوں کی طرف روسی کمیونسٹوں کا یہ روادارانہ سلوک بڑی حد تک نشر و اشاعت کی غرض سے تھا جو کہ اپنے کو مشرق کے مظلوم اقوام کا نجات دہندہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کانگریس کے دوران اپنے ایک مضمون میں اسٹالن نے لکھا

"انقلاب اکتوبر دنیا کی تاریخ میں پہلا انقلاب ہے جس نے مشرق کے مظلوم و مجبور جفاکش عوام الناس کو صدیوں کی نیند سے جھنجھوڑا ہے اور عالمی سامراجیت کے خلاف جنگ میں لا کھڑا کیا۔"[1]

خانہ جنگی کے دوران میں بھی اسٹالن نے کہا

"مشرق کو ایک لمحے کے لئے بھی بھلانا ناممکن ہے کیوں کہ مشرق عالمی شہنشاہیت کا گہوارہ ہے۔"[1]

۱۹۲۰ء کے اوائل تک تاتاری خود مختاری کی مہم چلتی رہی اور خانہ جنگی[2]

[1] "پراودا" مورخہ ۱۹ر نومبر ۱۹۱۸ء

[2] یہ خانہ جنگی اسٹالن کی سیاسی چال تھی تاکہ تاتاری وحدت کو زک پہونچے۔

کے آخری دنوں میں تاتاری اشتراکیوں اور فوجیوں نے تاتار جمہوریہ کے قیام کا مطالبہ کیا۔ نومبر ۱۹۱۹ء میں مسلم کمیونسٹوں کی دوسری کانفرنس منعقد ہوئی جس میں اہم ترین سوال تاتار۔ باشقیریا جمہوریہ کا قیام تھا۔ مندوبین کی اکثریت اس حق میں تھی کہ باشقیریا کو تاتار جمہوریہ میں شامل کیا جائے۔ اس کانگریس میں بھی اسٹالن نے خطبۂ استقبالیہ پڑھا اور مسلمان اشتراکیوں پر اس بات کے لئے زور دیا کہ وہ "مشرق کے عوام کو جگانے" کے لئے جد وجہد کریں۔ اسٹالن نے متحدہ تاتار۔ باشقیریا جمہوریہ کے قیام کی منظوری بھی دیدی لیکن سُرخ باشقیری تاتاریوں سے اتحاد والحاق کے خلاف سخت سے اڑے رہے[۱] فروری ۱۹۱۹ء سے خود مختار سوویٹ جمہوریہ باشقیریا قانوناً قائم تھی اور جس کی حیثیت کو کمیونسٹ پارٹی تسلیم کر چکی تھی[۲] چونکہ باشقیریا کچھ عرصے سے خود مختار تھا اور اس کی اپنی فوجیں بھی تیار تھیں اس لئے کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی اور اسٹالن نے اس بات کو مناسب نہیں سمجھا کہ ان سے جھگڑا مول لیا جائے تاتاری خود مختاری میں دوسری رکاوٹیں بھی آن پڑیں۔ قازان کمیونسٹ پارٹی اور یوروپین آبادکار جو تاتاری شہروں میں اکثریت میں تھے اس منصوبے کے خلاف تھے۔ لینن اور اسٹالن اس خیال سے کہ تاتاری اشتراکی دوسرے مسلمان علاقوں میں بہت کارآمد ثابت ہو چکے ہیں اور ایشیا میں انقلاب لانے میں مدد دے سکتے ہیں، تاتاری خود مختاری کے حق میں تھے۔ لینن نے قازان کمیونسٹ پارٹی کے سربراہ سے ایک گفتگو

---

[۱] اسٹالن نے ان کی حوصلہ افزائی کی۔

[۲] "ازوستیا" مورخہ ۱۸ر مارچ ۱۹۱۹ء

کے دوران کہا کہ

"یہ بات قابل قبول نہیں ہے کہ پارٹی کے مجموعی فائدے کے مقابلے میں تنگ نظر، عارضی اور خود غرض مقامی مفادات کو ترجیح دی جائے"۔

الغرض یہ کہ جنوری ۱۹۲۰ء میں جبکہ باشقیریا، قزاقستان اور وسطی ایشیا میں حالات دگرگوں تھے مرکزی کمیٹی نے خود مختاری کے منصوبے پر عمل درآمد کرنے کے لئے کارروائی شروع کر دی۔

مئی ۱۹۲۰ء میں کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے ایک اعلانیہ میں خود مختار تاتار سوویٹ سوشلسٹ جمہوریہ کے قیام کا اعلان کر دیا گیا[1]۔ اسٹالن کے لئے یہ امر بہت ہی خوشی کا سبب تھا کیوں کہ ٹراٹسکی اور بائیں بازو کی مخالفت کے باوجود ان کا منصوبہ پورا ہو گیا[2]۔ تاتاری قوم پرست بھی خوش اور مطمئن تھے اور اس خوشی میں انہوں نے یہ حقیقت نظر انداز کر دی، اور جس کا ان کو بعد میں تلخ تجربہ ہوا، کہ سوویٹ خود مختاری قومی خود مختاری سے بہت مختلف تھی۔

---

[1] "ازوستیا" مورخہ ۲۰ رمئی ۱۹۲۰ء

[2] جمہوریہ تاتار کے قیام میں تاخیر کی وجہ خانہ جنگی اور ملا نور وحید کی موت تھی۔

باشقردستان[1]

والگا۔یورال میں باشقیریوں کی خودمختاری کی خواہشات کا احترام کرتے ہوئے خود مختار تاتاری علاقے کے قیام سے روس کے ترکوں کی سیاسی وحدت کو بڑا نقصان پہنچا۔ ۱۹۱۷ء کے انقلاب سے قبل تاتاریوں اور باشقیریوں کے درمیان کسی قسم کی رقابت یا چشمک کی شہادت نہیں ملتی ہے بلکہ اوفا اورن برگ اور یورال کے مسلمان عوام کبھی اپنے کو تاتار اور کبھی باشقیر کہتے تھے۔انقلاب کے بعد باشقیری رہنماؤں نے قوم پرستی کا مظاہرہ کیا اور تاتار سیاست سے پہلو تہی کرتے ہوئے اپنے مسائل کو خود حل کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔

باشقیریا کے عوام ترکی النسل ہیں جو تاتاریوں کی ایک شاخ ہیں۔ یہ لوگ نویں صدی کے لگ بھگ سے یورال کے جنوب میں آباد ہیں، سولھویں۔سترہویں صدی میں قازان کی فتح کے بعد تاتاریوں نے اس علاقے میں دخول شروع کیا۔باشقیری نیم خانہ بدوش تھے جبکہ تاتاری زراعت پیشہ تھے اور اسی اختلاف نے بالآخران کے درمیان رقابت

---

[1] باشقیریا کو ترکی میں باش قردستان کہتے ہیں۔

پیدا کی کیونکہ تاتاری ان کو پس ماندہ اور خانہ بدوش قبیلہ تصور کرتے تھے یہ بات باشقیری سرداروں اور رہنماؤں کو اچھی نہیں لگتی تھی اور تاتاریوں کے احساس برتری کے ردعمل نے باشقیری قومیت کو جنم دیا۔

انیسویں صدی سے باشقیریوں کا بنیادی مسئلہ ان کی زمینوں پر یوروپین آبادکاروں کا تسلط تھا۔ ۱۹۱۱ - ۱۹۱۵ء کے درمیان تقریباً ۲ لاکھ کسان خاندان اوفا اور اورن برگ میں بسائے گئے۔ ان علاقوں میں زمینوں کی جبری خرید و فروخت سے باشقیریوں کے معیار زندگی پر بھی بڑا اثر پڑا چنانچہ انقلاب فروری کے بعد باشقیری رہنماؤں نے زمین اور آبادکاری کا سوال فوری طور پر اٹھایا۔ مسلمانوں کے مختلف سیاسی اجتماعات میں بھی یہ مسئلہ پیش کیا گیا۔ مئی ۱۹۱۷ء میں ماسکو میں منعقد شدہ کل مسلمانان روس کی پہلی کانگریس میں خلاف امید باشقیریوں کے زمینی پروگرام کی توثیق نہیں کی گئی۔ اس کانگریس میں طے پایا کہ

"تمام زمین عوام کی ملک ہے"

جبکہ باشقیریوں کا کہنا تھا کہ

"باشقیریا کی زمین صرف باشقیریوں کے لئے ہے"

جولائی ۱۹۱۷ء میں جب کل مسلمانان روس کی دوسری کانگریس قازان میں طلب کی گئی تو باشقیریوں نے اورن برگ میں پہلی باشقیر قومی کانفرنس منعقد کی۔ اس میں تقریباً ۷۰ نمائندوں نے شرکت کی اور اس کانفرنس کے بلانے اور منظم کرنے میں احمدؒ ذکی ولیدی

طوغان کا بڑا ہاتھ تھا[1]۔ وہ ایک سرگرم سیاست داں اور ماہر مستشرق تھے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ۱۹۱۷ء - ۱۹۲۰ء کے درمیان باشقیریا کی قوم پرستی کی تحریک کے روح رواں ذکی ولیدی ہی تھے۔ ولیدی کے کہنے پر کانفرنس نے انتہا پسندی کا راستہ اختیار کیا اور قومی علاقائی خود مختاری، باشقیریوں کے فوجی دستوں کے قیام اور ۱۸۹۸ء کے بعد جو زمین آبادکاروں کو دی گئی تھی اس کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ اس کانفرنس نے یہ بھی اعلان کیا کہ لسانی بنیادوں پر وہ اس علاقے کے دوسرے مسلمانوں (یعنی تاتاریوں) سے مختلف ہیں[2] یہ کہنا درست ہوگا کہ اگر باشقیریوں میں ذکی ولیدی جیسی پرزور شخصیت نہ ہوتی تو تاتار باشقیری نفاق پیدا نہ ہوتا۔

اکتوبر ۱۹۱۷ء میں سوویٹ افواج نے اوفا پر قبضہ کرلیا اور اس طرح باشقیریا پر سوویٹ اقتدار قائم ہوگیا۔ باشقیری قوم پرست جو نہ تو تاتاریوں سے اور نہ بالشویکوں سے تعاون کرنا چاہتے تھے منتقل ہو کر اورن برگ چلے گئے۔ اورن برگ کی تاریخی عمارت کارواں سرائے میں ذکی ولیدی نے ۸ر نومبر کو پارلیمنٹ کا اجلاس طلب کیا۔ ۱۵ر نومبر کو اس پارلیمنٹ نے علاقائی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ مقامی تاتاریوں نے کچھ مخالفت کی لیکن جلد ہی ان پر قابو پالیا گیا۔ "سرخ" اور "سفید" روسیوں کے جھگڑے میں باشقیریا غیر جانبدار ہی رہا لیکن جب جنوری

لے MURTAZIN: "BASHKIRNA i BASHKIRSKIE VOISKA V."

ٹ SN. TIPEEV: "BASHKORSTAN TARIHI" (UFA. 1930)

۱۹۱۸ء میں سوویٹ فوجوں نے اورن برگ پر قبضہ کرلیا تو پارلیمنٹ کے بہت سے ممبر سوویٹ حکومت سے مل گئے۔ ذکی ولیدی کے رفیق اشرف مناطوف[1] اسٹالن کی دعوت پر محکمہ برائے امور اقوام کے مسلم شعبہ کے نائب صدر بن گئے۔

فروری ۱۹۱۸ء میں بائیں بازو کے ان مسلمانوں نے جو سوویٹ حکام سے مل گئے تھے، باشقیریا کی عارضی انقلابی کونسل منظم کر کے مسلمان عوام کے نام پر سوویٹ اقتدار کو تسلیم کرلیا۔ ذکی ولیدی اور دوسرے باشقیری رہنما اورن برگ سے فرار ہوگئے اور کمیونسٹ دشمن عناصر سے مل کر خود مختار باشقیریا کے قیام کی کوششیں کرتے رہے۔ لیکن قوم پرست باشقیریوں کو کمیونسٹ دشمن عناصر سے اس وقت بڑی مایوسی ہوئی جبکہ انہوں نے باشقیریوں کے حق خود مختاری کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور باشقیریوں کے مسلح دستوں سے ہتھیار واپس لے لئے چنانچہ جب جنوری ۱۹۱۹ء میں بالشویک افواج نے یورال کے چند علاقوں پر قبضہ کیا تو ان باشقیریوں نے بالشویک نمائندوں سے بات چیت شروع کر دی۔ اس گفت و شنید کے نتیجے میں لینن اور اسٹالن کی منظوری سے قوم پرست باشقیریوں کی عام معافی کا اعلان کر دیا گیا۔ بشرطیکہ باشقیری مسلح دستے سوویٹ افواج میں شامل ہو جائیں۔ سوویٹ حکومت نے باشقیریوں کی قومی آزادی کی ضمانت دی[2]۔ چند دنوں کے بعد باشقیریوں

۱؎ MURTAZIN

۲؎ LENIN: "SOCHINENIIA"

نے ذکی ولیدی کی سربراہی میں سوویٹ اقتدار اعلیٰ سے ایک سیاسی معاہدہ کیا جس کی روسے ماسکو اور باشقیریا کے تعلقات کی بنیاد رکھی گئی اور پہلی خود مختار ترک جمہوریہ (یعنی باشقیریا) کی حدود کا تعین کیا گیا۔ یہ بھی طے پایا کہ باشقیریا کی سوویٹ کانگریس کے قیام تک نظم و نسق عارضی انقلابی کونسل کے پاس ہی رہے گا جس میں دو باشقیری ارکان دو ماسکو کے نامزد کردہ ارکان اور پانچواں رکن دونوں فریق کی رضامندی سے شامل ہوگا۔ حالات سدھرنے پر جمہوریہ کی حکومت سوویٹ دستور کے مطابق بنائی جائے گی اور باشقیری فوجی دستے سوویٹ افواج کے زیر تحت ہوں گے۔

ذکی ولیدی نے بڑے پس وپیش کے بعد اشتراکی پارٹی میں شمولیت کی۔ دراصل وہ "ایرک" (آزادی) کے نام سے اپنی قومی اشتراکی جماعت قائم کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے اپنے اشتراکی رفقا سے اس خواہش کو کبھی بھی نہیں چھپایا کہ وہ ایک خود مختار باشقیریا قائم کرنا چاہتے تھے جس میں تمام تر اقتدار باشقیریوں کے ہاتھوں میں ہو۔ وہ نہ صرف روسی نوآبادکاری کو روکنا چاہتے تھے بلکہ وہ تمام زمین اور املاک بھی واپس لینا چاہتے تھے جو ۱۹۰۵ء کے بعد سے روسی نوآبادکاروں کے تسلط میں آچکی تھی تاکہ باشقیریا کی قومی ترقی پروان چڑھ سکے۔ ذکی ولیدی ان علاقوں میں ترک مسلمانوں کو آباد کرنا چاہتے تھے تاکہ یہ ایک خالص ترک علاقہ بن جائے۔ اس قومی علٰحدگی کی خواہش کی بڑی وجہ سوویٹ اور باشقیری فوجوں کے متعدد جھگڑے بھی تھے، دونوں ایک دوسرے کو مشکوک نظروں سے دیکھتے تھے اور ان میں باہمی اعتماد نہیں تھا۔ جب سوویٹ اعلیٰ کمان نے

باشقیری دستوں سے ہتھیار لے لئے تو چند دستے "سفید" روسیوں سے جا ملے اور اس طرح باشقیریوں اور سوویٹ میں پھوٹ پڑ گئی۔

۱۹۱۹ء میں خانہ جنگی کے اختتام پر باشقیریا کی خود مختار حکومت اپنے علاقے میں واپس آگئی لیکن ذرائع آمد و رفت اور وسائل خبر رسانی کے منقطع ہو جانے سے حکومت باشقیریا اور ماسکو کے درمیان کوئی رابطہ قائم نہ ہو سکا۔ باشقیریوں کے اشتراکی اور غیر سیاسی رہنماؤں نے روسیوں اور تاتاریوں سے قطعاً کوئی میل جول نہیں بڑھایا اور اپنی جماعت بندی میں مصروف رہے۔ ۱۹۲۰ء میں ذکی ولیدی کی شمولیت کے باوجود باشقیریا میں مشکل سے دو سو باشقیری اشتراکی ہوں گے۔ الغرض یہ کہ اشتراکی مداخلت اور نگرانی نہ ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ذکی ولیدی اور ان کے رفقار نے خود مختار مقامی نظم و نسق اور ماسکو سے اقتصادی آزادی کا اعلان کر دیا۔ انہوں نے اپنی جائز اور قانونی حکومت کا دعویٰ کرتے ہوئے باشقیریا کے باہر اجناس لے جانے پر پابندی عائد کر دی۔

باشقیریوں کی سوویٹ سرپرستی سے آزادی کی خواہش اور صنعتی مراکز میں غلّے کی کمیابی نے مقامی اشتراکیوں اور علاقائی سوویٹ نظم و نسق میں شک و شبہ کی لہر دوڑا دی۔ اس علاقے کے روسی کسانوں اور مزدوروں میں بھی بے چینی پھیلنے لگی جس کا اوفا سے نکلنے والے اخبار "ازوستیا" کے اداریوں میں اظہار کیا گیا۔ خاص طور سے روسی نو آبادکاروں کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ باشقیری ان سے زمینیں واپس نہ لے لیں۔ اقتصادی طور پر ان کی حالت زیادہ اچھی نہ تھی اور اس لئے ان کے خیالات انتہا پسندانہ تھے۔ یورال کی جماعتی تنظیم میں انہی لوگوں کا بڑا اثر و رسوخ تھا اور یہ لوگ

شروع ہی سے بالشویکوں کے حمایتی تھے۔ ۵۰ فی صدی سے زیادہ پارٹی ممبر آبادکاروں میں سے تھے چنانچہ یورال کے سوویٹ حکام اور ماسکو کی حکومت ان کی باتیں غور سے سنتی تھی۔ یورال کے بالشویکوں کے کہنے پر سوویٹ حکومت نے باشقیریا کے اشتراکیوں کو منظم کرنے کے لئے ایک نمائندہ روانہ کیا۔ نومبر میں باشقیری اشتراکیوں کی پہلی کانفرنس میں ذکی ولیدی سمر قوم پرست اشتراکیوں کو زک اٹھانی پڑی اور مقامی ادارے کے لئے ایک تاتاری اسمٰعیلوف کا انتخاب ہوگیا جو کہ خودمختاری کے شدید مخالف تھے۔ اس صورت حال نے ذکی لیدی کو بہت پریشان کردیا اور انہوں نے تاتاریوں کا اثر کم کرنے کی جد و جہد شروع کی۔

نومبر ۱۹۱۹ء میں ماسکو میں مسلم اشتراکیوں کی دوسری کانگریس منعقد ہوئی جس نے متحدہ تاتار۔ باشقیریا جمہوریہ کے قیام کی حمایت کا اعلان کیا۔ تاتاریوں کے ان "سامراجی" منصوبوں کا مقابلہ کرنے کے لئے ذکی ولیدی نے باشقیریوں اور قزاقوں کے وفاق کا منصوبہ تجویز کیا۔ ماسکو کی کانگریس کے دوران ولیدی نے بذریعہ تار اپنے نمائندوں کو ہدایت دی کہ وہ کانگریس میں باشقیر قزاق کانفرنس بلانے کا سوال اٹھائے جس میں اس وفاق کی تجویز پر غور کیا جاسکے۔

تاتاریوں اور پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے اشارے پر اس باشقیر قزاق کانفرنس نے وفاق کی تجویز نامنظور کردی۔ ماسکو کے تعلقات باشقیریوں اور قزاقوں دونوں سے کشیدہ تھے لہٰذا اس طرف سے بھی کوئی حوصلہ افزائی نہیں ہوئی لیکن اس کے باوجود ذکی ولیدی قزاق اور وسطی ایشیا کے مسلمان اشتراکی رہنماؤں سے اس مسئلہ پر ذاتی مذاکرات اور تبادلۂ

خیالات کرتے رہے اور خفیہ طور پر باشقیر قزاق وفاق کی کوششیں کرتے رہے۔ باشقیریوں اور قزاقوں میں جو ایک دوسرے کے ہمسایہ تھے تاتاریوں کے بہ نسبت زیادہ مماثلت تھی اور دونوں کو ایک ہی جیسے مسائل یعنی خانہ بدوشوں کی آبادکاری، روسی نوآبادکاروں کی روک تھام اور تاتاری ثقافت اور اقتصادی دباؤ کی مزاحمت درپیش تھی۔ مختصراً یہ کہ دونوں اپنی "انائیت" کی تلاش میں تھے۔

قزاقستان سے اتحاد کے منصوبے کی ناکامی، تاتار اشتراکیوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار اور ماسکو کے روزافزوں اختیارات نے باشقیریا کے حالات میں مزید کھنچاؤ پیدا کر دیا اور جنوری ۱۹۲۰ء میں تاتار۔ باشقیر اتحاد کے حامی تاتاریوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ باشقیریوں کو یہ غلط فہمی تھی کہ وہ اس طرح اشتراکیوں کا قلع قمع کر سکیں گے لیکن فوراً ہی سرخ افواج حرکت میں آگئیں، باشقیری دستے بیرکوں میں نظر بند کر دیئے گئے اور مجبوراً باشقیری حکومت کو تمام قیدی رہا کرنے پڑے۔ اس دوران میں ذکی ولیدی ماسکو ہی میں رہے جہاں وہ مرکزی کمیٹی اور اسٹالن پر باشقیریا اور دوسرے ترک اقوام کے متعلق سوویٹ پالیسی بدلنے کی ضرورت پر زور دیتے رہے ذکی ولیدی کو اسٹالن سے بڑی امیدیں تھیں۔ ولیدی کی جدوجہد اور کوششوں کا بالآخر یہ نتیجہ نکلا کہ حکومت نے ایک ایسی خودمختار تاتار جمہوریہ کا قیام منظور کر لیا جن میں باشقیریا شامل نہیں تھا۔ لیکن باشقیریوں کی خوشی دیرپا ثابت نہ ہوئی کیوں کہ تھوڑے ہی عرصے کے بعد ماسکو نے اپنا اقتدار ہر شعبے پر قائم کر دیا اور باشقیریا کی قومی خودمختاری کا خواب ادھورا رہ گیا۔[1]

---

[1] "ازوستیا" مورخہ ۲۲ رمئی ۱۹۲۰ء

جس وقت سوویٹ حکومت نے باشقیریا میں کُلّی اختیارات سنبھالنے کا اعلان کیا تو ذکی ولیدی ماسکو میں تھے۔ ان کو اس سے جو صدمہ اور غم وغصہ محسوس ہوا ہوگا اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے۔ ۲ سال سے وہ اس کوشش میں سرگرداں تھے کہ والگا۔یورال کے ترک علاقوں میں سے باشقیریا کی حدود متعین ہو جائیں۔ چشم زدن میں ان کے سیاسی عزائم خاک میں مل گئے لیکن وہ آسانی سے ہمت ہارنے والے نہ تھے۔ اب انہوں نے جنوب مشرق میں بسنے والے ترک اقوام کے وفاق کا منصوبہ سوچا جو یا تو سوویٹ وفاق میں خود مختار حیثیت کے مالک ہوں یا اشتراکی اثر سے محفوظ، بالکل آزاد ہوں اس میں ان کو ازبیک اشتراکیوں سے تعاون حاصل ہوگیا جو خود بھی خود مختاری کے منصوبے بنا رہے تھے۔ ذکی ولیدی نے سوچا کہ یہ موقع ایک ترک اشتراکی پارٹی کے قیام کے لئے بھی موزوں ہے۔ اس پارٹی میں تمام مسلمان اشتراکی شریک ہوں اور یہ روسی اشتراکی پارٹی سے جداگانہ حیثیت رکھتے ہوئے کومنٹرن (COMINTERN) کی ممبر ہو اس وقت حالات ذکی ولیدی کے حق میں تھے، پولش افواج یوکرین میں بڑھ رہی تھیں سفید افواج کریمیا سے جنوبی یوکرین کی طرف پیش قدمی کی تیاریاں کر رہی تھیں اور وسطی ایشیا میں بصماچیوں[1] نے فرغانہ کی وادی پر تسلط حاصل کر لیا تھا۔ سوویٹ حکومت اور سرخ افواج پریشانی کے عالم میں تھیں۔ ایسے حالات میں خود مختاری اور ترک اقوام کے وفاق کے منصوبوں کی کامیابی کے بڑے امکانات تھے لیکن ولیدی نے تجربے کے باوجود سوویٹ

---

[1] "باسمہ چی" بھی لکھا جاتا ہے۔

رہنماؤں کی چالبازیوں کا صحیح تجزیہ نہیں کیا۔ لینن نے جنگ کے دوران بات ٹالنے کے لئے ترکستان کی خودمختاری کا فیصلہ ملتوی کر دیا اور ولیدی کو اسٹالن کے پاس بھیجدیا۔ اسٹالن نے ولیدی اور اُزبیگ اشتراکیوں کو کوئی قطعی جواب دینے سے انکار کر دیا۔ جوں ہی پولش افواج نے پیچھے ہٹنا شروع کیا مرکزی کمیٹی نے اُزبیک اشتراکیوں کو کوئی قطعی جواب دینے سے انکار کر دیا۔ اور اعلان کیا کہ باشقیریا کا مسئلہ حل ہو چکا ہے۔ اب ذکی ولیدی کے پاس صرف یہی چارہ تھا کہ وہ مسلح بغاوت شروع کر دیں۔

لیکن ابھی باشقیریا کے مصائب اور قومی تحریک کا خاتمہ نہیں ہوا تھا۔ باشقیری کسانوں کی شورشوں، سرخ اور سفید افواج کی جھڑپوں اور اشتراکیوں کی تاوان و ہرجانہ وصول کرنے کی مہمات نے باشقیریا کو تباہ و برباد کر دیا۔ ۱۹۲۱ء کے قحط میں جو تمام روس میں پڑا، باشقیریا کی ۲۰ فی صد آبادی فاقوں مرگئی [۱] خانہ بدوش باشقیریوں کی ایک تہائی آبادی کم ہوگئی اور اس طرح باشقردستان کی کمر لوٹ گئی اور کسی قسم کی سیاسی مزاحمت کا سوال ہی ختم ہوگیا۔

۱۹۲۲ء میں سوویٹ حکومت نے چند اور علاقے شامل کر کے باشقیریا کا رقبہ اور آبادی تقریباً دوگنی کر دی۔ نئے زرخیز علاقوں کی شمولیت سے سنگلاخ باشقیریا کی اقتصادی حالت پر اچھا اثر پڑا لیکن روسی اور تاتاری آبادی کے شامل

---

[۱] خانہ بدوشوں میں فاقوں سے مرنے والوں کا تناسب ۳۰ فی صد تھا جبکہ روسی باشندوں میں ۱۶ فی صد تھا۔

ہونے سے باشقیریوں کا اثر کم ہوگیا[1] اور ایک خود مختار قومی باشقیریا کے بجائے خود مختار سوویٹ سوشلسٹ جمہوریہ باشقیریا کا قیام عمل میں آیا۔[2]

---

[1] F. LORIMER: "POPULATION OF THE SOVIET UNION"

۵۰٪ روسی اور ۱۰٪ تاتاری آباد کئے گئے۔

[2] باشقیریا کے مفصل تاریخی حالات کے لئے دیکھئے۔

R. PIPES: "THE FORMATION OF THE SOVIET UNION."
&
"THE BASHKIR REPUBLIC" (1950)

ترکستان اور انقلاب روس

۱۹۱۴ء-۱۸ کے دوران وسطی ایشیا میں آزادی کی متعدد تحریکیں جاری ہوئیں۔ لیکن رہنماؤں میں انتشار ہونے کی وجہ سے خصوصاً "قدما" اور "جدید" کے اختلافات نے عوام کو سیاسیات سے بیزار کر دیا۔ دوسری بڑی وجہ یہ تھی کہ زیادہ تر آبادی نخلستانوں میں بکھری ہوئی تھی جن کا آپس میں میل جول اور اختلاط نہ تھا۔ چنانچہ ان لوگوں میں کسی قسم کی علاقائی یا قومی یک جہتی مفقود تھی۔ یہاں کے باشندے صدیوں سے حملہ آوروں کی لوٹ کھسوٹ کے عادی ہو چکے تھے اور وہ تغیرات کو اپنا مقدر سمجھتے تھے اور دوسروں کی غلامی میں راضی برضا تھے۔ خیوا اور بخارا میں ۱۹۲۰ء تک جاگیردارانہ نظام رائج تھا اور وسطی ایشیا کے باشندے اس نظام کے عادی ہو چکے تھے جس کی وجہ سے کسی آئینی یا قانون ساز حکومت کا تصور ان کے لئے آسان نہ تھا۔

۱۹۱۷ء میں ترکستان کی اسی فی صد آبادی آمو اور سیر دریا کے گنجان دو آبے میں آباد تھی۔ نئے اقتصادی اور معاشی حالات کی وجہ سے شہروں میں بسنے والے صنعت کاروں اور تاجروں کا طبقہ منتشر ہو رہا تھا اور اس خطہ میں صرف اسلام اور اس کے علماء ہی یکجہتی اور اتفاق کا سرچشمہ تھے

لیکن جب تک اسلام کو کوئی خطرہ لاحق نہ ہوتا تو عوام اور علمار سیاست سے الگ تھلگ ہی رہتے۔ دیہاتوں اور قصبوں میں آباد زراعت پیشہ قبائل اور فرغانہ، خیوا اور بخارا کے مختلف میدانی علاقوں میں پھیلے ہوئے نیم خانہ بدوش "قپچاق" قبائل سیاسی انقلابات و تغیرات سے بے نیاز اپنے قبائلی نظام پر سختی سے کاربند تھے جس میں قبیلے کے بزرگ اور سردار ان پر حکومت کرتے تھے۔

انقلاب کے اولیں دو برسوں میں سوائے فرغانہ کے، ان قبائل نے اشتراکیوں کے خلاف یا موافقت میں کسی قسم کا کوئی حصہ نہیں لیا لیکن ۱۹۲۰ء کے بعد یہی قبائل سوویٹ اقتدار کے خلاف ایک بڑی رکاوٹ بن گئے اور باصماچی تحریک کو، جو ۱۹۱۸ء سے فرغانہ میں شروع ہو چکی تھی ان سے بڑی مدد ملی اور جس سے وسطی ایشیا میں کمیونسٹ اقتدار کو سنگین خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ یہ زمانہ خانہ جنگی کے اختتام اور بخارا پر روسی یورش کا تھا۔ یہ قبائل چونکہ ریگستانوں اور پہاڑوں کی وجہ سے ایک دوسرے سے کٹے ہوئے تھے لہٰذا شہری آبادیوں کے نظم و نسق پر ان کا نہ تو کوئی اثر تھا اور نہ تعلق چنانچہ زار کی حکومت کا خاتمہ ہونے پر سوویٹ اقتدار کو قائم ہونے میں کوئی دقت نہیں ہوئی اور نہ ہی سوویٹ حکام نے اس دیہی اور قبائلی آبادی کو چھیڑا۔ کمیونسٹوں نے تاشقند پر قبضہ کرنے کے بعد آہستہ آہستہ تمام ترکستان پر اپنا اثر و رسوخ قائم کر لیا۔ چونکہ انقلاب روس اچانک برپا ہوا تھا اس لئے ترکستان کی سیاسی جماعتوں کو تنظیم اور تربیت کا بالکل وقت نہیں ملا اس کے برعکس اشتراکی روسی ملت اور حکمران طبقہ کے فرد تھے قوت و وسائل، فوج اور پولیس سب کچھ ان کے ہاتھوں میں تھی۔ کمیونسٹ

پارٹی بھی گذشتہ نصف صدی سے منظم ہو رہی تھی۔ ترکستان کے مسلمان منتشر اور غیر متحد تھے اور ان کے سیاسی مسالک ناپختہ تھے چنانچہ اکثریت کے باوجود وہ بالشویک اشتراکیوں پر غالب نہ آسکے۔

ترکستان میں سیاسی سرگرمیوں کا آغاز مقامی تاتاریوں نے ۱۹۱۷ء میں کیا جبکہ انہوں نے اپریل کے وسط میں قازان میں والگا۔یورال خطے کے تاتار مسلمانوں کی کانگریس منعقد کی جس میں ۴۵۰ مندوبین نے شرکت کی۔[۱] وسطی ایشیا کے چند مفکرین اور دانشوروں خصوصاً "جدید" نے، جنہوں نے مارچ میں "شوریٰ اسلام" کی تشکیل کی تھی، اس کانگرس میں شرکت کی۔ اس کانگرس سے چند روز قبل تاشقند میں "مسلمانان وسطی ایشیا کی پہلی کانفرنس منعقد ہو چکی تھی۔ قازان کی اس کانگرس میں بھی دوسری کانگریسوں کی طرح اس بات کا مطالبہ کیا گیا کہ روسی آئین جمہوری اور وفاقی اصولوں پر وضع کیا جائے، مسلمانوں کو برابر کے حقوق دیئے جائیں اور علمائے دین کی حالت کو بہتر بنایا جائے۔ سیٔر علی لاپین کی صدارت میں ترکستان کے علماء کی ایک یونین "علماء جمعیتی" قائم کی گئی۔ کانگرس کے اختتام پر ایک مستقل انتظامیہ "ترکستان مسلمان مرکزی شوراسی" کے نام سے قائم کی گئی جس کا نام بعد میں بدل کر "ملی مرکز" کر دیا گیا۔ اس میں زیادہ تر "جدید" اور روشن خیال علماء اور مفکرین شامل تھے۔ اس کے رہنماؤں میں مصطفےٰ چوقائی، جو دوما میں مسلمان گروپ کے سکریٹری رہ چکے تھے، مفتی محمود خواجہ بہبودی، عبید اللہ خواجہ، شاہ احمد بیگ اور اسد اللہ خواجہ قابل ذکر ہیں "ملی مرکز" نے روس کی تمام ترک جماعتوں

---

[۱] "ترک یاردو" (۱۹۲۴ء)

سے رابطہ قائم کیا لیکن اس نے "مسلمانان روس کی پہلی کانگرس" میں قائم شدہ مسلمانان روس کی شوریٰ میں کوئی حصہ نہیں لیا۔

"ملی مرکز" کی حکمت عملی اعتدال اور تحمل پر مبنی تھی؛ اور اس نے ترکستان کی خودمختاری کا کوئی سوال نہیں اٹھایا۔ اپریل میں تاشقند میں روسی حکام سے گفت وشنید کے دوران اس نے اس امر کا اعلان کیا کہ وسطی ایشیا میں مسلمانوں کی ۹۸ فی صد اکثریت کے باوجود مقامی نظم ونسق میں روسیوں سے زیادہ نشستوں کا مطالبہ نہیں کیا جائیگا۔ ترکستان کی تمام تر روسی جماعتیں مسلمانوں کو خودمختاری یا نظم ونسق میں اختیارات دینے کے خلاف تھیں۔ صرف سوشل ڈیموکریٹ نے ترکستان کو سیاسی طور پر، وہاں آباد مختلف قوموں کی ثقافتی اور قومی خودمختاری کی بنیاد پر، خودمختاری دیئے جانے کی سفارش کی۔

مئی ۱۹۱۷ء میں مسلمانان روس کی پہلی کانگریس کے بعد خودمختاری کا سوال سنگین صورت اختیار کر گیا اور "جدید" نے جن کی ملی مرکز میں اکثریت تھی اس سوال کو اٹھایا۔ اس دور میں روس کے اور مسلمانوں کی طرح ان کا بھی عقیدہ تھا کہ قومیت کے مسئلے کا حل صرف خودمختاری ہے لیکن یہ لوگ روس سے سیاسی علحدگی کے خواہاں نہیں تھے۔ ۱۹۱۷ء میں "جدید" کو روسی کے انقلابیوں سے زیادہ علمار کا ڈر تھا اور انہوں نے وسطی ایشیا کی خودمختاری تک کے لئے زیادہ تگ و دو نہیں کی۔ علمار کا یہ خوف بڑا درست تھا اور جب تاشقند میں انتخابات ہوئے تو قدامت پسند علما کو بھاری اکثریت سے کامیابی حاصل ہوئی۔ اور ان کو ساٹھ فی صد ووٹ حاصل ہوئے۔ ان نتائج سے "جدید" کو علما کی طرف

سے مزید محتاط کر دیا۔

علماء کا روس کی دائیں بازو کی جماعتوں سے اشتراک وتعاون صرف "جدید" جن کو علما دہریہ کہتے تھے اور ان کے بائیں بازو کے رفقا کے عناد کی وجہ سے تھا جب ملی مرکز نے خود مختاری کا منصوبہ بنانا شروع کیا تو علما نے اس امر پر اصرار کیا کہ اس میں ایسی دفعات شامل کی جائیں جن کی رُو سے قانون سازی اور انتظامیہ پر ان کی نگرانی ہو اور اس طرح تمام تر نظم ونسق ان کے ہاتھوں میں ہو۔ جیسا کہ انتخابات سے ظاہر ہوا کہ علماء بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئے اور ان کے خلاف قومی یا اشتراکی گروہوں کا زور بہت کم تھا۔

ستمبر ۱۹۱۷ء میں مسلمانان وسطی ایشیا کی کانفرنس میں ایک قرارداد منظور کی گئی جس کی رُو سے جمہوریۂ روس کے اندر رہ کر مقامی خود مختاری کا منصوبہ تیار کرنے کو کہا گیا۔ فرغانہ، سِر دریا، سمرقند اور ماورا کیسپین علاقوں پر مشتمل خود مختار ترکستان وفاقی جمہوریہ قائم کرنے کی تجویز منظور ہوئی۔ علما کے مطالبات کو مدنظر رکھتے ہوئے قرار پایا کہ علماء پر مشتمل شیخ الاسلام کی صدارت میں ایک "محکمہ شریفہ" قائم کیا جائے۔ ان بنیادوں پر روسی حکام سے گفت وشنید شروع ہو گئی لیکن انقلاب اکتوبر نے خود مختاری کے اس منصوبہ کو بھی خاک میں ملا دیا۔ خود مختار ترکستان کے رئیس جمہوریہ مصطفےٰ چوقائی نے اس ناکامی کو یوں بیان کیا ہے۔

> "افسوس کہ اس مرحلہ پر بھی ہم میں دور اندیشی کا فقدان اور مسلح قوت کی کمی، ہماری قوم کی اکثریت میں سیاسی شعور کا مفقود ہونا اور سیاسیات سے بے تعلق ہونے کی وجہ

سے ایک بہترین موقع ہاتھ سے نکل گیا۔ یہ ہماری بدبختی اور اپنی کارگزاریوں کا نتیجہ تھا کہ قلیل التعداد دشمن کے سامنے ہماری مختاریت کچھ دن سے زیادہ زندہ نہ رہ سکی"۔

وسطی ایشیا میں روسی اور یوروپی آبادکاروں نے مسلمانوں کے برعکس سیاسی سرگرمیوں کا بڑا اظہار کیا۔ فروری کے انقلاب کے بعد تاشقند جو کہ ترکستان کا سب سے بڑا شہری مرکز تھا، شورش پسندوں اور انقلابیوں کا اڈا بن گیا۔ جلد ہی تاشقند انتہا پسند انقلابیوں کا گڑھ بن گیا جس نے تمام وسطی ایشیا کو زیرنگیں کر لیا۔ جب اگست میں کرینسکی کی حکومت کو لغزش ہوئی تو مقامی بالشویک اور منشویک نے مل کر تاشقند کے "مزدوروں اور سپاہیوں کی سوویٹ" کے نام پر نظم ونسق پر قبضہ کر لیا انقلاب اکتوبر کے بعد جنوبی یورال میں زور شور سے بغاوت ہوئی۔ اس کی وجہ سے وسطی ایشیا اور ماسکو کے درمیان رابطہ منقطع ہو گیا اور خانہ جنگی کے دوران تاشقند کے اشتراکی حکمران خود مختار اور آزادانہ طور پر نظم ونسق چلاتے رہے۔ حالانکہ وسطی ایشیا میں اشتراکی صحیح طور پر منظم نہ تھے، ان کی تعداد بھی کم تھی اور ان کو مقامی روسی باشندوں کی حمایت بھی حاصل نہ تھی لیکن پھر بھی آئندہ دو سالوں تک حکومت کی باگ ڈور ان کے ہاتھوں میں رہی۔ ان کی اس کامیابی کی بڑی وجہ ریلوے کے مزدور (جن کی وسطی ایشیا میں خاصی تعداد تھی) اور بین الاقوامی کمیونسٹ فوج تھی جو آسٹریا ہنگری اور جرمنی کے جنگی قیدیوں پر مشتمل تھی اور جنہوں نے خانہ جنگی کے دوران وسطی ایشیا میں سوویٹ اقتدار کی بنیادیں مستحکم بنائیں۔

ترکستان کے مسلمانوں میں چند ہی بالشویک لائحۂ عمل سے واقف تھے، علما جن کو مقامی باشندوں کی بھاری اکثریت کی حمایت حاصل تھی غیر منظم تھے اور ان کا اپنا کوئی سیاسی لائحۂ عمل نہ تھا۔ ان کی تمامتر کارروائیاں اسلام کی روحانی بقا کی حفاظت تک ہی محدود تھیں۔ "جدید" کے پاس صرف ثقافتی اور تمدنی تنظیم نو کا پروگرام تھا اور وہ مقامی خودمختاری کے حق میں تھے لیکن ان کے حمایتیوں کی تعداد بہت کم تھی۔ انقلاب اکتوبر کے وقت مسلمان سوویٹ اقتدار کو مسلمانوں کے مفاد کے منافی نہیں سمجھتے تھے بلکہ ان کو اخوت اور انصاف کا علمبردار سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ حکومت ایسے خوشگوار حالات پیدا کر دے گی جس میں اہل مشرق اور اسلام کا احیا ممکن ہو سکے گا۔ چنانچہ وسطی ایشیا کے آزاد خیال جدید حلقوں نے بالشویک حکومت کو پُرامید جذبات سے خوش آمدید کہا۔ علما نے فیصلہ کیا کہ اگر بالشویک حکومت جمعیت العلماء کے بنیادی مقاصد میں مداخلت نہ کرنے کا اطمینان دلا دے تو علما اُن کے ساتھ تعاون کرنے کو تیار رہیں۔ قدامت پسند علماء نے بالشویک اعلانات نعروں اور دعووں کو خلوص دل سے قبول کر لیا لیکن بعد میں ان کی یہ امیدیں خاک میں مل گئیں اور سوویٹ افعال و اقوال نے اشتراکیوں کے ببانگ دُہل نعروں کی، جو وہ تمام ممالک میں بلند کر رہے تھے، قلعی کھول دی۔

۱۵ر نومبر ۱۹۱۷ء کو علاقائی سوویٹ کانگریس اور مسلمانان وسطی ایشیا کی تیسری کانگریس تاشقند میں بیک وقت منعقد ہوئیں۔ مسلم کانگریس میں تمامتر علماء شامل تھے اور سیر ملی لاہین نے صدارت کی "جدید" اور

ان کے دوسرے رفقا کو دعوت نامے نہیں بھیجے گئے۔ کانگریس کی قدامت پسند اکثریت نے تاشقند کی حکومت سے اشتراک و تعاون کا فیصلہ کیا لیکن سوویٹ کانگریس نے اس کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور انہوں نے جو حکومت قائم کی اس میں تمام تر روسی اور یوروپی نژاد ارکان شامل تھے۔ مسلمانوں کو اس بنا پر حکومت میں نہیں شامل کیا گیا کہ

"مقامی باشندوں میں کوئی منظم ادنیٰ یا مزدور دل اور کسانوں کا طبقہ نہیں ہے"۔

الغرض یہ کہ وسطی ایشیا کے سیاسی نفاق کی وجہ سے مٹھی بھر بالشویک اور ان کے بائیں بازو کے رفقار نے مقامی باشندوں کو حکومت کے کاروبار میں حصہ نہ لینے دیا۔

تاشقند کی سوویٹ حکومت سے مایوس ہو کر علمار نے آزاد خیال شوریٰ اسلام کے ساتھ مل کر ایک متحدہ اسلامی تنظیم "اتفاق المسلمین" کی بنیاد ڈالی۔ نومبر کے آخر میں علما اور شوریٰ اسلام نے خوقند میں چوتھی مسلم کانگریس طلب کی۔ سوویٹ حکومت کا بس چلتا تو وہ اس کانفرنس کو منعقد نہ ہونے دیتی لیکن اس کے پاس اس وقت اتنی قوت و اختیار نہ تھا کہ وہ دور دراز علاقوں میں اپنا اقتدار قائم کر سکتی۔ ویسے وسطی ایشیا کے ابتر حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ کانگریس صحیح معنوں میں عوام کی نمائندگی کر رہی تھی۔ مختلف علاقوں کے مندوبین کے تناسب کا کوئی حساب کتاب نہ تھا۔ فرغانہ (جہاں خوقند واقع تھا) کے ۱۵۰ مندوبین تھے جبکہ سمرقند کے علاقے سے صرف ۲۰، ۲۲ نمائندے آئے تھے۔ کانگریس ۱۸۰ مندوبین سے شروع ہوئی اور اختتام تک یہ

تعداد ۲۰۰ سے اوپر پہنچ گئی تھی۔

کانگریس نے پہلا فیصلہ یہ کیا کہ تاشقند یا ماسکو سے تعلقات کو نہ توڑا جائے اور نہ ہی بالشویکوں کے خلاف کسی جد وجہد میں شرکت کی جائے۔ تاتاریوں اور باشقیریوں کی طرح وسطی ایشیا والوں نے بھی نہ تو سوویٹ اقتدار کو تسلیم کیا اور نہ ہی اس سے بگاڑ کیا۔ چونکہ تاشقند حکومت کو ماسکو کی حمایت حاصل تھی اس لئے خوقند کانفرنس کی نظروں میں وہ جائز قانونی حکومت تھی۔ کانفرنس کے مندوبین تاشقند حکومت سے جھگڑا مول لینے کے لئے تیار نہیں تھے اس لئے انہوں نے حکومت سے باہمی تعلقات کے سلسلے میں گفت وشنید شروع کی۔ نومبر کے آخر میں تاشقند کے فیصلے کا انتظار کئے بغیر ہی خوقند کانگریس نے ترکستان کی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ شاہ اسلام بیگ کی سرکردگی میں بہبودی، عبید اللہ خواجہ اور مصطفےٰ اچوقائی کو دستوری خاکہ مرتب کرنے کے لئے مقرر کیا گیا۔ اعلان میں اس بات پر زور دیا گیا کہ

"ترکستان کو روسی جمہوریہ کے وفاق میں علاقائی خودمختاری ہوگی۔"

اس اعلان پر سوویٹ حکومت کی طرف سے کوئی خاص رد عمل نہیں ہوا کیونکہ چند روز پیشتر ہی بالشویک مختلف اقوام کے نہ صرف حق خود اختیاری کو بلکہ مکمل افتراق اور علاحدگی کو تسلیم کر چکے تھے لہٰذا وہ وسطی ایشیا کے اس اعلان پر کھلم کھلا احتجاج نہیں کر سکتے تھے۔ علاوہ ازیں تاشقند کی سوویٹ حکومت ابھی اتنی مستحکم نہ تھی کہ وہ خوقند کے خلاف کوئی قدم اٹھا سکتی۔ کانگریس نے ایک قومی مجلس منتخب کی جس میں ۳۶ مسلمان اور ۱۸ روسی ممبر تھے۔ اس کے بعد کانفرنس نے ۱۲ ممبروں پر مشتمل ایک انتظامیہ کمیٹی

منتخب کی۔ ہر ممبر کے تحت ایک محکمہ تھا، دراصل یہ کمیٹی خود مختار ترکستان کی حکومت کی حیثیت رکھتی تھی۔

گفت و شنید کے باوجود خوقند نے تاشقند کی حکومت کو تسلیم نہیں کیا اور دونوں حکومتیں بیک وقت مختلف احکامات جاری کرتی رہیں اور عوام کو اپنی اپنی اطاعت پر مجبور کرتی رہیں۔ مثال کے طور پر خوقند شہر کی انتظامیہ تاشقند کے احکامات پر عمل پیرا رہی۔ ماسکو مصلحتاً اور عمداً اس جھگڑے سے الگ تھلگ رہا۔ جب دسمبر کے وسط میں اندیجان کی مسلم مزدوروں کی کونسل نے بذریعۂ تار استالن سے تاشقند حکومت کو برخاست کر دینے کی درخواست کی تو استالن نے جواب دیا کہ

"سوویٹ اپنے اندرونی معاملات میں خود مختار ہیں لہٰذا ترکستان کے جفاکشوں کو حکومت تاشقند کو برخاست کرنے کے لئے پیٹروگراڈ کی مدد نہیں مانگنی چاہیئے بلکہ اگر ان میں صلاحیت اور طاقت ہے تو خود اس کو منتشر کر دیں۔"

جنوری ۱۹۱۸ء میں اورن برگ پر قبضہ کر لینے کے بعد ماسکو اور تاشقند کے درمیان راستہ کھل گیا اور تاشقند کو اسلحہ جات اور دوسرا ضروری سامان بھیجا جانے لگا۔ اس صورت حال سے تاشقند کا حوصلہ بڑھ گیا اور اس نے خوقند کی حکومت کی برطرفی کا اعلان کر دیا۔ اشتراکی دستوں نے، جو آسٹریا اور ہنگری کے قیدیوں پر مشتمل تھے[1] خوقند

---

[1] یہ آسٹرو۔ ہنگری سپاہی حقیقتاً پیشہ ور لیٹرے تھے۔

کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ خوقند کی حکومت کے پاس صرف پولس کے چند دستے تھے، مقامی باشندوں نے جدید اسلحہ جات نہونے کے باوجود ہمت سے مدافعت میں حصہ لیا۔ تین دن کی لڑائی کے بعد ۱۹ ار فروری ۱۹۱۸ء کو خوقند تسخیر ہو گیا۔ مصطفےٰ چوقائی نے اس افسوسناک واقعہ کو یوں بیان کیا ہے۔

"تیسرے دن گیارہ بجکر بیس منٹ پر بالشویکی ایلچی میرے پاس نئے مطالبات لے کر آیا۔ بالشویکوں نے مطالبہ کیا

۱۔ خود مختار حکومت سوویٹ حکومت کو تسلیم کرلے۔

۲۔ ترکستانی عوام کو سوویٹ حکومت کی اطاعت کے لئے ہدایات جاری کی جائیں۔

۳۔ عوام کو غیر مسلح کر کے تمام اسلحہ جات بالشویکوں کے حوالہ کر دیئے جائیں۔

۴۔ قومی حکومتِ پولس کو برخاست و منتشر کر دے اس وقت ارکان حکومت میں سے ناصر خاں تورہ، عبید اللہ خواجہ اور عابد جان خوقند سے باہر مختلف علاقوں میں تھے۔ میرے پاس موجود ارکان حکومت کے اتفاق سے میں نے بالشویک الٹی میٹم کو رد کر دیا اور ایلچی کو جواب دیا، ہم کو تمہاری فتح کے بارہ میں کسی قسم کا شبہ نہیں ہے اس کے باوجود ہم ترکستان میں بالشویک حاکمیت کو تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہیں۔ ایلچی کے جانے کے تھوڑی ہی دیر کے بعد بالشویکوں نے کابینہ کے دفاتر کو گھیر کر گولیوں اور آگ کی زد میں لے لیا۔"

ہزاروں لوگ قتل کردیئے گئے اور کئی دنوں تک غارت گری اور لوٹ مار کا بازار گرم رہا۔ خوقند کا قدیم اور متمول شہر تاخت و تاراج کر دیا گیا اور آئندہ کئی سالوں تک تباہ و برباد پڑا رہا۔[1] ریلوے مزدوروں کے دستوں نے آکر بالآخر اس لوٹ مار کو بند کرایا۔ حالاں کہ حکومت خوقند کو شکست فاش ہوئی لیکن اس تصادم سے ایک مقامی تحریک آزادی کو جنم ملا جو تاریخ میں بقول بولشویک مورخین بصماچی تحریک کے نام سے مشہور ہوئی۔

خوقند کی فتح کے بعد تاشقند حکومت نے سمرچی پر قبضہ کر لیا مارچ میں سوویٹ فوجوں نے بخارا پر حملہ کر دیا۔ ان کو توقع تھی کہ "جوانان بخارا" ان کی مدد کریں گے لیکن ان کا یہ حملہ پسپا کر دیا گیا۔ اپریل مئی میں کوئی قابل ذکر فوجی کارروائی نہیں ہوئی لیکن جون سے ہی روس میں خانہ جنگی کے شعلوں نے ترکستان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

خانہ جنگی کے ڈیڑھ سالہ دور میں ترکستان اور ماسکو کے درمیان رابطہ ٹوٹ گیا اور تمام راستے مسدود ہو گئے، تاشقند کی سوویٹ حکومت تین محاذوں پر مصروف پیکار تھی۔ جولائی ۱۹۱۸ء میں سوویٹ فوج نے اورن برگ خالی کر دیا۔ یوروپی روس سے تمام وسائل منقطع ہو گئے ماورا کیسپین علاقے میں ریلوے کے مزدوروں نے ترکمان خانہ بدوشوں کی مدد سے بغاوت کر دی تاریخ میں سوویٹ کے خلاف مزدوروں کی یہ پہلی شورش تھی۔ سوویٹ حکومت یہاں ۱۹۲۰ء کے اوائل میں اپنا

---

[1] کیپٹن برن

اقتدار دوبارہ قائم کر سکی۔ تیسرا محاذ سمبرچی میں تھا جہاں مارچ ۱۹۲۰ء تک لڑائی جاری رہی۔ ترکمان اور قزاقوں نے گاہے بہ گاہے ان لڑائیوں میں حصہ لیا۔ سوائے فرغانہ کی بصماچی تحریک کے اُزبکوں نے کوئی حصہ نہیں لیا۔ دونوں طرف کی فوجوں میں زیادہ تر روسی تھے اور کسی بھی محاذ پر ایک وقت میں دس ہزار سے زیادہ فوجیوں نے حصہ نہیں لیا۔

۱۹۲۰ — ۱۹۱۹ء کے موسم سرما میں خانہ جنگی کا خاتمہ ہو گیا اور اس کے بعد دیہی آبادی عدم تعاون کے ذریعے مزاحمت و مخالفت کا اظہار کرتی رہی، بصماچی تحریک زور شور سے چلتی رہی اور کمیونسٹ پارٹی میں اندرونی جھگڑے شروع ہو گئے۔ سوویٹ کے خلاف بصماچی تحریک جو گوریلا لڑائی لڑ رہی تھی ۱۹۲۱ء تک پورے ترکستان میں پھیل گئی۔ ۱۹۲۰ء ۱۹۱۹ء میں اُزبیک "جدید" نے اشتراکی پارٹی میں داخل ہو کر ترکستان میں قوت و اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کی[1]

---

[1] اس دور کے حالات کے لئے مزید دیکھئے:

1. TROUBLOUS TIMES: EXPERIENCES IN BOLSHE-VIK RUSSIA & TURKISTAN. CAPT. A. B. RUN (LOND. 1931)
2. ON SECRET PATROLS IN HIGH ASIA L. V. BLACKER (LONDON 1922)
3. THE BRITISH MISSION TO TURKESTAN. W. MALLSSON. (1922)

"جدید" اور انقلاب روس

تاشقند سوویٹ کے ہاتھوں خوقند کی خود مختاری کی تباہی کے بعد وسطی ایشیا کے مسلمانوں اور بالشویکوں کے درمیان کسی قسم کے تعاون کی امید نہیں ہونی چاہیئے تھی لیکن جلد ہی تاشقند میں اُزبیکوں کے ایک گروہ نے سوویٹ حکومت سے رابطہ قائم کرنے کی خواہش ظاہر کی جس کی وجہ سے بعد میں سوویٹ اقتدار کو وسطی ایشیا میں مستحکم ہونے میں بڑی مدد ملی۔ یہ لوگ آزاد خیال "جوانان بخارا" تھے جو امیر کے خلاف جد وجہد میں ساتھی تلاش کر رہے تھے۔ انقلاب فروری کے اوائل میں پیٹرو گراڈ کی تقلید کرتے ہوئے ان لوگوں نے بخارا میں آئینی حکومت کی داغ بیل ڈالنے میں کامیابی حاصل کرلی تھی۔ روس کے حالات سے پریشان ہو کر امیر بخارا نے مجبوراً "جوانان بخارا" کے مطالبات کو تسلیم کرلیا اور مارچ ۱۹۱۷ء میں ایک منشور[1] کے ذریعے انہوں نے اصلاحات اور دستور نافذ کرنے کا وعدہ کیا۔ امیر کے رجعت پسند مشیروں کو جلا وطن کر دیا گیا اور ایسا لگنے لگا کہ بالآخر جمہوریت اور دستور سازی

---

[1] J. BENZING TURKESTAN (BERLIN. 1943)

کو قدیم بخارا میں سانس لینے کا موقع مل جائے گا۔

خلاف توقع بخارا کے قدامت پسندوں نے اپریل کے شروع میں امیر کے مشیر نظام الدین خواجہ کی رہنمائی میں جلاوطنی سے لوٹ کر آزاد خیال طبقے کے خلاف مہم شروع کر دی، اور عوام کے جذبات کو بدلنے میں کامیاب ہو گئے عوام نے اب بجائے دستور اور آئین کے دہریت پسند "جدید" کی سزاؤں کا مطالبہ شروع کر دیا۔ ہر طرف رجعت پسندی کا دور دورہ ہو گیا[۵۱] اور بیشتر "جوانان بخارا" گرفتار کر لئے گئے کچھ فرار ہو گئے اور جو رہ گئے ان میں سے اکثر کو اذیتیں دے دے کر ہلاک کر دیا گیا۔ روسی سفیر کی مداخلت اور فوجی کارروائی کی دھمکی نے بالآخر "جوانان بخارا" کی جان چھڑائی۔

"جوانان بخارا" نے پھر بھی ہمت نہ ہاری اور انقلاب اکتوبر کے بعد ان میں سے ایک گروہ نے خوقند جا کر وہاں منعقد ہونے والی مسلم کانگریس کی امداد حاصل کرنے کی کوشش کی اور پھر وہاں سے تاشقند کا رخ کیا۔ اس وفد کی رہنمائی فیض اللہ خواجہ کر رہے تھے جو بخارا کے ایک متمول خاندان کے فرد تھے۔ مارچ ۱۹۱۸ء میں فیض اللہ نے تاشقند سوویٹ کے سربراہ کو بخارا کے خلاف ایک فوجی مہم روانہ کرنے پر آمادہ کر لیا۔ یہ مہم ناکام ہو گئی اور سوویٹ فوج بمشکل تمام جان بچا کر لوٹ سکی[۵۲] بچے کھچے "جوانان بخارا" روپوش ہو کر سمرقند اور تاشقند

---

۵۱ عینی ماسکو ۱۹۳۰ء

۵۲ فوج کی نفری تقریباً ہزار نفوس پر مشتمل تھی۔

چلے گئے جہاں وہ آئندہ دو سال تک سیاسی تارکینِ وطن کی حیثیت سے رہتے رہے۔ یہاں انہوں نے "جدید" سے متحد ہو کر سوویٹ اقتدار کے ساتھ مکمل تعاون کی وکالت شروع کر دی۔ "جدید" نے بھی کمیونسٹ پارٹی سے پینگیں بڑھانا شروع کر دیں اور بالآخر ۲۰-۱۹۱۹ء میں انہوں نے پارٹی کے اندر بہت کافی اقتدار اور رسوخ حاصل کر لیا۔

بخارا کے ناخوشگوار معرکے سرخ فوجیوں کے ہاتھوں مقامی باشندوں کی تباہی و غارت گری اور تاشقند کے حکمرانوں کی غیر سوشلسٹ کارروائیوں نے بالآخر ماسکو کی توجہ ترکستان کی جانب مبذول کرا دی تاشقند کا حکمران طبقہ جس میں زیادہ تر بالشویک اور بائیں بازو والے شریک تھے اپنی کارروائیوں سے ایشیا میں روسی حکمت عملی کو زک پہنچا رہا تھا۔ اس صورت حال کو درست کرنے کے لئے اپریل ۱۹۱۸ء میں ماسکو نے ایک خاص نمائندہ کوبوزیو (KOBOZEV) کو تاشقند روانہ کیا جس نے وسط ایشیائی سوویٹ کی پانچویں کانگریس طلب کر کے خود مختار جمہوریہ ترکستان کے قیام کا اعلان کر دیا۔ کانگریس نے ترکستان کی نئی مرکزی انتظامیہ کمیٹی کا انتخاب کیا جس کے ۲۶ ممبروں میں سے ۱۰ مسلمان تھے۔ یہ بیشتر "جدید" تھے۔ لیکن حکمراں طبقے کو آئندہ سال بھر تک کے لئے ماسکو کی براہ راست مداخلت سے آزادی رہی اور یہ مقامی باشندوں کی شرکت کے بغیر حکومت چلاتے رہے۔

کوبوزیو کی زیر نگرانی خود مختار جمہوریہ اور مقامی کمیونسٹ پارٹی کی تنظیم جاری رہی۔ جولائی میں پہلی علاقائی پارٹی کانگریس جمع ہوئی جس میں

وسطی ایشیا کی کمیونسٹ پارٹی کی بنیاد رکھی گئی۔ اس کانگریس کی ترتیب سے ہی ترکستان میں سوویٹ نظام کی اصلیت اور کمزوری کا پتہ چل گیا۔ اجلاس کے وقت پورے وسطی ایشیا میں پارٹی کے ۱۵۰۰ ممبر تھے جن میں سے ۵۰ کانگریس میں بحیثیت مندوبین شریک ہوئے اور اس میں صرف ۵ مسلمان تھے۔ تاشقند کے شہر میں جس کی لاکھوں آبادی تھی صرف ۲۵۰ یوروپی اور ۵۰ مسلم کمیونسٹ تھے۔

ماسکو کے دباؤ سے اور کوبوزئیو کی رہنمائی نے کانگریس میں مقامی مسلمانوں سے تعاون کے سلسلے میں کئی قرار دادیں منظور کیں جن میں کہا گیا کہ:

۱۔ پارٹی تنظیم کے ساتھ مسلمان شعبے ملحق کئے جائیں۔

۲۔ "مسلمان" زبان کو روسی زبان کے شانہ بہ شانہ سرکاری زبان کا درجہ دیا جائے۔

۳۔ "مسلمان" زبان میں رسالے اور جرائد شائع کئے جائیں۔

۴۔ نظم ونسق میں ایسے تجربےکار لوگوں کو شامل کیا جائے جو مقامی حالات سے واقف ہوں۔

۵۔ مسلمانوں کے فوجی دستے قائم کئے جائیں۔

۶۔ اشتراکی مطبوعات کو مقامی زبانوں میں شائع کیا جائے۔

ترکستان کی مرکزی انتظامیہ کمیٹی نے اپنے طور پر حسب ذیل فیصلے کئے

۱۔ مسلمانوں کی زبان کو سرکاری زبان تسلیم کیا جائے۔

۲۔ مقامی باشندوں، روسیوں اور دوسرے یوروپی باشندوں کے حقوق میں مساوات قائم کی جائے۔

۳۔ مسلمان کسانوں اور ادنیٰ طبقے کی فوری تنظیم کی جائے لیکن حکمران جتھا ان سب باتوں کے باوجود مقامی آبادی سے اتحاد اور اشتراک کرنے کے لئے ٹال مٹول کرتا رہا۔ یہ قرار دادیں ڈیڑھ ماہ تک شائع نہیں کی گئیں اور تاشقند سوویٹ نے نومبر تک ان کے اطلاق کے لئے کوئی قدم نہیں اٹھایا۔

اُدھر حکومت تاشقند خانہ جنگی، اندرونی خلفشار، تاوان اور ٹیکسوں کی وصولیابی اور اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے کی کوششوں میں مصروف تھی۔ لینن کی حکومت اور خصوصاً اسٹالن کے محکمۂ امور برائے اقوام کو اس بات کا پورا پورا احساس تھا کہ تاشقند حکمرانوں کی حرکتوں سے ایشیائی انقلاب کے منصوبوں کو تقویت نہیں پہنچ رہی تھی۔ ترکستان کی مرکزی انتظامیہ کمیٹی کے سلسلے میں جو نیم سوشلسٹ تھی ماسکو تذبذب میں تھا کیوں کہ ذرائع آمد و رفت بند ہو جانے کی وجہ سے فوجوں کی نقل و حرکت ممکن نہ تھی اور اگر تاشقند کو مجبور کیا جاتا تو عین ممکن تھا کہ وہ سوویٹ دائرۂ اقتدار سے نکل جاتا۔ چنانچہ ماسکو نے احتیاط سے کام لیتے ہوئے مقامی مسلمانوں میں کمیونسٹ پارٹی کی تنظیم کرنے کے لئے فروری ۱۹۱۹ء میں کوبوزئیو کو دوبارہ روانہ کیا۔

اس دفعہ کوبوزئیو کو نمایاں کامیابی ہوئی۔ لینن کی نظم و نسق کو مقامی ہاتھوں میں دینے کی پالیسی کی مخالفت تقریباً مفقود ہو چکی تھی۔ وسط

ایشیائی سوویٹ کی ساتویں کانگریس میں آدھے مندوبین مسلمان تھے جو کہ زیادہ تر " جدیدچیوں " سے تعلق رکھتے تھے ۔ مئی ۱۹۱۹ء کے آخری ہفتے میں وسطی ایشیا کے کمیونسٹ مسلمانوں کی پہلی کانفرنس شروع ہوئی ۔ اس میں اُزبیک اشتراکیوں نے اپنی سیاسی مشکلات کا رونا رویا اور تقریباً ہر نمائندے نے بیباکی سے پارٹی ، تاشقند کی سوویٹ حکومت اور مرکزی انتظامیہ کمیٹی پر کڑی تنقید کی ۔

اُزبیک اشتراکیوں نے آرمینیا کے فوجی دستوں کو ، جنہوں نے خوقند کی تباہی میں نمایاں حصہ لیا تھا اور جس سے مسلمان سخت نفرت کرتے تھے توڑنے کا مطالبہ منظور کروالیا ۔ اس کے علاوہ کانفرنس نے اہل مشرق سے اپیل کی کہ

" ہندوستان ، افغانستان ، ایران ، چین ، بخارا ، ایشیائے کوچک اور مشرقِ ایشیا کے مظلوم جفاکشوں کو —— خواہ وہ کہیں بھی ہوں کسی بھی جگہ ہوں انقلاب لانے میں مدد کریں "

اس سلسلے میں وسطی ایشیا کے اشتراکی مُلا وحید (تاتار) ، سُلطان آغا اور دوسرے مسلمان اشتراکیوں کی تقلید کر رہے تھے جو کہ انقلاب کو مغرب کی جارحیت سے نجات دلانے کا ذریعے سمجھتے تھے ۔

ماسکو اور کو بوزیٹو کی ان مسلسل کوششوں کا کہ پارٹی میں زیادہ سے زیادہ مسلمان شامل ہوں نتیجہ یہ نکلا کہ " جدید " کثیر تعداد میں سوویٹ تنظیم میں داخل ہوگئے ۔ پارٹی کی تیسری علاقائی کانگریس نے جو یکم جون

۱۹۱۹ء کو تاشقند میں شروع ہوئی ۱۱ ممبروں میں سے ۴ مسلمان تھے جن میں سے ۳ ممتاز "جدید" تھے۔ تین ماہ بعد جب سوویٹ کی آٹھویں کانگریس منعقد ہوئی تو اس کامیابی کا اظہار مرکزی انتظامیہ کمیٹی میں بھی ہوا اور انتظامیہ کمیٹی میں مسلمانوں کی اکثریت منتخب ہوگئی۔ جنوری ۱۹۲۰ء میں جب پانچویں علاقائی کانگریس ہوئی تو تمام ارکان مسلمان تھے اور اس طرح "جدید" کے اقتدار اور اثر ورسوخ کو مزید استحکام پہنچا۔

سوویٹ وسطی ایشیا میں ان دوررس تبدیلیوں کی تاشقند کے حکمراں جتھے نے سخت مخالفت کی لیکن اس وقت کوبوزیئو اور ان کے مسلمان رفقا کو ماسکو کی پوری حمایت حاصل تھی۔ انہوں نے ایک تار کے ذریعے مطالبہ کیا کہ مقامی آبادی کو تناسب کے لحاظ سے انتظامیہ میں نمائندگی دی جائے۔ اور مزید یہ کہ سوویٹ کے عہدیداروں کا انتخاب مسلمان مزدوروں میں سے کیا جائے خواہ وہ اشتراکی نہ بھی ہوں۔ یہ بات بالکل واضح تھی کہ ماسکو نے باشقیریا اور قزاقستان میں مصالحت کے بعد وسطی ایشیا کے "جدید" سے صلح صفائی کے ساتھ تعلقات قائم کرنے کا تہیہ کیا ہوا تھا، حالاں کہ اسٹالن دوسرے تنازعات میں الجھے ہوئے تھے مگر ان کے ذہن میں مشرق میں انقلاب لانے کا منصوبہ برقرار تھا اور اس میں وسطی ایشیا کا اہم کردار تھا۔ علاوہ ازیں سرخ فوجیں وسطی ایشیا کی جانب پیش قدمی کر رہی تھیں اور اب ماسکو بلاخوف وخطر تاشقند کے حکمراں جتھے کو ہٹا سکتا تھا۔

اگر ماسکو کی مرکزی کمیٹی اور عوامی کونسل کا کوبوزیئو کے علاوہ تاشقند میں کوئی اور نمائندہ بھی ہوتا تو اس کو فوراً احساس ہو جاتا کہ کوبوزیئو

حد سے آگے بڑھ چکے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ ان ہی کی کوششوں سے پارٹی کو تاشقند کے ان حکمرانوں سے نجات حاصل ہوئی تھی جنہوں نے مسلمانوں کے ساتھ بدسلوکی کر کے مشرق میں پارٹی کی حیثیت کو زک پہنچائی تھی لیکن ان آباد کاروں کی جگہ "جدید" اشتراکیوں نے سنبھالی تھی جنہوں نے عنان حکومت ہاتھ میں آنے پر اپنے اصلی ارادوں کو ظاہر کرنا شروع کیا۔ پارٹی کی پانچویں علاقائی کانگریس جس نے اکثریت سے مسلمان مند وبین کو منتخب کیا اور اسی کے ساتھ ہونے والی مسلمان اشتراکیوں کی تیسری کانفرنس نے ترکستان کو خود مختار ترک جمہوریہ بنانے کا اعلان کر دیا۔ انہوں نے مسلم اشتراکی پارٹی کا نام بدل کر "ترک اشتراکی پارٹی" کر دیا۔ مسلمان اشتراکیوں نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کی۔ انہوں نے خود اپنی انقلابی تحریک شروع کرنے کا فیصلہ کیا جس میں روس کے ترک نژاد باشندوں کو ایک متحدہ علاقائی اور سیاسی وحدت میں پرو دیا جا سکے۔ بالفاظ دیگر وہ تاتاریوں کی تقلید کر رہے تھے لیکن اس دفعہ بجائے قازان کے تاشقند اس تحریک کا مرکز تھا۔ اُزبیک اشتراکیوں کا مطمح نظر یہ تھا کہ:-

۱- روس کے تمام ترک نژاد لوگوں کو ترک سوویٹ جمہوریہ یعنی جمہوریۂ ترکستان کے گرد متحد کر دیا جائے۔

۲- دوسری ترک نژاد اقوام کو جو سلطنت روس کا حصّہ نہیں تھیں یعنی افغانستان، چین، ایران اور ترکی کے ترکوں کو بھی اس سیاسی وحدت کا فرد بنا دیا جائے۔

۳- سوویٹ روس کے ان ترک نژاد لوگوں کو جو جمہوریہ ترکستان

کا جزو نہیں تھے مثلاً باشقیریا کے تاتار انہیں ایک بڑی علاقائی سالمیت میں مدغم کر دیا جائے۔

ان قرار دادوں کے پس پردہ ترک قومیت کے جذبات چھپے ہوئے تھے اور جن کا سیاسی مقصد یہ تھا کہ وسطی ایشیا کی اشتراکی پارٹی کو قوم پرست ترک اشتراکی پارٹی میں تبدیل کر کے تمام اقتدار "جدید" اشتراکیوں کے ہاتھوں میں آجائے۔ ماسکو کی مرکزی حکومت کو اس کا چنداں احساس نہیں تھا کہ حالات اس کے قابو سے باہر ہوتے جا رہے ہیں اور ترکستان کی اشتراکی پارٹی نے ایک ایسا رُخ اختیار کر لیا ہے جو پارٹی کی عام ڈگر سے ہٹ کر لینن کے بنیادی اصولوں سے بالکل مختلف تھا اور جس کے مقاصد ترک قوم پرستوں کے عین مطابق تھے۔

اُزبیک "جدید" جن کا پارٹی اور نظم و نسق پر کُلّی اختیار تھا سچے دل سے انقلاب پسند تھے اور انہوں نے اہل مشرق سے متعدد بار "سامراجیت ملائیت اور جاگیرداری" کا جُوا اتار پھینکنے کی اپیل کی۔ لیکن ان کے یہ جذبات سوشل اور اقتصادی حالات کی مخالفت سے زیادہ ملائیت اور سامراجیت کے خلاف ردعمل تھے۔ "جدید" یا تو تجارت پیشہ طبقے سے تعلق رکھتے تھے یا مدرسوں کے تعلیم یافتہ طبقے سے متعلق تھے۔ روسی یا مسلمان مزدوروں سے ان کا دور کا بھی لگاؤ نہ تھا اور وہ طبقاتی جدوجہد کے نظریئے اور عوام الناس کی آمریت سے منکر تھے۔ اس مسئلے میں وہ اسمٰعیل بے کے پیرو تھے۔ جنہوں نے ۱۹۰۵ء میں کہا تھا کہ مسلمانوں کا زرعی معاشرہ طبقاتی درجوں میں نہیں بٹا ہوا ہے اور اس لئے اس میں کسی طبقاتی کشمکش کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔ ۱۹۲۰ء میں یہ نظریہ اشتراکی

پارٹی اور "جدید" کے درمیان تنازعی مسئلہ بن گیا۔

"جدید" کا ترک اتحاد میں یقین اور طبقاتی کشمکش کی تردید کا اظہار ان کی تعلیمی اور پارٹی میں ممبروں کی بھرتی کی پالیسی میں ہوا۔ نئے نظم و نسق کے تحت، جو وسطی ایشیا میں "جدید" کے ہاتھوں میں تھا، جو اسکول کھولے گئے ان میں بجائے مارکس نظریات کے ترک قوم پرستی کے سبق پڑھائے جاتے تھے اور عوام الناس کے اتحاد کے بجائے ترک اتحاد کی تعلیم دی جاتی تھی۔ تاشقند کی نئی حکومت میں محکمۂ تعلیم بجائے کسی اُزبیک کے سلطنت عثمانیہ کے ایک افسر توپ خانہ آفندی کے زیر تحت تھا۔ ترکستان کی اشتراکی پارٹی کے "جدید" بجائے ماسکو کے استنبول اور انقرہ سے جہاں کمال پاشا مغربی طاقتوں کے خلاف نبرد آزما تھے، ہمدردی اور دلچسپی رکھتے تھے "جدید" رہنماؤں کی تقریروں میں بجائے طبقاتی جدوجہد اور بین الاقوامی نظریات کے اپنے ملک کے مستقبل کا تذکرہ ہوتا تھا۔ "جدید" کے ایک ممتاز مفکر ارسکول نے کہا۔

> "ترک قوم پرستوں کو ترکستان کے لوگوں سے متعلق اشتراکیوں کی تاریخی غلطی کا ازالہ کرنا ہوگا —— ترک اشتراکی نہ صرف کارخانے اور ریلوے کے مزدوروں کی بھلائی کے لئے لڑ رہے ہیں بلکہ ان لوگوں کے ساتھ گھل مل کر جو ہزاروں میل لمبے چوڑے ریگستانوں میں آباد ہیں ان کے ثقافتی اور معاشی مفادات کا تحفظ کرنا بھی لازمی ہے۔"

انہوں نے اُزبیلوں اور قزاقوں سے اپیل کی کہ وہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں پارٹی میں شریک ہوں اور رضاکاروں کی تعداد بڑھائیں۔ ان

کا ارادہ تھا کہ اس طرح وہ سوویٹ نظام اور فوج میں ترک محبان وطن کی مدد سے وسطی ایشیا میں "جدید" کا اثر و رسوخ مستحکم بنا سکیں گے۔

نومبر ۱۹۱۹ء میں ماسکو سے مرکزی کمیٹی اور سوویٹ حکومت نے ایک خصوصی کمیشن برائے ترکستان تاشقند روانہ کیا[۱]۔ اس کے ارکان وسطی ایشیا کے معاملات سے نابلد تھے اور وہ "جدید" کی سیاسیات کو قطعاً نہ سمجھ سکے۔ اس کمیشن کا مقصد پارٹی اور نظم و نسق کی از سر نو تنظیم کرنا تھا۔ انہوں نے فوراً ہی تاشقند کے حکمران جتھے کے بچے کھچے افراد کو پارٹی اور نظم و نسق سے علٰحدہ کر دیا اور ان میں سے کچھ جلاوطن بھی کر دیئے گئے۔ ۱۹۲۰ء کے اوائل میں جب ترک اشتراکیوں نے ترکستان مرکزی انتظامیہ کمیٹی میں کُلی اختیارات حاصل کر لئے تو کمیشن کی طرف سے کوئی ردعمل نہیں ہوا۔ چند ماہ کے بعد کمیشن پر اس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ تاشقند کے پُرانے سوشلسٹ حکمرانوں کی جگہ ترک قوم پرستوں نے لے لی ہے۔ ترکستان میں واحد سرخ فوج کے کمانڈر فرنز کو اس صورت حال سے بڑی تشویش پیدا ہوئی۔ سُرخ فوج کی تعداد اس وقت سولہ ہزار تھی جس میں سے زیادہ تر وسطی ایشیا کے دور دراز علاقوں میں سفید افواج اور فرغانہ کے بصماچیوں سے مصروف پیکار تھے، باقیماندہ تاشقند اور دوسرے شہری علاقے کی حفاظت پر متعین تھے۔ انہوں نے اپنے

---

[۱] کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی نے ۳ر اکتوبر ۱۹۱۹ء کو ایک قرارداد کے ذریعہ اس کمیشن کو قائم کیا۔

مراسلات میں اس بات کا اظہار کیا کہ

"پارٹی کے مسلمان لیڈروں کا ایک مختصر سا گروہ
تمام تر قوت واقتدار اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتا ہے
وہ نظم ونسق میں صرف مسلمانوں کو جگہ دینا چاہتے ہیں
اور ترکستان کمیشن کی مخالفت کرنے پر آمادہ ہیں"[۱]

اشتراکی پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے بنائے ہوئے منصوبوں کی جگہ ترک قومیت کو لانے کی جد وجہد میں "جدید" اشتراکیوں کو دوسری تمام سوویٹ جمہوریہ کے مسلمان اشتراکیوں کا تعاون بھی حاصل تھا اغلباً "جدید" نے والگا۔یورال خطے اور قزاقستان کے ترک رہنماؤں سے باہمی تعاون واتفاق کا معاہدہ کر رکھا تھا۔ الغرض یہ کہ اُزبیک "جدید" نے پارٹی اور مرکزی انتظامیہ پر قبضہ کرتے ہی ترکستان کمیشن سے، جو اب ان کی مخالفت کر رہا تھا، تعلقات منقطع کر لئے۔ دوسرے مسلمان علاقوں کے حالات دیکھ کر "جدید" کی ہمت وحوصلہ بہت بڑھ گیا ان کے منصوبوں اور ارادوں کو تکمیل تک پہنچانے کے لئے وقت بھی مناسب تھا۔ ماسکو میں باشقیر لیڈر احمد ذکی ولیدی کئی ماہ سے باشقیریا کی خودمختاری کی بحالی کی وکالت کر رہے تھے۔ اُزبیک رہنماؤں کے کہنے پر ولیدی نے ترکستان کمیشن کے ارکان میں ردّ وبدل کروا کر ترک اور غیر ترک ارکان کا تناسب برابر کروانے کی کوشش کی۔ لینن نے جن کے ساتھ ولیدی اور ترکستان کے نمائندے بات چیت کر رہے تھے

---

۱ فرنز کے مراسلات بنام سپہ سالار افواج روس۔

کئی ہفتوں تک کوئی یقینی جواب نہیں دیا۔ تیسرے "انٹرنیشنل" (اشتراکی اجتماع) کی دوسری کانگریس کے لئے لینن نے جو مقالات لکھے ان میں مسلمان اشتراکیوں سے گفت وشنید کا ذکر موجود ہے۔ انہوں نے باشقیریا، قزاقستان اور ترکستان کے مسائل کا تذکرہ کرتے ہوئے اتحاد اسلامی کے خطرے کا ذکر کیا لیکن کانگریس کی تقاریر میں انہوں نے مسلمان اشتراکیوں کی کارروائیوں کے ذکر سے گریز کیا اور اس امر کی یقین دہانی کی کہ

"سوویٹ تحریک کے اثرات تمام مشرق، کل ایشیا اور تمام مغلوب اقوام میں پھیل چکے ہیں"[۱]

لینن نے مسئلے کو معرض التوا میں ڈالنے کے لئے ولیدی کو اسٹالن کے پاس بھیجدیا جو کہ اس وقت یوکرین کی فوجی کارروائیوں میں مصروف تھے اور انہوں نے بھی کوئی صاف صاف جواب نہیں دیا۔

مرکزی کمیٹی نے ترکستان کمیشن میں کسی مسلمان کو مقرر کرنے سے انکار کردیا اور ان کے بجائے دوسرے افراد کو، جو کہ نہ تو روسی تھے اور نہ مسلمان، مقرر کیا تاکہ وہ غیر جانبداری سے ثالثی انجام دے سکیں ان افراد کے تقرر ہی سے یہ بات واضح ہوگئی تھی کہ اب "جدید" اشتراکی اپنے خفیہ عزائم کو پوشیدہ نہ رکھ سکیں گے۔ کمیشن نے فوراً ہی ازبیک اشتراکیوں کے عزائم کو بھانپ لیا جن کا مقصد یہ تھا کہ

۱۔ سوویٹ آلہ کار پر قبضہ کرلیا جائے۔

---

۱ LENIN: "SOCHINENIIA

۲۔ تعلیمی اداروں کو قوم پرستی کے پرچار کا اڈا بنا دیا جائے۔

۳۔ بصماچیوں کی مدد کی جائے۔

اس کے علاوہ کمیشن کے مخبروں نے اطلاع دی کہ "جدید" اشتراکیوں نے ایک خفیہ تنظیم "اتحاد و ترقی" قائم کی ہے جس کے ارکان میں روس کے ترک اشتراکیوں کے رہنما اور وسطی ایشیا کے دوسرے رہنما بھی شامل ہیں۔

اگست ۱۹۲۰ء میں امیر بخارا کی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا اور اس سے وسطی ایشیا میں سوویٹ قوت کو مزید استحکام پہنچا بخارا کی مہم عین مناسب وقت پر شروع کی گئی تھی جبکہ مغربی محاذ پر سوویٹ افواج کو کامیابیاں ہو رہی تھیں اور خانہ جنگی اختتام پر تھی۔ تاشقند میں "جدید" کی کامیابیاں دیکھ کر "جوانان بخارا" نے بخارا میں اقتدار حاصل کرنے کی سعی کی۔ ترکستان کمیشن اور ازبیک اشتراکیوں کے زیر اثر انہوں نے بخارا کے اشتراکیوں سے مل کر متحدہ محاذ بنا لیا اور اس میں وہ بالآخر مدغم ہو گئے ۲۹ر اگست کو سُرخ افواج نے بخارا کی سمت پیش قدمی شروع کی اور دو دن کی گھمسان جنگ کے بعد شہر پر ان کا قبضہ ہو گیا[۵] امیر بخارا پہاڑیوں میں رُو پوش ہو گئے جہاں سے انہوں نے حمایت حاصل کرنے کی کوششیں کیں۔

سرخ افواج کے پیچھے پیچھے "جوانان بخارا" دارالحکومت میں داخل ہوئے اور حکومت کا بند و بست شروع کیا۔ انہوں نے بخارا کو عوامی

---

[۵] فرنز کے بیان کے مطابق چار ہزار روسی سپاہ کے مقابلہ امیر بخارا کے پاس ۵ ہزار فوج تھی

جمہوریہ قرار دیا لیکن ان کے نظام حکومت میں کوئی بات بھی اشتراکیوں یا سوشلسٹوں سے مطابقت نہ رکھتی تھی۔ تمام تر اقتدار دو متمول تاجر مقسوم اور خواجہ خاندانوں کے ہاتھوں میں تھا جو عرصۂ دراز سے بخارا میں حریت پسند تحریک کے علمبردار تھے[۱] "جوانان بخارا" نے قرآن اور شریعت کے نام پر حکومت کا نظام قائم کیا اور عوام سے وعدہ کیا کہ وہ یوروپ کی سوشلزم کے خلاف پوری شدّ و مد سے جنگ کریں گے۔ ان کے تعلیمی منصوبوں میں بھی اشتراکیت کے بجائے اتحاد اقوام ترک کی جھلک تھی۔ بڑی جماعتوں میں عثمانی ترکی تعلیم لازمی قرار دی گئی تھی۔ ان کا لائحہ عمل ان امور پر مبنی تھا کہ وہ ملائیت کی زیادتیوں کو دور کریں گے اور ایشیا سے یوروپ کے صنعت گروں اور کارخانہ داروں کو نکال باہر کریں گے نظم و نسق کو بہتر بنائیں گے اور امرا اور جاگیرداروں کی جائدادوں کو ضبط کرلیں گے۔ انہوں نے عوام الناس کی حکومت قائم کرنے یا ذاتی املاک کو ختم کرنے کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔ "جوانان بخارا" کا لائحۂ عمل اشتراکیت سے زیادہ قومیت پر مبنی تھا۔

بخارا اور اس کے ساتھ ساتھ خیوا میں جو سیاسی نظام قائم ہوا وہ مشرق وسطیٰ میں اس وقت کے متوسط طبقے کے معاشرے کی اساس پر اشتراکی تسلط کے تحت مبنی تھا۔ یہ عوامی جمہوریت کا پہلا تجربہ تھا اشتراکیوں کی رائے میں لینن کے وضع کردہ سوویٹ نظام تک پہنچنے کے لئے یہ ایک

---

[۱] مرزا عبدالقادر مقسوم وزیر اعظم اور فیض اللہ خواجہ وزیر خارجہ مقرر ہوئے۔

عوامی دور تھا[1] بہرکیف عوامی جمہوریہ بخارا نے غیر اشتراکی سیاسی جماعتوں اور جتھوں کا خاتمہ کر دیا اور اس بات کا کوئی احتمال نہیں رہا کہ بخارا بیرونی حملہ آوروں کا اڈا بن سکے۔ اس وقت "جوانان بخارا" اور بالشویک حکام کے خواب وخیال میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ سال بھر کے اندر اندر بصماچی تحریک پورے وسطی ایشیا میں سوویٹ اقتدار کیلئے خطرہ بن جائے گی۔

فتح بخارا کے وقت عوام مشرق کی پہلی کانگریس باکو میں منعقد ہونیوالی تھی جو کہ ایشیا میں بالشویک انقلابیوں کے قوت واقتدار کی آئینہ دار تھی۔ اس میں نہ صرف روس کی تمام ترک نژاد اقوام نے شرکت کی بلکہ ایشیا کی اکثر آزاد اور مقبوضہ ریاستوں کے نمائندوں نے بھی شرکت کی تسخیر بخارا اور کانگریس کے انعقاد نے جس کے بانی مبانی تیسری "انٹرنیشنل" کے رہنما تھے، مشرق میں سوویٹ وقار کو بڑی شہرت و ناموری پہنچائی۔

"جدید" کو یہ غلط فہمی تھی کہ لینن اور ٹراٹسکی ترکستان کے اصلی حالات سے ناواقف ہیں۔ ادھر سوویٹ حکومت اور اشتراکی قیادت نے طے کیا کہ اب "جدید" کے خلاف مناسب اقدام اٹھانے کا وقت آگیا ہے۔ ترکستان کمیشن کے مشورے سے جلد ہی "جدید" کو تمام اہم سیاسی اور انتظامی عہدوں سے سبکدوش کر دیا گیا۔ "جدید" اشتراکیت کو مقبول عام بنا چکے تھے اور انقلابی تحریکیں اپنا قدم جما چکی تھیں اب "جدید" کی

---

[1] حکومت کا کاروبار چلانے کے لئے سوویٹ نے دو مشیر مقرر کئے تھے۔ بحوالہ ذکی ولیدی

بقا مفید کم اور خطرناک زیادہ تھی ۔ باکو میں "جدید" کی تقاریر لینن اور ٹراٹسکی کی نگاہوں میں نہ صرف فضول بلکہ اشتعال انگیز تھیں، علاوہ ازیں "جدید" غیر معتبر لوگوں کو پارٹی میں بھرتی کر رہے تھے اشتراکی نقطۂ نظر سے اور ترکستان میں پارٹی ترک قوم پرستی کا گہوارہ بنتی جا رہی تھی ۔

سامراجیت اور متوسط طبقے کے اثر و رسوخ کو ختم کرنے کے بعد ان اُزبیک اشتراکیوں کی جن میں اکثریت "جدید" کی تھی، باری آئی جو عوام الناس کی مطلق العنانی اور طبقاتی جد و جہد کے حامی نہیں تھے بلکہ ترک قوم پرستی کے نظریات کا پرچار کرتے تھے ۔ ستمبر میں فوج کی مدد سے ترکستان کمیشن نے تمام ممتاز "جدید رہنماؤں کو برطرف کر دیا اور ان کی جگہ ماسکو نے نئے ارکان کو نامزد کر دیا ۔ حالانکہ ان میں اکثریت ازبیکوں اور قزاقوں کی تھی لیکن "جدید مفکروں کے برعکس ان کا صنعت کار اور مزدور پیشہ طبقے سے تعلق تھا جو ماسکو کے وفادار پیرو تھے ۔ اس طرح دو تین سال کی آزادی اور خود مختاری کے بعد ترکستان کی علاقائی اشتراکی پارٹی بالآخر ماسکو کے زیر نگیں ہو گئی اور اس کا ترک کردار ختم ہو گیا ۔ حالانکہ "جدید" کو تمام سیاسی اور انتظامی اداروں سے علیحدہ کر دیا گیا تھا مگر ان کو پارٹی میں رہنے کی اجازت دیدی گئی ۔

ترکستان میں پارٹی کے ڈھانچے اور نظم و نسق میں تبدیلیاں جاری رہیں البتہ مقامی باشندوں کو چند چھوٹی موٹی مراعات خصوصاً مذہبی اور تعلیمی امور میں بخشی گئیں ۔ اتوار کے بجائے جمعہ کو عام تعطیل مقرر کی گئی[1] اور

---

[1] پراودا مورخہ ۱۱ر پراودا ۱۹۲۱ء

انتظامیہ، پارٹی اور ڈاک و تار کے محکمے میں اُزبیک زبان جاری کی گئی[1] اور بہت سے مقامی لوگوں کو نظم و نسق میں حصہ دیا گیا۔ اپریل ۱۹۲۱ء میں اشتراکی پارٹی کی مرکزی انتظامیہ کمیٹی نے جمہوریہ ترکستان میں نیا دستور نافذ کیا جس کی رو سے سوویٹ روس کے اندر خود مختار سوویٹ سوشلسٹ جمہوریہ ترکستان کا ظہور رہوا لیکن ۱۹۲۴ء تک بخارا اور خیوا اس جمہوریہ میں شامل نہیں تھے۔ اس دستور کی رو سے خارجہ پالیسی، مسلح افواج اور بیرونی تجارت تاشقند کے دائرہ اختیار سے باہر تھی۔

مرکزی حکومت کے ساتھ رابطہ قائم رکھنے کے لئے ایک عارضی کمیشن مقرر ہوا جس کے فرائض یہ تھے

۱۔ ان امور کی نگہداشت کرنا جو خصوصی طور پر مرکزی حکومت کے تحت تھے۔

۲۔ تاشقند میں ماسکو کے قوانین سے مماثل قوانین کا نفاذ۔

۳۔ مرکزی حکومت کی انتظامیہ ہدایات پر عمل در آمد کی نگرانی[2]۔

۱۹۲۴ء میں روس کے صوبہ ترکستان خیوا اور بخارا کی حدود ختم کر دی گئیں اور ان کی جگہ قومیت کی اساس پر ۴ نئی جمہوریہ قائم کی گئیں جن کے نام یہ تھے۔ ۱۔ اُزبکستان۔ ۲۔ قرغیزیہ۔ ۳۔ ترکمانستان اور ۴۔ تاجکستان۔ ان میں سے ازبکستان اور ترکمانستان کو فوری طور پر سوویٹ یونین میں مکمل رکنیت کا درجہ دیدیا گیا۔ تاجکستان ازبکستان کے اندر خود مختار رہا اور ۱۹۲۹ء

---

[1] 〃 〃 ۱۸ر جنوری ۱۹۲۱ء

[2] 〃 〃 ۱۴ر اپریل ۱۹۲۱ء

میں اس کو بھی سوویٹ یونین کی رکنیت دیدی گئی۔ قرغیزیہ ۱۹۳۶ء تک ازبکستان کے زیرنگیں رہا جبکہ اس کو بھی سوویٹ یونین میں مکمل رکنیت حاصل ہوگئی۔ اس تقسیم سے "جدید" کے وسطی ایشیا کو ایک ترک ریاست بنانے کے منصوبوں کو سخت صدمہ پہنچا۔ اس خطے کی ترک آبادی تین حصوں میں تقسیم ہوگئی جن میں سے ہر ایک کی مقامی زبان کو قومی زبان کا درجہ دیا گیا۔ وسطی ایشیا کے مستقبل کے لئے سب سے اہم بات تاجکستان کا قیام تھا جو کہ غیر ترک اور فارسی بولنے والے اقوام کی ریاست تھی۔ اس سے ترک قوم پرستی کا فروغ رُک گیا۔ اور اشتراکیوں نے وسطی ایشیا کے باشندوں کو منقسم کردیا۔

آذربیجان کا مسئلہ آزادی

روس کی ترک نژاد اقوام میں، جو والگا سے پامیر تک پھیلی ہوئی تھیں اور جن میں تاتاری، باشقیری، قزاق اور وسطی ایشیا کے ترک شامل تھے، قومی تحریکیں جغرافیائی قربت کی وجہ سے بڑی مربوط تھیں۔ لیکن جو ترک اقوام اس خطے کے باہر آباد تھیں مثلاً کریمیا کے تاتاری اور آذربیجانی، ان کی تاریخ ان سے بہت مختلف ہے۔ ان لوگوں کو اپنی قومی اور سیاسی زندگی منظم کرنے کی بہتر سہولتیں مہیا تھیں۔ حالانکہ کریمیا میں تاتاری کل آبادی کا ایک تہائی حصّہ تھے پھر بھی دو موقعوں پر انہوں نے اپنی ریاست قائم کرنے کی کوشش کی۔ اول تو ۱۹۱۸ء میں کریمیا پر سوویٹ قبضے سے قبل اور دوسری مرتبہ اسی سال اپریل سے نومبر تک جرمن قبضے کے دوران ـــ جب یوکرین کو جرمن فوجوں نے خالی کر دیا تو تاتاری حکومت جس کے سربراہ جعفر سید تھے ٹوٹ گئی اور اس کی جگہ غیر مسلموں نے حکومت بنالی۔ اکتوبر ۱۹۲۱ء میں سوویٹ حکومت نے کریمیا کی تاتار جمہوریہ قائم کرکے تاتاری کو سرکاری زبان بنادیا۔[۱]

---

[۱] PIPES: FORMATION OF THE SOVIET UNION

آذربیجان میں سب سے اہم سیاسی کردار "مساوات" پارٹی[1] نے ادا کیا۔ ۱۹۱۲ء میں قیام کے وقت سے یہ جماعت خفیہ طور پر کام کر رہی تھی مگر پھر بھی ماورائے قفقاسیہ میں یہ سب سے اہم اور مضبوط مسلمان پارٹی تھی۔ ۱۹۱۷ء کے بعد سے "مساوات" آذربیجانی عوام کی اکثریت کی سیاسی نمائندگی کرتی رہی۔ جنگ عظیم کے دوران اس کی ترک قوم پرستی کی پالیسی قدرے کم ہوگئی اور سلطنت عثمانیہ سے لگاؤ اور ہمدردی کے باوجود "مساوات" کے رہنما روس کے ساتھ قریبی وفاقی تعلقات کا پرچار کرتے رہے۔ رسول زادہ کی قیادت میں "مساوات" نے مسلمانانِ روس کی تنظیم نو کا خاکہ پیش کیا جو مئی ۱۹۱۷ء میں ماسکو میں منعقد شدہ مسلمانان روس کی پہلی کانگریس نے قبول کر لیا۔ اس منصوبہ کے مطابق آذربیجان اور دوسرے ترک علاقے "ناقابل تقسیم جمہوریہ روس" کے خود مختار حصے ہوتے جن کو "قومی، علاقائی اور وفاقی اصولوں" پر منظم کیا جاتا "مساوات" نے آذربیجان میں تعلیمی اصلاحات کا بھی مطالبہ کیا اور کہا کہ

---

[1] اس کے بانی محمد امین رسول زادہ (۱۸۸۴ء — ۱۹۵۵) تھے جو باکو میں پیدا ہوئے اور انقرہ میں ۶ مارچ ۱۹۵۵ء کو وفات پائی۔ وہ ایک بہت معزز خاندان کے فرزند تھے اور ان کی تمام زندگی انقلابی جد وجہد میں کٹی۔ ان کی سیاسی زندگی کا آغاز ۱۹۰۵ء سے ہوتا ہے۔ خلاف روس کارروائیوں کی وجہ سے ۱۹۱۰ء میں اُن کو ایران سے نکال دیا گیا جہاں سے وہ ترکی چلے گئے جمہوریہ آذربیجان کے قیام پر وہ پہلے صدر منتخب ہوئے۔ جب آذربیجان پر اشتراکیوں نے قبضہ کیا تو رسول زادہ کو ماسکو میں نظر بند کر دیا گیا۔ ۱۹۲۲ء میں وہ وہاں سے فرار ہو کر استنبول چلے گئے جہاں سے اتاترک نے انکو ملک بدر کر دیا۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران انہوں نے جرمنوں سے اشتراک

باقی اگلے صفحہ پر

مقامی زبان نچلے درجوں میں پڑھائی جائے اور اوپری جماعتوں میں روسی کے ساتھ ساتھ عثمانی ترکی کی تعلیم دی جائے۔ ایک اور قرارداد کے ذریعے "مساوات" نے عارضی حکومت کے ساتھ تعاون کی درخواست کی اور حکومت سے مرکزی طاقتوں اور ترکی کے خلاف جنگ جاری رکھنے کو کہا۔

آذربیجان کی سوشل ڈیموکریٹ پارٹی "ہمت" جس کو ۱۹۰۴ء میں اسٹالن نے قائم کیا تھا اور دوسرے مقامی سوشلسٹ گروہ "مساوات" کے خود مختاری کے منصوبوں کو شک وشبہ کی نظروں سے دیکھ رہے تھے اس کے باوجود "مساوات" اور "ہمت" میں (جو بائیں بازو کی بالشویک حمایتی جماعت تھی) قریبی تعاون اور رابطہ تھا۔ ۱۹۱۷ء کے وسط میں روس میں صرف یہی دو سیاسی جماعتیں تھیں جو جنگ جاری رکھنے کے خلاف تھیں حالانکہ "مساوات" نے کھلم کھلا اس کا اظہار نہیں کیا۔ ترکوں سے ہمدردی کی وجہ سے "مساوات" جنگ بندی کی خواہاں تھی[1] جبکہ "ہمت" کی نظر میں جنگ شہنشاہیت کی سازش تھی تاکہ جمہور انقلابی راہوں سے بھٹک جائیں۔

آذربیجان میں "مساوات" اتنی مقبول یا مضبوط نہ تھی جتنی کہ دوسرے

(حاشیہ صفحۂ ماسبق) کی کوشش کی مگر مایوسی اٹھانی پڑی۔ جنگ کے خاتمہ پر وہ پھر ترکی آگئے۔ ترک قوم پرستی کی تحریک میں ان کا ممتاز مقام ہے۔

[1] KASPII مورخہ ۲ر اپریل ۱۹۱۷ء

صوبوں میں دوسری قومی جماعتیں تھیں مگر پھر بھی یہ مسلمانوں کی سب سے مضبوط پارٹی تھی۔ روس کی دستور ساز اسمبلی کے انتخابات میں جو نومبر ۱۹۱۷ء میں منعقد ہوئے "مساوات" کو مسلمانوں کے ۶۳ فی صد ووٹ حاصل ہوئے لیکن یہ اعداد وشمار صحیح صورت حال کا اس لئے اظہار نہیں کرتے ہیں کہ "مساوات" کے زیادہ تر حامی وہ مسلمان تھے جو آذربیجان کی حدود کے باہر رہتے تھے۔" مساوات کی کمزوری کا اس سے پتہ چلتا ہے کہ آذربیجان پارلیمنٹ کے ۱۲۰ ممبروں میں سے صرف ۳۸ "مساوات" کے مندوبین تھے[۱] لیکن اس کے باوجود "مساوات" کا اثر ورسوخ بہت زیادہ تھا۔ ماورائے قفقاسیہ میں اس وقت سب سے کمزور بالشویک تھے، حتیٰ کہ باکو کے صنعتی شہر میں بھی ان کے حمایتیوں کی تعداد بہت کم تھی انقلاب اکتوبر کے بعد ماورائے قفقاسیہ نے جس میں آرمینیا، جارجیا، اور آذربیجان شامل تھے، سوویٹ حکومت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ بالشویک حکومت کی کمزوری اور کوہ قاف کی حدّ فاصل کا فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے اپنی علاقائی حکومت قائم کرلی۔ چند ماہ کے بعد جرمنی اور ترکی کے دباؤ سے ماورائے قفقاسیہ نے اپنی آزادی کا اعلان کر دیا۔ اور تھوڑے ہی دنوں کے بعد یہ تین حکومتوں آرمینیا، جارجیا اور آذربیجان میں منقسم ہو گیا۔ آذربیجان نے ۲۸ مئی ۱۹۱۸ء کو اپنی آزادی کا اعلان کیا۔ اس آزادی اور سوویٹ حکومت سے ناطہ توڑنے کی بڑی وجہ دراصل باکو کے سلسلے میں اشتراکیوں سے جھگڑا تھا۔ اول اول "مساوات" کے رہنما جن میں سے

---

[۱] کاظم زادہ

متعدد نے اسٹالن کے ساتھ کام کیا تھا اور جو سویٹ کے قومی نصب العین سے خاصا مرعوب تھے ماسکو سے ناطہ توڑنے سے ہچکچا رہے تھے لیکن جب ۳۱ مارچ ۱۹۱۸ء کو باکو میں بالشویک شورش میں مسلمانوں کا قتل عام ہوا تو "مساوات" کو فیصلہ کرنے میں دیر نہیں لگی۔ اس کے بعد سے آذربیجان کے رہنماؤں کا رخ ترکی کی طرف ہو گیا[1]۔

سلطنت عثمانیہ کی ترک فوجوں کی مدد سے آذربیجانیوں نے باکو پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ نئی جمہوریہ کے پاس تربیت یافتہ افواج اور اسلحہ کی کمی تھی چنانچہ مسلمان باشندوں نے ترکی افواج کو جوش و خروش سے خوش آمدید کہا کہ وہ ان کو باکو کے اشتراکیوں سے محفوظ رکھیں گی اور آرمینیا کے خلاف جنگ میں مدد کریں گی۔ "مساوات" کے رہنماؤں کو یہ بھی امید تھی کہ بالآخر آذربیجان اور ترکی کے اتحاد کا وقت آن پہنچا ہے۔ ترک افواج کا خیر مقدم کرتے ہوئے آذربیجان کے وزیر اعظم فتح علی خان خوائسکی نے کہا کہ "آذربیجان نے ترک اقوام کی سلطان کے علم تلے جمع ہونے کی صدیوں پرانی خواہش پوری کر لی ہے۔ والگا کے تاتاری، ازبک اہل بخارا و خیوا اور وسطی ایشیا کے عوام ترکی کی فوج آزادی کے منتظر ہیں"۔

خان خوائسکی نے مزید کہا کہ آذربیجان کی زندگی سلطنت عثمانیہ کے عالمی لائحہ عمل کے عین مطابق ہوگی اور وعدہ کیا کہ

"ان کی حکومت سابق کی طرح مستقبل میں بھی سلطنت عثمانیہ کے سیاسی رجحانات کے مطابق اپنے منصوبوں

---

[1] کاظم زادہ ادہ

اور سیاسی اعمال کو ہم آہنگ کرے گی :"

اسی قسم کے جذبات کا اظہار علی مردان بے نے بھی کیا جو جمہوریہ آذربیجان کے صدر تھے۔ سلطان کو مخاطب کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ

"خدا کے فضل سے آج میری آرزو پوری ہوگئی ہے کہ میں خلیفۃ المسلمین اور پادشاہ ترک کو دیکھ سکوں۔ جلالت مآب، کچھ عرصہ قبل آپ نے ایک چھوٹی سی ترک ریاست آذربیجان کے وفد کو شرف باریابی بخشا تھا[1] اور فرمایا تھا کہ آذربیجانی میری خاص اولاد ہیں۔ ہم اہل آذربیجان کو یہ شرف یاد ہے ـــــ ہمارے برادر معظم، خلیفۃ المسلمین، بادشاہ سلطنت عثمانیہ ہم آپ کے لطف و کرم اور نظر عنایت سے زندہ ہیں :"

رسول زادہ اور آذربیجانی وفد کے دوسرے اراکین نے بھی ۶ ستمبر ۱۹۱۸ء کو قسطنطنیہ میں اسی قسم کے جذبات کا اظہار کیا جس میں سلطان کی سرپرستی اور سخاوت کی استدعا کی گئی۔

ان جذبات سے مد نظر جن میں مشرقی تکلفات کو بڑا دخل ہے حقیقت یہ تھی کہ "مساوات" کے رہنماؤں کو توقع تھی کہ جرمنی اور ترکی کی فتح کے بعد وہ ایک ایسے وفاق کی بنیاد ڈالیں گے جس میں تمام ترک اقوام متحد ہو سکیں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ترکی اور آذربیجان کے درمیان سیاسی اور فوجی تعاون پہلا قدم تھا۔ اس کا مزید ثبوت اس بات سے بھی ملتا ہے

---

[1] یہ وفد ۶ ستمبر ۱۹۱۸ء کو حاضر ہوا۔ رسول زادہ اس میں شامل تھے۔

کہ باکو کی تسخیر کے بعد ترک افواج نے داغستان کی طرف پیش قدمی کی جس سے یہ بات ظاہر ہو گئی کہ ان کا مقصد روس کے مسلمان علاقوں کو اپنے زیر تحت لانا تھا۔

اتحادیوں کی فتح کے بعد حالات بدل گئے اور انگریزوں کے مطالبے پر ۱۰ نومبر کو ترکی افواج نے نہ صرف اپنی پیش قدمی روک دی بلکہ باکو اور ماورائے قفقاسیہ کو جس پر ان کا تسلط محض دو ماہ رہا خالی کر دیا۔ لیکن اس مختصر سے تجربے نے ثابت کر دیا کہ ترکوں اور آذربیجانیوں کے مفاد میں یکجہتی نہیں تھی۔ "مساوات" اور حکومت ترکوں کو اپنا بڑا بھائی، معاون اور محافظ سمجھتی تھی اور وہ اپنے اندرونی معاملات آزادانہ طور پر سلجھانا چاہتے تھے لیکن ترک آذربیجان کو سلطنت عثمانیہ کا ایک صوبہ سمجھتے تھے۔ خان خوائسکی نے نوری پاشا سے شکایت کی کہ

"سلطنت عثمانیہ کے قومی نمائندے آذربیجان کے اندرونی معاملات میں مداخلت کر رہے ہیں اور اکثر اوقات حکومت تک کی پرواہ نہیں کرتے ہیں۔"

دراصل افواج عثمانیہ کی اعلیٰ کمان نے خان خوائسکی کو ان کے سوشلسٹ رفقا کو حکومت سے برطرف کرنے پر مجبور کیا اور دوسری سوشلسٹ تنظیموں کو توڑ دیا۔ اس امر میں کم ہی شبہ ہے کہ اگر جنگ عظیم میں ترکی کو فتح حاصل ہو جاتی تو آذربیجان کی آزادی کا خاتمہ ہو جاتا اور وہ اپنے طاقتور ہمسائے میں مدغم ہو جاتا۔[۱۵]

---

۱۵ E.H. CARR: "THE HISTORY OF THE BOLSHEVIK REVOLUTION."

خارجہ پالیسی میں مصروفیت اور روز بروز کے اندرونی ہنگاموں اور مسائل کی وجہ سے "مساوات" کی حکومت کو قابل ذکر اصلاحات کا موقع نہ مل سکا۔ حکومت میں متعدد تبدیلیاں ہوتی رہتی تھیں جس کی وجہ سے اس کا وقار بہت کم تھا اور اس کی حیثیت محض عارضی تصور ہوتی تھی، اُدھر آرمینیا اور جارجیا سے سرحدی اختلافات نے جنگ کی صورت اختیار کر لی۔ اتحاد اقوام ترک نظریات کا حامل ہونے کے باوجود حکومت نے اتحاد اسلامی کی آڑ میں اطراف وجوانب کے غیر ترک مسلمان علاقوں پر قبضہ کرنے کی کوشش کی۔ پیرس کی "صلح کانفرنس" میں آذربیجانی وفد نے "عظیم آذربیجان" کا خاکہ پیش کیا جس میں ایسے علاقے بھی شامل تھے جو جغرافیائی طور پر آذربیجان سے متصل نہیں تھے۔ ان مطالبات کا نتیجہ یہ نکلا کہ آذربیجان کے ہمسایوں سے تعلقات کشیدگی اختیار کر گئے اور ناتجربہ کار آذربیجانی حکمرانوں کے پاس اندرونی معاملات کے لئے وقت نہیں رہا۔

ملک کے اندر اقتصادی اور زراعتی مسائل حل طلب رہے۔ ۱۹۱۸ء کے اوائل میں جمہوریہ قفقاسیہ کے حصے بخرے ہونے سے قبل اسمبلی نے ایک بل پاس کیا جس کی رو سے امراء کی بڑی بڑی جاگیریں ضبط کر لی گئیں۔ آذربیجان کی آزادی کے بعد "مساوات" کے دائیں بازو نے جس میں جاگیرداروں کا زیادہ اثر تھا اس بل کو موقوف کر دیا۔ نئی حکومت کی زراعتی پالیسی سے کسانوں میں بد اطمینانی پھیل گئی اور ترکی افواج کی مدد سے ان ہنگاموں کو فرو کرنا پڑا۔ تیل کی برآمد میں مشکلات کی وجہ سے اقتصادی بحران پیدا ہو گیا۔ تیل کے کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں

کی اجرت بہت کم تھی اور اکثر و بیشتر احتجاجی ہڑتالیں ہوا کرتی تھیں جن سے اشتراکیوں نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ تعلیم کے میدان میں البتہ حکومت کو کامیابی ہوئی، تمام سرکاری اسکولوں میں روسی کی جگہ عثمانی ترکی نے لے لی، نئے اسکول اور یونیورسٹی قائم ہوئی۔ قومی صحافت کو بھی بڑا فروغ ہوا۔

ترک فوجوں کے انخلا کے بعد اور انگریزوں کو خوش کرنے کے لئے آذربیجانی پارلیمنٹ کا انعقاد ہوا، اس نے کوئی اہم کردار ادا نہیں کیا، کیونکہ تمامتر اقتدار "مساوات" کے سیاستدانوں اور جاگیرداروں کے ہاتھ میں تھا۔[1] انتخابات کے دوران سرکاری دباؤ ڈالنے کے باوجود "مساوات" کو پارلیمنٹ میں اکثریت نہ حاصل ہو سکی۔ آذربیجان کی آزادی کے لئے یہ امر مہلک ثابت ہوا کہ "مساوات میں سیاسی یکسانیت اور ہم آہنگی نہیں تھی۔ اس کا بایاں بازو محمد امین رسول زادہ کی قیادت میں حریت پسند اور انتہا پسند تھا۔ دائیں بازو میں زیادہ تر مغربی آذربیجان کے امراء شامل تھے اور جس کو خان خوائسکی کی قومی ڈیمو کریٹ پارٹی کی حمایت حاصل تھی۔ یہ بازو خان خوائسکی کی سربراہی میں ۱۹۱۸-۱۹۲۰ء تک برسر اقتدار رہا اور اس کا بائیں بازو سے مستقل جھگڑا رہتا تھا جب خان خوائسکی کی حکومت کو مالی بدانتظامی کی وجہ سے مستعفی ہونا پڑا تو نئی حکومت دائیں بازو سے تعلق رکھنے کے باوجود رسول زادہ کے زیر اثر آگئی جن کی کوششوں سے سوویٹ یونین سے تعلقات استوار ہو گئے رسول زادہ ہی کی کوشش سے ۱۹۲۰ء کے اوائل میں اشتراکی پارٹی کو

---

[1] کاظم زادہ

آذربیجان میں قانونی طور پر تسلیم کر لیا گیا۔ سوویٹ حکومت سے تعاون و اشتراک اور دوستی کی پالیسی کو نہ صرف "مساوات" نے سراہا بلکہ انتہائی دائیں بازو والی "اتحاد" پارٹی نے بھی خوش آمدید کہا۔ "اتحاد" کی بنیاد قومیت سے زیادہ اسلام پر تھی۔ "اتحاد" کی غیر ترک پالیسی میں روایتی شیعہ سنی رقابت اور ایرانی ثقافت کو بڑا دخل تھا ان کی نظروں میں اتحاد اقوام ترک کے لسانی اور نسلی اتحاد کو مذہب پر ترجیح دینا اسلام کے منافی تھا۔

"اسلام ہمہ گیر ہے اور اس کو کسی قومی تحریک سے وابستہ نہیں کیا جا سکتا۔ "اتحاد" کے ممبروں کو صرف اسلامی وحدت کا تصور کرنا چاہیئے —— ہماری پارٹی جس میں نہ صرف آذربیجان کے ترک بلکہ ایرانی اور قفقاسیہ کے پہاڑی بھی شامل ہیں اسلام کی بین الاقوامی اخوت کا آئینہ دار ہے۔"

الغرض اتحاد اقوام ترک کے سنی حمایتیوں کی مخالفت کر کے "اتحاد" نے بین الاقوامی نظریہ اور اشتراکیت کی غیر ارادی حمایت کی۔ بالشویکوں نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے "مساوات" کے خلاف "اتحاد" کو مدد پہنچائی اور اس طرح انتہائی دائیں اور بائیں بازو کا عارضی گٹھ جوڑ ہو گیا۔

۱۹۲۰ء کے اوائل میں اندرونی خلفشار اور ہمسایوں کے ساتھ لڑائی جھگڑے نے آذربیجان کو اس بات پر مجبور کر دیا کہ وہ سوویٹ حکومت اور اشتراکی پارٹی سے دوستانہ رویہ اختیار کرے۔ ماورائے

قفقاسیہ سے انگریزی افواج کے انخلا اور "سفید" افواج کی شکست کے بعد "مساوات" کو براہ راست "سرخ" فوج سے دوچار ہونا پڑا۔ فروری ۱۹۲۰ء میں ماسکو کی مرکزی کمیٹی نے آرمینیا کے ایک اشتراکی میکویان (MIKOYAN) کو آذربیجان کی بالشویک تنظیم کا سربراہ مقرر کیا۔ باکو میں میکویان نے آذربیجان کی علٰحدہ اشتراکی پارٹی قائم کی جس نے وہی کردار ادا کیا جو والگا۔ یورال اور دوسرے ترک علاقوں میں قومی اشتراکی پارٹیوں نے ادا کیا تھا۔ اس نئی جماعت نے عوام میں "مساوات" کے اثر و رسوخ کو کم کرنے کی کوششیں کیں اور اپنے پہلے اجلاس میں اس امر کا اعلان کیا کہ

"پارٹی کا مقصد آذربیجان میں سوویٹ طریقہ کار رائج کرنا ہے۔"

میکویان کو اپنے مقصد میں کمال اتاترک کی پالیسی سے بھی تقویت پہنچی جنہوں نے بجائے رکاوٹ ڈالنے کے آذربیجان، آرمینیا اور جارجیا کو ماسکو کے زیر تحت لانے میں مدد دی۔ یونان اور اتحادیوں سے جنگ میں مبتلا اتاترک نے ماسکو کو دوست بنایا۔ اس کے بدلے میں سوویٹ نے انکو اسلحہ اور گولہ بارود سے امداد دی۔ ماسکو کو خیال تھا کہ اتاترک مشرق میں انقلاب لانے میں معاون ثابت ہوں گے اور ان کا آلۂ کار بن جائیں گے۔

آذربیجان کیلئے اشتراکیوں اور اتاترک سے بیک وقت مقابلہ کرنا ممکن نہ تھا حکومت میں بھی نفاق اور پھوٹ پڑ چکی تھی۔ خان خوائسکی اور ان کے

قدامت پسند رفقا نے اشتراکیوں اور سوویٹ حکومت کے ساتھ صلح و آشتی کی پالیسی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا لیکن ۵۰۰۰ ا سرخ افواج داغستان میں جو کہ آذربیجان کی سرحد سے متصل تھا متعین تھیں ادھر آذربیجان میں میکویان کے اشتراکی گروہ مستحکم ہوتے جا رہے تھے۔ حکومت کی چھوٹی سی غیر منتظم فوج عثمانی افسروں کے زیر کمان آرمینیا میں مصروف جنگ تھی اور "مساوات" کا اثر و اقتدار کمزور ہو چکا تھا۔ ۲۷ر اپریل ۱۹۲۰ء کو اشتراکیوں نے سوویٹ حکومت کے نام پر بارہ گھنٹے کے اندر اندر اقتدار سونپ دینے کا مطالبہ کیا۔ اس مطالبے کی پشت پر وہ سرخ فوج بھی تھی جو باکو سے صرف ۳۰ میل دور داغستان میں موجود تھی۔ آذربیجان کی پارلیمنٹ جب اپنے آخری اجلاس کے لئے مشتمل ہوئی تو باکو کے مسلح اشتراکی دستوں نے عمارت کو گھیرے میں لے لیا۔ اشتراکیوں کا مطالبہ بلا مزاحمت منظور کر لیا گیا، قومی حکومت اور پارلیمنٹ کو توڑ دیا گیا۔

دوسرے دن باکو کے اشتراکیوں نے نئی حکومت قائم کر دی جس میں مسلمان اور تین روسی کمیونسٹ شامل تھے۔ "مساوات" کے دائیں بازو کے ارکان جن میں خان خوائسکی اور وزیر جنگ جنرل مہندرو بھی شامل تھے گرفتار کر لئے گئے۔ رسول زادہ نے اسٹالن کی اس ذاتی پیشکش کو مسترد کر دیا کہ وہ کمیونسٹ پارٹی میں شریک ہو جائیں اور فرار ہو کر باہر چلے گئے۔ "مساوات" کے بہت سے ارکان نے اشتراکی پارٹی میں شرکت کر لی لیکن ان میں سے بیشتر کو اگلے سالوں میں نکال باہر

کیا گیا۔

دو سال کے بعد آذر بیجان کی آزادی ختم ہو گئی۔ مارچ ۱۹۲۲ء میں آذر بیجان، جارجیا اور آرمینیا کے وفاق ماورائے قفقاسیہ کو سوویٹ نگرانی کی تحت دوبارہ قائم کیا گیا۔ ۳۰ ردسمبر کو اس وفاق کو سوویٹ یونین میں جمہوریہ کا درجہ دیدیا گیا۔

حرفِ آخر

۱۹۲۰ء میں خانہ جنگی کے اختتام اور سوویٹ نظامِ حکومت کے استحکام سے روس کے ترک نژاد اور مسلمان اقوام کی تاریخ کا ایک اہم باب ختم ہوگیا۔ ۱۹۲۴ء میں خود مختار ترکستان کی جگہ ۴ جمہوری ریاستوں[1] کے قیام سے جو بالآخر سوویٹ یونین کی مکمل رکن بن گئیں، وسطی ایشیا کے سیاسی منظر میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی کیوں کہ درحقیقت وسطی ایشیا کے مستقبل کا فیصلہ ۱۹۲۰ء میں ہی ہو چکا تھا۔ مسلمانوں کی آزاد یا خود مختار ریاستیں حقیقت میں کمیونسٹ پارٹی اور سوویٹ نظم و نسق کے زیرِ نگیں تھے۔

۱۹۲۰ء کے بعد سے سب سے زیادہ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اس کے بعد سے مسلمانوں کی زندگی اور تہذیب و تمدن پر سے اسلامی غلبہ کم ہونے لگا ہم پہلے ہی دیکھ چکے ہیں کہ آخری صدی کے وسط میں ترکی میں تہذیب و تمدن کو مذہبیت سے آزاد کرانے کی جو تحریک شروع ہوئی تھی اس کی تقلید روس کی ترک نژاد اقوام نے بھی کی اور جس کا اولین اظہار

---

[1] ازبکستان، قرغیزیہ، تاجکستان، ترکمانستان

اسمٰعیل بے کے اسکول جدید میں ہوا۔ آقچورا اور آغا اوغلو نے اسلامی نظریات پر ترک قوم پرستی کے نظریات کو ترجیح و فوقیت دے کر اس جد و جہد کو ایک قدم اور آگے بڑھایا لیکن یہ تحریک صرف مفکرین اور اہل الرائے تک ہی محدود تھی اور اس کا عوام یا حکومت پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ قفقازیہ وسطی ایشیا اور والگا۔ یورال کے دیہی علاقوں کے مسلمانوں نے اس کو قطعاً قبول نہیں کیا۔ ۱۹۲۰ء کے بعد لامذہبیت حکومت کے لائحۂ عمل کا ضروری جزو بن گئی۔ چند مراعات کے باوجود اسکولوں میں اسلام کی تعلیم ترک کر دی گئی، نماز کے وقت مؤذنوں کو اذاں دینے کے لئے منع کر دیا گیا مسجدیں بند کر دی گئیں اور طلبا کو چند بچے کھچے مدرسوں میں جانے سے باز رکھنے کی کوشش کی گئی اور بالآخر ۱۹۱۵ء میں عربی کی جگہ لاطینی حروف تہجی اور بعد ازاں ۱۹۲۹ء میں سُریلی (CYRALLIC) حروف رائج کئے گئے اور اس طرح روس کے ترک نژاد مسلمانوں کو عالم اسلام سے بیگانہ کر دیا گیا۔

لامذہبیت کی یہ روش جس نے وہاں کے مسلمانوں کی حالت کو مزید تشویشناک کر دیا صرف سوویٹ یونین ہی تک محدود نہیں تھی۔ سلطنت عثمانیہ ۱۹۲۰ء میں کمال اتاترک کی کوششوں سے ایک مضبوط ترک جمہوریہ میں تبدیل ہو گئی۔ ترکی میں قرآن پاک کی طباعت بند کر دی گئی۔ عربی کی تعلیم ممنوع قرار دی گئی اور عربی حروف کی جگہ لاطینی حروف نے لے لی۔ سوویٹ یونین کی طرح ترکی میں بھی کمال اتاترک نے درویشوں اور صوفیوں کے حلقوں کو توڑ دیا، تقریباً ۵۰۰ مدرسے بند کر دیئے گئے اسکولوں میں مذہب کی تعلیم بند کر دی گئی ترکی میں اسلام کی حالت نازک

ہو گئی اور کمال اتاترک کی اصلاحی کارروائیوں سے اشتراکیوں کے دہریہ اور لادین منصوبوں کو بڑی تقویت پہنچی۔ الغرض یہ کہ ۱۹۲۰ء میں تمام ترک ممالک میں روحانی خلفشار پھیل گیا اور اسلام کی مذہبی یکجہتی، فلسفہ، اقدار اور فقہ کو سخت زک پہنچی۔ حالانکہ یہ بتانا مشکل ہے کہ مستقبل بعید میں روس کے ترک علاقوں میں اس کے کیا نتائج ہونگے لیکن یہ بات بالکل واضح ہے کہ ۱۹۲۰ء میں ایک ایسے نئے دور کا آغاز ہوا جس میں قازان، باکو اور تاشقند، مکہ، قاہرہ اور کراچی کے بہ نسبت مغربی تہذیب وتمدن کے زیادہ نزدیک ہیں۔

روس کے ترک نژاد اقوام پر سے اسلام کے گھٹتے ہوئے اثرات کا یہ مطلب نہیں کہ ان کے قوم پرستی کے جذبات ختم ہو چکے ہیں یا ان میں کسی قسم کی کمزوری ہوئی ہے اس کے برعکس مذہبی اثرات کے گھٹ جانے کی وجہ سے عین ممکن ہے کہ قومی انفرادیت کا جذبہ شدت سے ابھر آئے اس میں کوئی شک نہیں کہ ۱۹۱۷ — ۱۹۰۵ء کے دوران اسلام کے سیاسی نظریات اور اتحاد اسلامی کے فروغ نے مسلمانوں کی سیاسی کارروائیوں میں یکجہتی اور ہم آہنگی پیدا کر دی تھی اور قوم پرستی کے افکار و نظریات اسلام کے زیر اثر دب کر رہ گئے تھے اور مقبول عام نہ ہو سکے مسلمانان روس کے فکر و عمل میں اسلام کو قومی مسائل پر اکثر وبیشتر فوقیت حاصل رہی اور اس لئے اتحاد اقوام ترک کے ممتاز مفکرین نے مذہب کے بارے میں نظر ثانی کرنے کی تلقین کی اور یوسف آقچورا نے "اتحاد اسلامی" کی نفی کرتے ہوئے "اتحاد اقوام ترک" کی تلقین کی۔

۰۶ — ۱۹۰۵ء کے دوران روس کے ترک رہنماؤں نے اپنے

اجتماعات اور سیاسی پارٹیوں کی تنظیم میں "قوم" اور "ترک" کی جگہ "مذہب" اور "مسلمان" کا نام غالباً عمداً استعمال کیا تاکہ حکومت زار کے خدشات نہ جاگ اٹھیں۔ ۱۹۱۷ء میں جبکہ جمہوری حکومت وجود میں آچکی تھی مذہبی اصطلاحات کا استعمال اس لئے رائج رہا کہ روس کے کٹر مسلمانوں میں ابھی بھی قوم پرستی کے نظریات مقبول عام نہ تھے۔ روسی ترکوں میں ترک قوم پرستی کا سوال کس قدر کمزور تھا وہ اس سے ظاہر ہے کہ ۱۹۱۷ء میں منعقد ہونے والی مسلمانان روس کی پہلی کانگریس نے جو انتظامیہ قائم کی اس کا نام بجائے ترک و تاتار کے مسلم کونسل تھا اور جب اس سال کے وسط میں ثقافتی و تمدنی خود مختاری کے منصوبے کی وضاحت کی گئی تو اس کو بھی روس اور سائبیریا کے مسلمانوں کی خود مختاری سے معنون کیا گیا۔

وسطی ایشیا اور قفقاسیہ کے دوسرے علاقوں میں جہاں تمامتر آبادی ترک نژاد تھی صورت حال اور بھی پیچیدہ تھی کیوں کہ ان لوگوں کو کسی قومی یا نسلی علم کے نیچے اکٹھا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ آذربیجان کی "مساوات" پارٹی کے زیادہ تر رہنما ترک تھے لیکن انہوں نے بھی اسلام کے نام پر عوام کو اکٹھا کیا۔ دراصل "مساوات" کی کامیابی کے ذمے دار بھی غیر ترک مسلمان تھے۔ ۱۹۵۰ء تک رسول زادہ آذربیجان، داغستان اور شمالی قفقاسیہ کے وفاق کا تصور محض اس بنیاد پر کر رہے تھے کہ ان علاقوں کے باشندے اسلام کے پیرو تھے۔

آذربیجان کے متعدد رہنما مثلاً رسول زادہ، علی مردان بے اور آغا اوغلو وغیرہ کے شروع کے مضامین اور مقالات سے یہ بات بالکل

واضح ہے کہ اوائل میں ان پر جمال الدین افغانی کے نظریات و افکار کا گہرا اثر تھا اور ترک قومیت کی بہ نسبت وہ اتحاد اسلامی سے زیادہ متاثر تھے۔ ان کے مضامین میں عالم اسلامی کے اتحاد و نشاۃ ثانیہ کا تصور ملتا ہے اور ان کے نزدیک سیاسی جد وجہد کے لئے قومیت سے زیادہ اسلام کی مذہبی و تمدنی بنیاد موزوں تھی۔

وسطی ایشیا میں جب "جدید" اشتراکی پارٹی میں داخل ہو گئے تو ۱۹۱۹ء کے اواخر میں سیاسی تقاریر و مقالات میں "مسلم" کے بجائے "ترک" اصطلاحات استعمال ہونے لگیں حالانکہ اس کی بڑی وجہ اشتراکیوں کی لامذہبیت تھی اور ان اتحاد اقوام ترک کے حامی "جدید" کی طاقت بہت ہی محدود تھی کیوں کہ عوام کی اکثریت قوم پرستوں سے اتنی ہی بیزار تھی جتنی کہ اشتراکیوں سے۔ مذہبی ذہنیت اور قوم پرستی کے نظریات کے تصادم میں لازماً قوم پرست رہنماؤں کو زک اٹھانی پڑی روس کے زیادہ تر ترک باشندے اتحاد اقوام ترک اور ترک قومیت کے نظریات سے ناواقف تھے اور اس مسئلے پر سیاسی طور پر تقریباً بے حس تھے۔ اکثر و بیشتر مذہب کی مخالفت یا مقابلے کی وجہ سے قومی تحریکوں کو فروغ نہ ہو سکا اور ترک قومیت کی ابتدا ہی سے علما نے اس کی مخالفت کی۔ تاتار ملاؤں نے "جدید" رہنماؤں کے خلاف زار کی پولس کی مخبری کی اور ترکستان میں علما نے اول اخبارات اور مسجدوں میں وعظوں کے ذریعے، پھر تشدد کے ذریعے اور بالآخر خانہ جنگی اور بصماچی تحریک کے دوران انتہائی تشدد سے مخالفت کی۔ اشتراکیوں سے تعاون کی وجہ سے بھی "جدید" مقامی باشندوں

میں مقبول نہ ہو سکے۔ سوویٹ کے ساتھ اس شد و مد سے "جدید" تعاون کی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ ہمعصر قدامت پسند مسلمانوں سے الگ ہو چکے تھے اور ان میں ناقابل قبول تھے۔

مسلمانان سوویٹ یونین میں خانہ جنگی کے دوران بصماچیوں کی اہم اور طاقتور تحریک اشتراکیوں کے خلاف شروع ہوئی جس کا ترک قوم پرستوں کے منصوبوں سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ بصماچی اپنے آباد اجداد کے طریق زندگی، قبائلی نظام اور اسلام کی بقا کے لئے لڑ رہے تھے اور وہ بے دین اور دہریہ اشتراکیوں اور "جدید" دونوں کے خلاف تھے جب سوویٹ حکومت نے اسلام کے معاملے میں مصالحتی اور رواداراً طریقہ اختیار کیا تو بصماچی تحریک کسی حد تک کم ہو گئی خصوصاً جبکہ سوویٹ ملاؤں نے یہ اعلان کیا کہ قرآن کے حکم کے بموجب حکومت کی اطاعت لازمی ہے اور اشتراکی تعلیمات میں کوئی امر اسلامی تعلیمات کے منافی نہیں ہے۔ والگا۔یورال خطے میں جہاں کے بیشتر علماء مفتی سروری کی رہنمائی میں "جدید" تحریک میں شامل ہو گئے تھے اور قزاقستان میں جہاں اسلام کی جڑیں زیادہ مضبوط نہیں تھیں روایت پسند علماء کی طاقت اتنی نہیں تھی کہ وہ حریت پسند تحریکوں کی مخالفت کر سکتے۔ آذربیجان کی دو سالہ آزادی کے دوران "مساوات" کو قدامت پسند شیعہ علما کی جماعت "اتحاد" کی مخالفانہ سرگرمیوں سے بڑا خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ "اتحاد" کا سیاسی فلسفہ یہ تھا کہ

"اسلام ایک وسیع المشرب مذہب ہے، یہ اتحاد اقوام ترک کے تنگ نظریئے سے بلند ہے اور کسی قسم کے

قوم پرست نظریات اسلام کے بنیادی اصولوں کے منفی ہیں"

اس فلسفے کی بدولت "مساوات" کے قوم پرست نظریات کو آذربیجان کی شیعہ آبادی میں زیادہ مقبولیت نہ ہو سکی اور یہ امر ایک حد تک آذربیجان میں خلاف سوویٹ تحریکوں کی کمزوری کا باعث ثابت ہوا۔

خانہ جنگی کے دوران ترک قومیت کی تحریکوں کے غیر مؤثر ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس دوران کوئی واضح حقیقت پسندانہ لائحہ عمل موجود نہ تھا۔ آقچورا اور دوسرے تارکین وطن نے "اتحاد اقوام ترک" کے جو افکار پیش کئے تھے وہ غیر مبہم تھے، ان کی تاریخی بنیاد بہت ہی دور افتادہ تھی اور جغرافیائی محل وقوع کے اعتبار سے اس میں مسلمانان روس کے لئے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اتحاد اقوام ترک کے حامی چنگیز خاں اور تیمور کی جن شاندار فتوحات کا تذکرہ کرتے تھے بیشتر لوگ ان کو بھول چکے تھے۔ تیرہویں اور پندرہویں صدی کے ان فاتحوں نے جن سلطنتوں کی بنیاد ڈالی تھی اس کی بناء پر بیسویں صدی کے عوام کو اکسانا فضول سا تھا۔ ان قدیم سلطنتوں کی جغرافیائی یکجہتی مفقود ہو چکی تھی اور تمامتر علاقے ایک دوسرے سے الگ تھلگ ہو چکے تھے۔ قزاقستان کے بنجر اور بے برگ وگیاہ میدانوں اور ریگستانوں نے جو روس کے ترک علاقوں کے بیچوں بیچ واقع تھے وسطی ایشیا کے ترکوں کو متفق کرنے کے بجائے منقسم کر دیا تھا۔ علاوہ ازیں صدیوں سے روسی نوآبادکاری کی وجہ سے ترک نژاد اقوام خاص خاص علاقوں میں بٹ گئی تھیں۔ ان کی زبانیں تک اس قدر بدل گئی تھیں کہ ان کے

درمیان ایک مشترکہ ترک زبان کا رائج کرنا ناممکن امر تھا۔ بیسویں صدی کے اوائل میں مختلف النوع جغرافیائی، عمرانی اور معاشی حالات کی وجہ سے اتحاد اقوام ترک یا ترک قومیت دانشوروں اور مفکرین کے لئے ایک سہانا خواب تھا اور یہ لوگ قومی اتحاد کی راہ میں رکاوٹوں اور مشکلات پر قابو نہ پا سکے۔ مقامی سیاسی روایات کے فقدان کی وجہ سے بھی علاقائی بنیاد پر قوم پرستی کو استحکام نہ پہنچ سکا۔ جیسا ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ بیسویں صدی کے اوائل میں روس کے بعض ترک علاقوں کے عوام اس وقت تک ایرانی تہذیب و تمدن کے اثرات سے آباد ہونے کی کوششوں میں مصروف تھے اور بعض علاقوں میں علاقائی اتحاد کا تصور ہی ۱۹۱۷ء تک پیدا نہیں ہوا تھا۔ مثال کے طور پر روس کی فتح سے قبل آذربیجان کے علاقے میں کبھی بھی ایک علحدہ اور متحد ریاست قائم نہیں ہوئی تھی۔ حتیٰ کہ ایرانی اقتدار کے تحت بھی یہ علاقہ بہت سی چھوٹی چھوٹی وفاقی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا یہاں تک کہ ۱۹۱۷ء سے قبل آذربیجان کی اصطلاح ہی بہت کم استعمال ہوتی تھی۔ اسی قسم کے حالات وسطی ایشیا میں بھی تھے۔ جیسا پہلے تذکرہ ہو چکا ہے تاتاری اپنے لئے تمام روس میں ثقافتی خود مختاری چاہتے تھے اور دوسرے روسی مسلمان علاقائی خود مختاری کے خواہاں تھے جبکہ باشقیریا کے لوگ فیصلہ کرنے میں ہچر مچر کر رہے تھے ان حالات میں علاقائی بنیاد پر قوم پرستی کی تحریکوں کا پنپنا مشکل ہی تھا جس کا عام نتیجہ مایوسی اور بے حسی تھا۔

۲۰-۱۹۱۷ء کے انقلابی دور میں روس کے ترکوں کا رویہ ۱۹۰۵ء کے انقلاب سے بہت مختلف تھا۔ یہ تبدیلی یوروپی روس

میں زیادہ نمایاں تھی جہاں ۱۹۱۷ء میں ترک آبادی میں ایک عام بےچینی کی لہر دوڑ گئی تھی اور جس کا اظہار قازان میں منعقد شدہ مسلمانان روس کی دوسری کانگریس کی قراردادوں میں ہوا جو کہ پہلی کانگریس کے مقابلے میں زیادہ انتہا پسند تھی اور جس میں سوشلسٹوں کا زیادہ زور تھا مختلف انتخابات میں بائیں بازو کی جماعتوں کو نمایاں کامیابیاں ہوئیں قفقاسیہ کی ممتاز سیاسی جماعت "مساوات" کو انقلاب سے پیدا شدہ حالات اور رائے دہندگان کی انتہا پسندی کی وجہ سے خالص سوشلسٹ لائحہ عمل اختیار کرنا پڑا۔ "مساوات" "جدید" اور دوسری سیاسی جماعتیں سوویٹ کے متعلق کوئی قطعی رائے یوں نہ قائم کر سکیں کہ مسلمانوں میں انتہا پسندی سرعت سے پھیل رہی تھی اور وہ قومی اور سیاسی معاملات سے قطعاً بے نیاز تھے۔ زیادہ تر مفکرین بھی شدت پسندی کا شکار ہو رہے تھے اور قوم پرست گروہوں کے پاس قیادت کا فقدان تھا۔

وسطی ایشیا اور قزاقستان میں صرف مغرب زدہ طبقہ یا تھوڑی بہت شہری آبادی شدت پسند نظریات سے متاثر تھی ورنہ بقیہ آبادی ان معاملات سے بے تعلق تھی۔ وسطی ایشیا میں دستور ساز اسمبلی کے انتخابات نہیں ہوئے لیکن انتخابات کی امیدیں جو دھڑے بندیاں ہوئی تھیں ان سے دائیں بازو کے مسلمانوں اور تھوڑی تعداد والے پرجوش بائیں بازو کے "جدید" کے درمیان اختلافات ظاہر ہو گئے۔ دائیں بازو کے علما نے روس کے سامراجی گروہ سے معاہدہ کر لیا جس سے تاتاری اس قدر پریشان ہوئے کہ انہوں نے ایک وفد تاشقند بھیجا

جس نے علما سے درخواست کی کہ "وہ قوم پرست اور مسلمان" ہونے کا ثبوت دیں۔ ادھر "جدید" نے روسی سوشلسٹوں سے معاہدہ کر کے کرنیسکی کا نام سرِفہرست رکھا جو کہ وسطی ایشیا میں پیدا ہوئے تھے اسی قسم کے معاہدے دوسرے صوبوں میں بھی ہوئے جس نے مسلمان رائے دہندگان کو الجھن میں ڈال دیا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ قانون ساز اسمبلی کے انتخابات میں مسلمانوں نے کافی تعداد میں سوشلسٹ انقلابیوں اور بالشویکوں کے حق میں ووٹ ڈالے۔

سوویٹ حکومت کے اولیں دور میں سب سے حیرت انگیز امر اشتراکیوں اور قدامت پسند مسلمان علما کے درمیان اتحاد و تعاون ہے۔ علما سیاسی اور اقتصادی نظریات میں نہیں بلکہ ذہنی طور پر دائیں بازو سے تعلق رکھتے تھے چنانچہ مارکس ازم اور سوویٹ اشتراکیوں کے بین الاقوامی نعروں اور وعدوں سے ان کو کوئی خوف نہیں محسوس ہوتا تھا حالانکہ مارکس ازم کی لادینیت اور دہریت اسلام سے لگّا نہیں کھاتی تھی۔ ۱۹۱۷ء میں تاشقند کے قدامت پسند علمائے سوویٹ کے ساتھ اشتراک و تعاون کا ہاتھ بڑھایا جو وہاں کے اشتراکیوں کی تنگ نظری کی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکا۔ ۱۹۲۴-۱۹۲۲ء کے دوران علما کی حمایت و ہمدردی حاصل کرنے کے لئے سوویٹ حکومت نے عارضی طور پر مدرسے اور مسلم عدالتیں بحال کر دیں۔ قرآن شریف کی ان سورتوں کا حوالہ دے کر جس میں حاکم کی اطاعت کا ذکر کیا گیا ہے وسطی ایشیا کے ملاؤں نے بھماچیوں کو مطمئن کر کے سوویٹ حکومت کی مدد کی۔ چند مسلمان سیاستدانوں

نے اشتراکی پارٹی میں شرکت کرلی اور سوویٹ حکومت سے اس بنا پر تعاون کیا کہ اسلام اور اشتراکیت میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ اسلام اور اشتراکیت میں جو بہت سی مطابقت پائی جاتی ہے اس کے پیش نظریہ سمجھنا مشکل نہیں ہے کہ کیوں بہت سے مسلم ترک دانشور اشتراکیت سے اس قدر متاثر ہوئے اور سوویٹ مطلق العنانی کے خلاف جدوجہد نہیں کی اور اکثر و بیشتر نے قومی مفاد کو بھول کر اشتراکی پارٹی کی رکنیت قبول کرلی۔

قومی تحریکوں کی راہ میں جو رکاوٹیں حائل ہوئیں انہوں نے روس کے ترکوں کی ثقافتی و تمدنی یکجہتی یا خصوصی نسلی انفرادیت کے احساس کو زائل نہیں ہونے دیا۔ جس طرح تمدنی یکجہتی نے انقلاب کے دوران میں سیاسی وحدت نہیں پیدا کی اسی طرح منفرد قومیت کے احساس نے ان میں سیاسی علاحدگی کے تصور کو فروغ نہیں دیا۔ ۱۹۱۷ء کے دوران اور اس سے قبل سوائے چند تارکین وطن کے جو ترکی یا جرمنی میں مقیم تھے کسی بھی ترک نژاد رہنما نے اپنے قومی لائحہ عمل میں سیاسی آزادی کا مطالبہ نہیں کیا۔ حتیٰ کہ یوسف آقچورا جو شدت پسند قوم پرست تھے قومی آزادی کے مطالبات اور روس کے ترکوں کے لئے مکمل قانونی مساوات اور تمدنی خودمختاری کے درمیان تردد کرتے رہے۔ روس کے ترکوں کی کسی بھی قومی جماعت نے ۱۹۱۸ء کے وسط تک روس سے علاحدگی کے بارے میں آواز بلند نہیں کی۔

روس کے ترکوں نے اس وقت جو رویہ اختیار کیا وہ مملکت

کے دوسرے باشندوں سے زیادہ مختلف نہیں تھا۔ عارضی حکومت کے دور میں صرف "فن" اور پول باشندوں نے آزادی کا مطالبہ کیا۔ حکومت نے ان مطالبات پر ہمدردی سے غور کیا اور پولش عوام کی آزادی کا حق تسلیم کرلیا۔ حالانکہ مختلف گروہوں نے خود مختاری کی درخواست کی لیکن کسی نے بھی علحدگی کا مطالبہ نہیں کیا۔ شہنشاہیئت کے خاتمے پر ملک میں افراتفری پھیل گئی اور طوائف الملوکی کا دور دورہ ہوگیا اس وقت صرف ترک علاقوں یعنی ترکستان، باشقیریا تاتار اور قزاقستان نے محض خود مختاری کا مطالبہ کر کے حکومت روس کے ساتھ نظم ونسق کو برقرار رکھنے کا اظہار کیا۔ یہ لوگ روس کی سیاسی وحدت کو برقرار رکھنا چاہتے تھے جس کا پتہ سالک، جو کہ مسلمانان روس کی کونسل کے صدر تھے، مصطفےٰ اچوقائی جو ۱۹۱۷۔۱۸ء میں خود مختار ترکستان کے سربراہ تھے اور دوست محمد جو خود مختار قزاقستان کے صدر تھے، کی تقاریر ومقالات سے چلتا ہے مصطفےٰ اچوقائی نے کہا کہ

"اس وقت ہمارے پاس کوئی واضح قومی لائحۂ عمل نہیں تھا۔ ہم ترکستان کو روس کا حصہ سمجھتے تھے اور اس کا مستقبل روس سے ہی وابستہ تھا۔ لیکن جب بالشویکوں نے اقتدار ہتھیالیا اور عوام کے سیاسی اختیارات سلب کرلئے گئے تو ہم نے مجبوراً عوام کی خواہشات کے مطابق غاصب کی مخالفت کا بیڑا اٹھایا"

قزاقستان کے سربراہ دوست محمد نے کہا کہ

"ہم نے بالشویک اقتدار کو روکنے کے لئے خود مختاری

کا اعلان کر دیا۔"

۱۹۱۷ء میں علاحدہ نہ ہونے کے جذبات تمام تر ترک رہنماؤں میں کار فرما تھے بالشویک دور حکومت کے شروع میں ان کو خیال تھا کہ افراتفری اور تشدد کے خاتمے پر سوویٹ حکومت ایک جائز روسی حکومت بن جائیگی جو کہ ترکوں کی مذہبی تمدنی اور سیاسی روایات کا احترام کرتے ہوئے ان کے خود مختاری کے منصوبوں کو پورا کرے گی۔ مملکت کے ذہنی اور سیاسی حصے بکھرے اس وقت شروع ہوئے جبکہ لینن کے سیاسی ہتھکنڈے نمایاں ہوئے۔ قلیل عرصے والی "سفید حکومت" نے مرکزیت پر جو زور دیا اس کی وجہ سے بیشتر ترک رہنما سوویٹ کے حامی طرفدار ہو گئے جنہوں نے ان سے خود مختاری کا وعدہ کیا تھا۔ خانہ جنگی کے دوران بیشتر مواقع پر ترکوں نے سرخ اور سفید روسیوں کے درمیان "غیر جانبداری سے کام لیا۔ یہ بتانا مشکل ہے کہ یہ غیر جانبداری مصلحتاً" سیاسی چال تھی یا محض اہل مشرق کی روایتی بے حسی۔ ویسے بھی خانہ جنگی کے دوران عوام کے عمرانی اور ثقافتی حالات کو دیکھتے ہوئے یہ بات ظاہر ہے کہ ترک رہنما ان حالات میں کسی نئے حقیقت پسند سیاسی لائحۂ عمل کی توضیح نہیں کر سکتے تھے۔

الغرض یہ کہ انقلاب ۱۹۱۷ء کے دوران روس کے ترک ایک تغیر پذیر کیفیت سے گذر رہے تھے۔ یہ دور بڑی حد تک سر سید احمد خاں کے دور سے مطابقت رکھتا ہے جبکہ ہندوستانی مسلمانوں نے صدیوں کی تمدنی روایات کو چھوڑ کر مغربیت کی طرف رخ کیا۔ اسی قسم کا دور ترک نژاد اقوام کے لئے بھی طلوع ہو رہا تھا۔ اور انقلاب روس کے وقت

ان کے افکار و نظریات مد و جزر کے عالم میں تھے تقدیر نے ان کو دگرگوں حالات میں مبتلا کر دیا تھا۔ قومی حقوق کے حصول کی جد و جہد اور انقلابی دور کی سیاسی تیاریوں میں وہ اپنے حریف سے پیچھے تھے۔ عوام کے شیرازے کو ایک منظم جماعت کی حیثیت دینے کے لئے سیاسی مفکروں کی ضرورت تھی۔ ہنگامی اور انقلابی حالات میں ایک طاقتور اور تربیت یافتہ سیاسی جماعت کی تشکیل آسان کام نہیں ہے۔ وسطی ایشیا کے مسلمانوں کی راہ میں ناتجربہ کاری اور ناپختہ کاری سب سے بڑی رکاوٹیں تھیں۔ حالات کا صحیح جائزہ لئے بغیر بے تنظیمی و بے ربطی سے کام کرنے کے نتائج خراب ہی نکل سکتے تھے۔ وسطی ایشیا کی سیاست میں "قدیم" اور "جدید" کی کشمکش نہایت شدت اختیار کر چکی تھی۔ اندرونی خلفشار، قومی رقابتوں اور ذاتی حسد نے مسلمانوں کو مزید کمزور بنا دیا تھا۔ الغرض یہ کہ حالات نے ایک ایسا افسوسناک تانا بانا بن دیا تھا کہ سلطنت روس کے ترک مسلمان اپنی قسمتوں کو سنوار نہ سکے۔

ضمیمہ

سوویٹ یونین کی اسلامی ریاستیں

موجودہ زمانہ میں سوویٹ وسطی ایشیا حسب ذیل جمہوریوں پر مشتمل ہے۔

وفاق روس کے اندر

۱۔ قزاقستان سوویٹ سوشلسٹ جمہوریہ :- اس خود مختار جمہوریہ

کا قیام اگست ۱۹۲۰ء میں ہوا اور دسمبر ۱۹۳۶ء میں اس کو یونین جمہوریہ

کا درجہ دیدیا گیا۔ قزاقستان کا رقبہ ۲٫۷۱۵٫۱۰۰ مربع کلومیٹر اور آبادی

۱۱٫۵۶۸٫۰۰۰ ہے۔ اس میں ۳۰٪ قزاق اور ۴۳٪ روسی ہیں۔

یہ جمہوریہ رقبے میں وفاق روس کے بعد سب سے بڑی ہے، یہ والگا سے

لے کر الطائی تک اور سائبیریا کے میدانوں سے لے کر وسطی ایشیا کے

ریگستانوں تک پھیلی ہوئی ہے۔ قزاقستان غلہ کی بہت بڑی منڈی ہے

اور سوویٹ یونین کا ایک چوتھائی غلہ یہیں پیدا ہوتا ہے۔ جمہوریہ قزاقستان

میں گیہوں کی پیداوار آسٹریلیا، ارجنٹائن اور کناڈا سے زیادہ ہوتی ہے

اس کے علاوہ بھی یہاں متعدد اجناس کی کاشت ہوتی ہے۔ اس کا

دارالحکومت آلماعطا ہے۔

۲۔ ازبک سوویٹ سوشلسٹ جمہوریہ:۔ اس کو عرف عام میں ازبکستان بھی کہتے ہیں

اس یونین جمہوریہ کا قیام اکتوبر ۱۹۲۴ء میں عمل میں آیا۔ اس کا رقبہ ۴۴۹,۶۰۰ مربع کلومیٹر اور آبادی ۹,۷۱۴,۰۰۰ ہے۔ اس میں ۶۲٪ ازبک، ۱۳٪ روسی اور ۶٪ تاتاری ہیں۔

ازبکستان وسط ایشیائی جمہوریہ میں سب سے ترقی یافتہ ہے۔ وسط ایشیا کے عین درمیان یہ سوویٹ یونین کے جنوب مشرقی حصے میں واقع ہے۔ یہاں کی آب وہوا انتہائی خوشگوار ہے۔ یہ جمہوریہ کپاس کی پیداوار کے لئے مشہور ہے۔ امریکہ اور چین کے بعد کپاس کی پیداوار میں اس کا تیسرا نمبر ہے۔ ازبکوں نے نظام آبپاشی میں بڑا کمال حاصل کیا ہے۔ بخارا سمرقند، فرغانہ اور تاشقند کے اطراف وجوانب میں زرخیز نخلستان آباد ہوگئے ہیں۔ ازبکستان میں تمام تر کاشتکاری مشینی طریقوں سے کی جاتی ہے یہاں کے عوام بھی یوروپی طور طریق سے کافی متاثر ہیں اور شہروں میں مغربی اور مشرقی تہذیب کا امتزاج نظر آتا ہے۔ اس کا دارالحکومت تاشقند ہے۔

۳۔ تاجکستان سوویٹ سوشلسٹ جمہوریہ:۔ اکتوبر ۱۹۲۴ء میں اس کا قیام بحیثیت خود مختار جمہوریہ عمل میں آیا اور دسمبر ۱۹۳۶ء میں اس کو یونین جمہوریہ کا درجہ دیدیا گیا۔ تاجکستان کا رقبہ ۱۴۳,۱۰۰ مربع کلومیٹر اور آبادی ۲,۳۴۱,۰۰۰ ہے۔ اس میں ۵۳٪ تاجک، ۲۳٪ ازبک اور ۱۳٪ روسی ہیں۔

جمہوریہ تاجکستان کا زیادہ تر علاقہ پہاڑی ہے۔ پامیر کے تمام تر پہاڑ جن میں سوویٹ یونین کے سب سے اونچے پہاڑ شامل ہیں، اسی علاقہ میں واقع ہیں۔ تاجکستان میں کوئلہ، تیل، گیس، سیسہ، سونا، چاندی اور دوسری بہت سی معدنیات نکلتی ہیں جس کی وجہ سے یہاں صنعت کو بڑی ترقی ہوئی ہے۔ تاجکستان کا دارالحکومت ڈشنبے (سابقہ اسٹالن آباد) ہے۔

۴۔ ترکمان سوویٹ سوشلسٹ جمہوریہ: یہ جمہوریہ اکتوبر ۱۹۲۴ء میں قائم ہوئی۔ اس کا رقبہ ۴۸۸,۱۰۰ مربع کلومیٹر اور آبادی ۱,۸۰۲,۰۰۰ ہے۔ اس میں ۶۱٪ ترکمان، ۱۷٪ روسی اور ۸٪ ازبک ہیں۔

ترکمانستان اور شمالی افریقہ ایک ہی عرض البلد پر واقع ہیں۔ اس علاقہ میں وسطی ایشیا کا سب سے بڑا ریگستان "کراکم" واقع ہے جو اس کے رقبہ کا تقریباً اسّی فیصد ہے۔ پانی یہاں کی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتا ہے اور اس لئے ترکمانستان میں نظام آبپاشی، نہروں اور تالابوں کو بڑی اہمیت ہے۔ یہاں "عظیم کراکم نہر" کی تعمیر ہو رہی ہے جو دنیا میں آبپاشی اور جہازرانی کی سب سے بڑی نہر ہوگی۔ ترکمانستان کی آب و ہوا کپاس کی کاشت کے لئے نہایت موزوں ہے اور یہاں کپاس کی پیداوار فی ایکڑ دنیا میں سب سے زیادہ ہے۔ یہاں تیل اور گیس کے بڑے بڑے ذخیرے اور دوسری معدنیات بھی پائی جاتی ہیں جس کی وجہ سے کیمیائی صنعت کو بڑی ترقی ہوئی ہے۔ یہاں کا دارالحکومت عشق آباد ہے۔

۵۔ قرغیز سوویٹ سوشلسٹ جمہوریہ: اکتوبر ۱۹۲۴ء میں علاقائی خود مختاری

دی گئی، فروری ۱۹۱۶ء میں یہ خود مختار جمہوریہ بن گئی اور دسمبر ۱۹۳۶ء میں اس کو یونین جمہوریہ کا درجہ دیدیا گیا۔ اس کا رقبہ ۱۹۸،۵۰۰ مربع کلو میٹر اور آبادی ۲،۴۸۸،۰۰۰ ہے۔ اس میں ۴۰٪ قرغیز، ۳۰٪ روسی اور ۱۰٪ ازبک ہیں۔

جمہوریہ قرغیزیہ سربفلک تیان شان (آسمانی پہاڑ) اور پامیر کے پہاڑی سلسلوں کے اتصال پر واقع ہے یہ علاقہ گوناگوں حسین مناظر اور مختلف النوع آب و ہوا کے لئے مشہور ہے۔ اس صدی کے اوائل تک یہاں کے لوگ خانہ بدوشی کی زندگی گذارتے تھے اور مویشی پالتے تھے۔ انقلاب روس کے بعد سے یہاں کی معیشت میں بڑی تبدیلیاں آگئی ہیں، خانہ بدوش زمین پر آباد ہو گئے ہیں۔ یہاں گیہوں بہت کثیر مقدار میں پیدا ہوتا ہے اس کے لئے تمباکو اور کپاس وغیرہ کی بھی کاشت ہوتی ہے قرغیزیہ اپنی وسیع چراگاہوں کے لئے بھی مشہور ہے اور یہاں مویشی بڑی تعداد میں پالے جاتے ہیں۔ اس کا دارالحکومت فرنز ہے۔

وسطی ایشیا کی ان ریاستوں کے علاوہ ماورائے قفقاسیہ میں جمہوریہ آذربیجان واقع ہے۔ جو اپریل ۱۹۲۰ء میں قائم ہوئی اس کا رقبہ ۸۶،۶۰۰ مربع کلو میٹر اور آبادی ۴،۳۸۱،۰۰۰ ہے۔ اس میں ۶۸٪ آذربیجانی اور ۱۳٪ روسی ہیں۔

جمہوریہ آذربیجان ماورائے قفقاسیہ کے مشرقی حصہ میں بحیرۂ کیسپین (قزوین) کے بالمقابل واقع ہے۔ باکو کے تیل کے چشمے بہت زمانہ سے شہرۂ آفاق ہیں۔ آذربیجان کو اسی وجہ سے "سیاہ سفید سونے" کا ملک کہا جاتا ہے۔ تیل کی صنعت کے علاوہ بھاری انجینیرنگ اور معدنیاتی

انجنیئرنگ کی صنعتیں بھی یہاں قائم ہیں۔ اس کا دارالحکومت باکو ہے۔

وفاق روس میں تاتاریہ اور باشقردستان کی خود مختار جمہوریہ واقع ہیں۔ یہ ریاستیں والگا۔یورال خطہ میں ہیں۔ اس علاقہ پر روسی تسلط سولہویں صدی میں قائم ہو گیا تھا اور اسی لئے آج یہاں مسلمانوں کی تعداد کم اور روسی آبادکاروں کی آبادی بہت ہے۔

تاتاریہ

یہ جمہوریہ باشقردستان کے مغرب میں واقع ہے دریائے والگا (ایدل) اس کے درمیان میں شمال مشرق سے جنوب مغرب کو بہتا ہے۔ دریائے کاما اس کا معاون دریا ہے۔ تاتاریہ کا رقبہ ۶۸،۰۰۰ مربع کلومیٹر اور آبادی ۲،۸۵۰،۰۰۰ ہے۔ اس میں ۵۱٪ تاتار، ۴۲٪ روسی اور بقیہ دوسری اقوام ہیں جن میں چواش قابل ذکر ہیں۔

یہاں گیہوں، آلو اور چارہ کثرت سے کاشت ہوتا ہے۔ تاتاریہ میں بہت سی معدنیات بھی نکالی جاتی ہیں اور تیل بھی نکلتا ہے جس کی صنعت روز بروز ترقی کر رہی ہے۔ قازان یونیورسٹی روس کی قدیم اور بہترین درسگاہوں میں شمار ہوتی ہے۔ ٹالسٹائی اور لینن اس کے مشہور طالب علموں میں سے ہیں۔ اس کا دارالحکومت قازان ہے۔

باشقردستان

اس کو عرف عام میں باشقیریا بھی کہتے ہیں۔ باشقیریا کا رقبہ ۱۴۳،۶۰۰ مربع کلومیٹر اور آبادی ۳،۸۰۰،۰۰۰ ہے۔ اس میں ۲۵٪ باشقیری (جو مسلمان ہیں) ۴۰٪ روسی اور بقیہ یوکرینی اور تاتاری ہیں۔

یہ جمہوریہ جنوبی یورال کی مغربی ڈھلانوں پر واقع ہے اور یہاں

کا زیادہ تر علاقہ پہاڑی جنگلوں سے ڈھکا ہوا ہے۔ وادیوں میں گھاس کے زرخیز میدان ہیں۔ باشقیریا کا بڑا دریا بیلایا ہے جو اس جمہوریہ کے جنوب سے شمال مغرب کو پانچ سو میل بہہ کر دریائے کاما میں مل جاتا ہے۔

باشقیریا میں معدنیات کی بہتات ہے اور یہی اس کی بڑی دولت ہے۔ تیل بھی بہت مقدار میں نکلتا ہے اور اس کی صنعت بڑی ترقی یافتہ ہے۔ اس کا دارالحکومت اوفا ہے۔

ضمیمہ (۲)

ترک

ترکوں کی اصل و بنا کے بارے میں یقینی طور سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ پانچویں چھٹی صدی عیسوی میں چینیوں نے پہلی دفعہ لفظ "تُو کیو" استعمال کیا۔ یہ نام ان خانہ بدوش قبائل کے لئے مذکور رہا ہے جنہوں نے منگولیا اور شمالی چین کی سرحدوں سے لے کر بحیرۂ اسود تک اپنی سلطنتیں قائم کر رکھی تھیں۔ لسانی اور تاریخی شہادت کی بنا پر ترک انہی قبائل سے منسلک ہیں۔ دو ہزار قبل مسیح کی چینی روایات میں "ہیونگو" نام بھی ذکر ہوا ہے لیکن یہ غالباً منگول، ترک اور دوسری اقوام کا مجموعی نام تھا۔

ترکوں کی ایک سلطنت جھیل بیکال کے خطہ میں اور دوسری موجودہ سوویٹ وسطی ایشیا میں قائم تھی۔ یہ دونوں سلطنتیں چین کی باجگذار تھیں۔ جھیل بیکال کے ترکوں نے ساتویں صدی کے اواخر میں آزادی حاصل کر لی۔ ترکوں کی قدیم ترین دستاویزات جو "اُرخان کیتبوں" کے نام سے مشہور رہیں اسی سلطنت سے متعلق ہیں۔ ان کتبوں سے تین قبیلوں اوغوز، اولیغور جو منگولیا میں آباد تھے اور قرغیز کا حوالہ ملتا ہے۔ آٹھویں صدی میں اولیغوروں نے اوغوز قبائل کو نکال کر منگولیا میں اپنی حکومت

قائم کرلی۔ اوغوز جنوب کی طرف چلے گئے۔ موجودہ اناطولیہ کے ترک ترکمان اور آذربیجانی انہیں اوغوز قبائل کی اولاد ہیں۔ نویں صدی میں قرغیز منگولیا پر قابض ہوگئے جہاں سے ان کو دسویں صدی میں نکلنا پڑا اور یہ اُس خطّہ میں جا بسے جو آج قرغیزیہ کہلاتا ہے۔ اویغوروں نے منگولیا سے نکل کر مشرقی سنکیانگ پر قبضہ کرلیا۔

ساتویں صدی میں مسلمانوں نے ایران اور ماوراء النہر کو فتح کرلیا اور ۶۵۰ء تک ان کا اقتدار تاشقند اور فرغانہ وغیرہ پر قائم ہوچکا تھا۔ ساتویں سے دسویں صدی تک وسطی ایشیا عباسی خلفا اور ایرانی سلطنت کے تحت رہا اور اسی لئے آج تک ترک اقوام کے نسلی اور تمدنی خاکہ میں ایرانی رنگ جھلکتا نظر آتا ہے۔ شمالی قزاقستان اور مغربی سائبیریا میں اسلام سب سے بعد بارہویں صدی میں پہونچا۔ دسویں صدی میں ترکوں کا عروج ہوا اور وہ اپنے علاقوں پر پھر سے حاکم ہوگئے۔ محمود غزنوی نے کابل قندھار کے علاقہ میں غزنوی خاندان کو عروج دیا۔ کاشغر ختن میں اوغوز سلطنت قائم ہوئی۔

ترکوں کے قبیلہ ترکمان کے ایک سردار سلجوق بن یقاق نے سلجوقی خاندان کی بنیاد ڈالی۔ سلجوقیوں نے غزنویوں کا خاتمہ کر کے اپنی سلطنت قائم کی۔ سلجوقی سلطان الپ ارسلان نے رومیوں (بازنطینیوں) کو شکست دے کر سلطنت کو وسیع کیا اور بالآخر تمام مغربی ایشیا مع مصر سلجوقیوں کے زیر نگیں آگیا۔ مشرق میں خوارزم کے شاہوں نے خراسان اصفہان اور سمرقند و بخارا پر تسلط قائم کرلیا۔

تیرھویں صدی میں منگول تمام ترک علاقوں اور زمینوں پر قابض ہوگئے

اور تمام ترک قبائل ان کے زیر حکومت آگئے۔ چنگیز خاں کے مرنے کے بعد جب اس کی سلطنت کئی حصوں میں بٹ کر کمزور ہو گئی تو ترک صوبیدار آزاد و خود مختار بن گئے۔ چودھویں صدی میں تمام تر "سنہری غول" نے قبول اسلام کر لیا۔ اور غوچی اور چغتائی کے جانشین ترکوں میں جذب ہو گئے۔ سلجوقیوں کو منگولوں نے تباہ و برباد کر دیا تھا۔ ان کی کمزوری نے عثمانی ترکوں کو عروج کا موقعہ دیا۔ سلجوقیوں کی طرح عثمانی بھی اوغوز قبائل سے متعلق تھے۔ قبیلۂ عثمان بحیرہ مارمورا کے کناروں پر آباد تھا اور چودہویں ربع صدی سے ان کا عروج شروع ہوتا ہے۔ سولہویں صدی میں سلطنت عثمانیہ اپنے انتہائی عروج کو پہنچ گئی جو پہلی جنگ عظیم کے بعد موجودہ جمہوریہ ترکیہ کی صورت میں باقی رہ گئی۔

۱۳۶۹ء میں تیمور نے منگولوں سے اقتدار چھین کر "سنہری غول" کی سلطنت، ایران، دہلی، بغداد اور دمشق تک اپنا تسلط جما لیا تھا۔ ۱۴۰۲ء میں تیمور نے عثمانی سلطان بایزید اول کو انقرہ کے قرب و جوار میں زبردست شکست دی۔ تیمور برلاس ترک تھا اور اس کے قبیلہ پر اسلام کا رنگ اچھی طرح چڑھ چکا تھا۔ تیمور اور اس کے جانشینوں کی سرپرستی میں وسطی ایشیا علم و فضل کا گہوارہ بن گیا اور منگولوں کی تاخت و تاراج نے جو انحطاط اور جمود طاری کر دیا تھا وہ بڑی حد تک کم ہو گیا۔ سولہویں صدی کے اوائل میں منگولوں کے ایک قبیلہ ازبک کا عروج ہوا۔ ۱۵۰۰ء میں ازبک سردار شیبانی خاں نے بابر کو شکست دے کر خاندان تیموریہ سے اقتدار لے لیا۔ ۱۵۱۰ء میں شاہ اسمٰعیل صفوی نے شیبانی خاں کو شکست دے کر مرو تک کا علاقہ اپنی سلطنت

میں شامل کر لیا۔ ازبکوں کی حکومت آمو دریا کے شمالی علاقوں میں محدود رہ گئی اور اٹھارویں صدی تک ان کی تین ریاستیں بخارا، جنیوا (خوارزم) اور خوقند قائم ہو گئیں۔ ۱۷۴۰ء میں نادر شاہ نے خیوا اور بخارا پر قبضہ کر لیا لیکن یہ حکومت جلد ہی ختم ہو گئی۔ ۱۷۵۳ء سے لے کر ۱۹۲۰ء تک جب سوویٹ اقتدار قائم ہوا یہ ریاستیں آزاد رہیں۔ ماورائے قفقاسیہ بھی ایرانی سلطنت میں شامل کر لیا گیا تھا۔ ۱۸۱۲ء میں آذربیجان ایران اور روس کے درمیان منقسم ہو گیا۔

پندرہویں صدی کے آخر میں روس منگولوں سے آزاد ہو گیا اور اس کے بعد سے یورپی ترک سلطنت روس اور سلطنت عثمانیہ کے زیر نگیں آ گئے۔ صرف کریمیا ۱۷۸۳ء تک آزاد رہا جب اس پر بھی روسی قبضہ ہو گیا۔ ۱۴۸۰ء کے بعد سے روسیوں نے ایشیا میں تسخیر شروع کی اور ترکوں پر حکمرانی کی۔ سترہویں صدی تک شمالی قفقاسیہ، والگا، باشقیریا سائبیریا کے ترک قبائل روسی استبداد کا شکار ہو چکے تھے ۱۸۷۸ء تک تمام قفقاسیہ اور کریمیا پر روسی تسلط قائم ہو چکا تھا۔ ۱۹۰۰ء تک چین، افغانستان اور ایران کی سرحدوں تک وسطی ایشیا پر روسی قبضہ مکمل ہو گیا۔

ترکوں کے اس مختصر تذکرہ سے یہ امر بخوبی ظاہر ہے کہ ان کی تاریخ میں خاصی پیچیدگی رہی ہے اور ترک اقوام کا تاریخی محل وقوع زمان و مکان میں حتمی طور پر متعین نہیں کیا جا سکتا۔ حد یہ ہے کہ ان کے ناموں تک میں زمانہ قدیم سے غلط فہمیاں ہوتی رہی ہیں۔ یورپی روس یعنی موجودہ تاتاریہ، باشقردستان، کریمیا اور شمالی قفقاسیہ کے ترکوں کو تاتار کہا

جاتا ہے۔ ازبک، ترکمان، قرغیز، قزاق، تاجک اور اویغور کے نام سے سیاسی تقسیم شدہ ترکوں کو ترک یا مغل، چغتائی اور سلجوق ترک کہتے ہیں۔ اس بات کا بابر نے بھی اپنی تزک میں تذکرہ کیا ہے کہ

"ہندیان وعربہا امتیاز ترک وتاتار ومغل راندارند"

ترک اقوام کی آبادی کے اعداد وشمار دینا بڑا مشکل مسئلہ ہے چین اور افغانستان جیسے ملکوں سے صحیح اعداد وشمار حاصل کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ سوویٹ یونین میں آخری اعداد وشماری جنوری ۱۹۳۹ء میں ہوئی تھی اس دوران میں دوسری جنگ عظیم بھی ہو چکی ہے جس نے دنیا کی آبادی پر دیرپا اثرات ڈالے ہیں لہٰذا اب ۱۹۳۹ء کے اعداد وشمار بھی قابل اعتبار نہیں رہے ہیں۔ مختلف اندازے حسب ذیل ہیں!

سوویٹ یونین	۲۰،۰۰۰،۰۰۰
(۱۹۳۹ء کی اعداد وشماری پر تخمینہ)	
ترکی	۲۲۵۰۰،۰۰۰
(۱۹۵۴ء کی اعداد وشماری)	
سنکیانگ	۴،۵۰۰،۰۰۰ (روسی تخمینہ)
	۸،۰۰۰،۰۰۰ (محمد امین بغرا کے مطابق)
ایران	۵،۰۰۰،۰۰۰
افغانستان	۱،۴۰۰،۰۰۰

اس کے علاوہ ترک بلغاریہ، رومانیہ، یونان، شام، قبرص، عراق، مصر اور سعودی عربیہ میں بھی پھیلے ہوئے ہیں۔ مختلف اعداد وشمار کی رو سے

دنیا میں ۵ — ۱۰ کروڑ ترک آباد ہیں۔

سوویٹ یونین کی دریاؤں میں والگا ایک بہت ہی اہم اور تاریخی دریا ہے۔ اسی علاقہ میں کوہ یورال جو معدنیات کا ذخیرہ ہیں واقع ہیں۔ ان پہاڑوں سے دریائے یورال نکلتا ہے۔ یوریشیا کی تاریخ میں اس والگا یورال خطہ (ایدل۔ اورال) نے بڑا نمایاں حصہ ادا کیا ہے۔ یہاں ترک اور سلافی اقوام کے اتصال نے ایک مشترکہ تہذیب و تمدن کو جنم دیا اور جس کا موجودہ تاریخ پر گہرا اثر پڑا ہے۔ اس علاقہ میں تین اقوام ترک، فن اوغور اور سلاف آباد ہیں۔ ترک اقوام تاتار، باشقیر (ترکی زبان میں ان کو باشقرد کہتے ہیں) اور چواش قبائل پر مشتمل ہیں اور ان کی مجموعی آبادی ساٹھ لاکھ سے اوپر ہے۔

تاتاری قوم میں ترک اور فن قبائل کا نسلی میل جول ہے اور ان کی زبان خالصتاً ترک ہے جس میں چغتائی اور عثمانی لہجوں کا عنصر غالب ہے "سنہری غول" کے خاتمہ پر تاتاریوں نے والگا۔ یورال خطہ میں تین ریاستیں قازان۔ استراخاں اور کریمیا قائم کر لیں جن میں قازان نے سب سے زیادہ اہمیت حاصل کی اور یہ تاتاریوں کا سیاسی اور تمدنی مرکز بن گئی۔ سلطنت روس کی ترک اقوام میں تاتاری سیاسی طور پر سب سے زیادہ بیدار تھے اور انیسویں صدی کے وسط سے انہوں نے مسلمانان روس کی سیاسی اور قومی زندگی میں نہ صرف ممتاز اور نمایاں کردار ادا کیا بلکہ قیادت اور نیابت بھی کی یہاں تک کہ ان کی قیادت اور سربراہی نے روس کے مسلمانوں میں رشک و حسد کے جذبات کو بھڑکا دیا اور ان میں تاتاریوں کے خلاف ردِّعمل پیدا ہو گیا۔

چواش ترکوں پر بھی فن قبائل کا گہرا اثر پڑا ہے اور ان کی زبان ترک قبائل سے مختلف ہے۔ ان میں راسخ العقیدہ عیسائی، مسلمان اور بت پرست گروہ ہیں۔ مسلمان چواش اپنے نسلی بھائیوں سے زیادہ مہذب اور ترقی یافتہ ہیں۔

تیسرا ترک گروہ باشقیریوں کا ہے۔ یہ لوگ آغوزی ترک شمار کیے جاتے ہیں۔ چونکہ یہ لوگ دوسرے قبائل خصوصاً فن۔ آغور سے شادی بیاہ کرتے رہے ہیں۔ لہٰذا اُن کی نسلی خصوصیات باشقریوں میں بھی آگئی ہیں۔ یہ لوگ شروع سے روسی استبداد کے خلاف لڑتے رہے ہیں ۱۶۴۵ء، ۱۶۶۱ء، ۱۶۸۲ء، ۱۶۸۳ء اور ۱۷۰۵ء میں ان لوگوں نے متعدد بغاوتیں کیں جو سختی سے کچل دی گئیں۔ روسی پادریوں نے باشقیریا میں تبلیغ مسیحیت کی مہم زور شور سے جاری کی تھی جس کے نتیجہ میں ۱۷۷۵ء میں خونریز ہنگامے ہوئے۔ حکومت روس نے یہاں کی زمینیں ضبط کر کے اُن پر کثیر تعداد میں نوآبادکاروں کو بسا دیا۔ ۱۹۱۷ء کے انقلاب کے بعد باشقیری عوام نے آبادکاری کے خلاف سیاسی مہم چلائی۔

سائبیریا میں آباد یاقوت بھی ترک النسل ہیں، اور ان کی زبان بھی ترک زبان سے متعلق ہے۔ مذہباً یہ لوگ عیسائی ہیں۔

الغرض یہ کہ ترک قوم دنیا کے وسیع خطوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ انہوں نے دنیا کی تاریخ میں نمایاں حصہ لیا ہے اور اسلام کی شاندار خدمات انجام دی ہیں۔ ہند و پاکستان کی مذہبی، تمدنی، ثقافتی اور ادبی زندگی ان کی بڑی مرہون منت ہے۔ بلاشبہ ترک دنیا کی قدیم اور عظیم اقوام میں سے ایک ہیں اس قوم کے متعلق رسول اللہ نے فرمایا تھا "الترک ماترکوکم، فانہم قومٌ طوالٌ" (ترکوں کو مت چھیڑو جب تک وہ تم کو نہ چھیڑیں اس لئے کہ یہ بہت بڑی قوم ہیں) (بخاری)

ضمیمہ (۳)

بصماچی تحریک

روسی مورخین نے سوویٹ اقتدار کے خلاف ترکستان کے عوام کی جدوجہد آزادی کو "بصماچی تحریک" کے نام سے موسوم کیا ہے۔ ترکی زبان میں لفظ "بصماچ" (باسماچ) سے "راہزن، لٹیرا، چھاپہ مار" مراد لیا جاتا ہے۔ سوویٹ اقتدار کے خلاف یہ جدوجہد ۱۹۱۷ء سے شروع ہوکر کسی نہ کسی شکل میں ۱۹۳۱ء تک جاری رہی۔ یہ جدوجہد آزادی فرغانہ (خوقند) کی وادی سے شروع ہوکر ترکستان کے وسیع علاقوں میں پھیل گئی تھی اور عوام کی بھاری اکثریت نے جن میں ازبک قبائل ممتاز تھے، اس میں حصہ لیا۔

لینن اور اسٹالن کے وعدوں کے باوجود جب اشتراکیوں نے اسلام دشمنی کا مظاہرہ کیا اور ترکستان کی خودمختاری کو کچلنے کی کوشش کی تو عوام کے جذبات بھڑک اٹھے اور ہر سو قوم پرستی اور اتحاد اسلامی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی۔ ۱۹۲۱ء-۱۹۲۴ء کے دوران یہ عوامی تحریک اسلامی زور پکڑ گئی اور تحریک کے رہنماؤں نے ترکستان کی مکمل آزادی کا اعلان کردیا

اولاً قدیم اسلحہ جات سے مسلح عوام نے اپنے حوصلہ وہمت اور بہادری سے سرخ افواج کے دانت کھٹے کر دیئے لیکن جدید اسلحہ جات کی کمیابی مرکزی تنظیم کے فقدان اور اندرونی رنجشوں اور رقابتوں نے اس تحریک کو کمزور کر دیا اور بالآخر سوویٹ حکومت نے زبردست طاقت کا استعمال کر کے اس تحریک کو کچل دیا۔

سوویٹ مورخین نے اس عوامی "شورش وبغاوت" کو معاشی واقتصادی نقطۂ نظر سے واضح کرنے کی کوشش کی ہے اور روس کی خانہ جنگی کی وجہ سے پیدا شدہ سقیم اقتصادی حالات کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ خانہ جنگی کی وجہ سے ترکستان کی کپاس کا روس کے صنعتی علاقوں میں جانا بند ہو گیا اور اس کی وجہ سے بیروزگاری پھیل گئی۔ یہ تاریخ کو مسخ کرنے کی ایک سستی سی کوشش ہے۔ انگریزوں نے بھی بالکل اسی طرح ہماری جنگ آزادی کو "غدر" کا نام دے کر لغو اور مہمل تاویلات پیش کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ عوامی تحریک نہ تھی۔

بصماچی تحریک ایک خالصتاً عوامی تحریک تھی جس کو روسی مورخین نے خود قبول کیا ہے کہ کسانوں اور مزدوروں سے لے کر جاگیردار، امرا و رؤسا، علما، متوسط طبقہ اور قبائلی سردار سب ہی شامل تھے۔ امرا اور صاحب حیثیت افراد نے ہر ممکن مالی معاونت کی اور علماء نے گاؤں گاؤں، شہر شہر عوام کو منظم کیا۔ دیہاتوں میں کسانوں اور دیہی حکام نے بصماچی گروہوں کو غلہ، خوراک، چارہ اور اسلحہ مہیا کیا۔ تاشقند کی اشتراکی حکومت نے اسلام کے خلاف جو انتظامی اقدام اٹھائے تھے وہ اس جدوجہد کی اصل بنا تھے، مسجدیں منہدم کی جا رہی تھیں، علما اور مدرسوں

پر پابندیاں عائد کی گئیں اور بہت سے ایسے اقدام اٹھائے گئے جنکا مقصد اسلام کی بیخ کنی تھا۔ مغربی سامراجیت کے خلاف، اسلام کی بقا اور تحفظ کے لئے ترکستان کے مسلمانوں کی یہ آخری مسلح کوشش تھی جو ان کی کم مائیگی اور کسمپرسی کی وجہ سے بالآخر ناکام ہوگئی۔

مورخین اس امر پر متفق ہیں کہ جن علاقوں پر بصماچی تسلط تھا وہاں مقامی نظم و نسق عمدگی سے کارفرما تھا اور ان علاقوں میں مکمل امن و امان قائم تھا۔ لوٹ مار اور رہزنی کا نام و نشان بھی نہ تھا اور ٹیکس پابندی سے وصول ہوتے تھے۔ سوائے بالشویکوں کے تمام بیرونی افراد کو نقل و حرکت کی مکمل آزادی تھی۔

بصماچی تحریک میں انور پاشا کی شمولیت نے اس کو بڑی تقویت اور عالمی شہرت دی۔ انور پاشا ایک حسین و وجیہہ اور غیر معمولی صلاحیتیں رکھنے والے انسان تھے۔ پہلی جنگ عظیم میں ترکی کی شکست کے بعد وہ جرمنی اور وہاں سے ماسکو چلے گئے۔ وہ اشتراکیوں کی مدد سے انگریزوں کے خلاف جدوجہد جاری رکھنا چاہتے تھے اور وسطی ایشیا میں ایک اسلامی ریاست کا خواب دیکھ رہے تھے۔ اتاترک سے ان کے ذاتی اور نظریاتی اختلافات پیدا ہو گئے تھے۔ چونکہ وہ یورپی سامراجیت سے متنفر تھے اور انقلابی خیالات رکھتے تھے لہٰذا سوویٹ حکومت نے ان کو خوش آمدید کہا مگر جلد ہی انور پاشا لینن اور ان کے اشتراکی رفقار کے عزائم کو بھانپ گئے اور جب سوویٹ حکومت نے اتاترک سے صلح اور سودا کرلیا تو وہ مایوسی کے عالم میں بخارا چلے گئے۔ جلد ہی انہوں نے خیوا، فرغانہ اور سمرقند کے بصماچی گروہوں کی قیادت سنبھال لی۔

ترکستان میں ان کی موجودگی نے عوام میں حوصلہ اور امید کی ایک نئی لہر دوڑا دی تھی۔ انور پاشا کے قیادت سنبھالنے سے تمام سیاسی اور ذاتی اختلاف مٹ گئے اور تحریک میں نئی جان پڑگئی۔ انہوں نے "مسلمانان عالم متحد ہو جاؤ" کا نعرہ بلند کیا۔ اولاً انور پاشا کی قیادت میں بصماچی تحریک کو بڑی فوجی کامیابیاں نصیب ہوئیں لیکن ذرائع کی کمیابی اور سوویٹ افواج کی بڑھتی ہوئی منظم طاقت کے سامنے وہ مجبور ہو گئے۔ ۴ر اگست کو تاجکستان میں دُشنب کے نواح میں وہ ایک معرکہ میں شہید ہو گئے اور اس طرح عالم اسلام ایک درخشاں ستارہ کی ضیاپاشیوں سے محروم ہو گیا۔ انور پاشا کی شہادت کے بعد بصماچی تحریک کی کمر ٹوٹ گئی اور اس میں اندرونی خلفشار پیدا ہو گیا اور وسطی ایشیا میں سوویٹ اقتدار کو کسی قسم کا خطرہ نہیں رہ گیا۔

ذکی ولیدی طوغان نے بصماچی تحریک کا ان الفاظ میں ذکر کیا ہے

"۱۹۲۴-۱۹۱۸ء کے واقعات میری توقعات سے بڑھ چڑھ کر تھے۔ تعلیم یافتہ، دانشور اور متوسط طبقات نے کسانوں اور قبائلیوں کے شانہ بہ شانہ بے لوث اور بے غرضی کی فقید المثال روایات قائم کیں۔ ان میں ہر ایک میدان جنگ میں آگے بڑھ کر ایک ہیرو کی موت مرنا چاہتا تھا۔ وہ عوام جن کو گھر کی چار دیواری کے باہر کسی معاملہ سے غرض و غایت نہ تھی، انہوں نے ترکستان کی خاطر جنگ کی۔"

بصماچی تحریک نے ثابت کر دیا کہ وسطی ایشیا کے ترک ایک مردہ اور ناکارہ قوم نہیں تھے۔ اس تحریک نے ان کو ترکستان کی زندگی کے ایک نئے دور کے لئے تیار کیا، ایک ایسا دور جس میں وہ اپنی بقا کے لئے سر بکف ہو گئے۔

مستقبل میں ترکستان محض ایک تماشائی نہیں ہو گا، وہ اپنا موزوں کردار ادا کرے گا۔"

ضمیمہ

روس کی سیاسی جماعتیں

۱۹ ویں صدی کے وسط میں روس میں مالی، تعلیمی، قانونی اور انتظامی اصلاحات کا دور شروع ہوا لیکن اصلاحات کی رفتار قدرے سست تھی خصوصاً زراعتی دائرہ میں منفعت بخش نتائج جلدی ظاہر نہ ہو سکے۔ دراصل زمینوں کی تقسیم میں انصاف سے کام نہیں لیا گیا تھا اور بہت سی زمینیں اتنی چھوٹی اکائیوں میں بانٹ دی گئی تھیں کہ ان پر نئے طریقوں سے کاشتکاری کرنا منفعت بخش نہیں تھا۔ سرمایہ کی بھی کمی تھی، غلہ کم پیدا ہوتا تھا اور کسان زیادہ تر جاہل اور کاہل تھے اس کے برعکس زندگی کے دوسرے شعبوں کے مقابلہ میں صنعت نے بہت تیزی سے ترقی کی۔ مزدوروں اور صنعت کاروں کے مفاد کو مدنظر رکھتے ہوئے متعدد قوانین بنائے گئے لیکن روس ایک زراعتی ملک تھا اور وہ اس قدر جلد صنعتی ترقی کے لئے تیار نہ تھا۔ تقریباً دس فی صدی آبادی شہروں میں رہتی تھی اور صنعت کے لئے ان ہی میں سے مزدور مہیا ہو سکتے تھے۔ کارخانوں میں کام کے اوقات لمبے تھے اور پورے پورے خاندان ان کارخانوں میں روزی کماتے تھے،

مزدوروں کے مکانات انتہائی غلیظ اور ناقابل رہائش حالت میں تھے، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بچوں کی صحت و تعلیم پر اس کا مضر اثر پڑا۔ الغرض یہ کہ زراعتی مسائل کے ساتھ ساتھ صنعتی مسائل بھی پیدا ہوگئے اور الیگزنڈر دوم کی شروع کردہ اصلاحات کی رفتار سست پڑ گئی۔

۱۸۸۱ء میں الیگزنڈر دوم کے قتل کے بعد سیاسی اصلاحات رک گئیں حالانکہ صنعتی ترقی اور اس کے نتیجہ میں معاشرتی تبدیلیوں میں کوئی فرق نہیں آیا۔ الیگزنڈر سوم نے دستور سازی پر کام بند کردیا اور آمریت بحال ہوگئی اور محاسبی (سنسر شپ) قوانین سخت کر دیئے گئے۔ ملک میں تنگ نظر، خودغرض قدامت پسندوں کا اختیار قائم ہوگیا اسکولوں کے نصاب تعلیم میں تبدیلیاں کی گئیں اور ذہنی و فکری سرگرمیوں کو دبانے کی کوششیں کی گئیں۔ البتہ کسانوں کی بھلائی و بہبودی کے لئے کام ہوتا رہا صنعتی دائرہ میں کارخانوں میں کام کرنے والے بچوں کے لئے قانون بنائے گئے، نابالغ مزدوروں کے لئے تعلیم لازمی قرار دی گئی ا کام کے اوقات کم کئے گئے اور عورتوں کو رات میں کام کرنے کی ممانعت کر دی گئی۔ غرضکہ روس کی اصلاحات کو پس ماندہ کہا جاسکتا تھا لیکن اس میں جمود نہیں تھا۔

الیگزنڈر سوم کی تنگ نظر سیاست اور شخصی حکومت نے جس کے اصول "آمریت، راسخ العقیدگی اور قومیت" تھے نئے سیاسی نظریوں اور جماعتوں کو جنم دیا اور خیالی جماعتوں اور نظریوں نے عملی سیاست کی شکل لے لی۔ پاپولسٹ (POPULIST) دہشت پسند

(NIHILIST) انتشار پسند (ANARCHIST) جماعتیں ختم ہوگئیں اور ان کی جگہ نئی سیاسی جماعتوں نے لے لی۔

۱۔ کیڈٹ پارٹی (KONSTITUTIONAL DE-MOCRATS) اس کا نصب العین امن پسندانہ اور قانونی طریقوں سے ملک میں آئین نافذ کرنا تھا۔ یہ لوگ ترقی پسند تھے اور آزادی تحریر و تقریر، قانونی مساوات، طبقاتی امتیاز کا خاتمہ اور سوشل حالات میں بہتری کو نشر و اشاعت اور قانونی ذرائع سے قائم کرنا چاہتے تھے۔ اس جماعت کا قیام ۱۵ر اکتوبر ۱۹۰۴ء کو عمل میں آیا۔

۲۔ سوشل ڈیموکریٹ : یہ ایک انقلابی جماعت تھی۔ ۱۸۸۳ء میں پلیخانوف (G. V. PLEKHANOV) نے بیرون ملک پہلا اشتراکی گروہ قائم کیا۔ ۱۸۹۸ء میں اس پارٹی کا وجود عمل میں آیا۔ یہ جماعت بھی قانونی مساوات، آزادی تحریر اور دوسری شہری آزادیوں کے حق میں تھی لیکن ان کی تمام تر سرگرمیاں اقتصادی اور معاشی دائرۂ عمل پر مرکوز تھیں۔ یہ لوگ مزدوروں کے لئے زیادہ اجرتیں، کارخانوں کی بہتر حالت بنانے اور کام کے اوقات میں کمی کرنے کے خواہاں تھے۔ انہوں نے مزدوروں کو منظم کیا اور ہڑتالیں کروائیں۔ یہ لوگ زیادہ تر خفیہ کام کرتے تھے لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ اکثر و بیشتر حکومت کے جاسوس ان کی حوصلہ افزائی کرتے تھے تاکہ لوگوں کا دھیان سیاسی مقاصد سے ہٹایا جاسکے۔

اوّلاً اس سوشلسٹ جماعت کو قلیل مزدور طبقہ کی وجہ سے زیادہ تقویت نہیں ملی اور کسانوں نے ان کے نئے نئے خیالات کو قبول نہیں کیا

انیسویں صدی کے اواخر میں جو ہڑتالیں منظم کی گئیں ان سے خاطر خواہ نتائج بر آمد نہیں ہوئے چنانچہ سوشلسٹ جماعت میں پلخانوف کی محتاط پالیسی پر پھوٹ پڑ گئی ۔ ۱۹۰۳ء میں لندن کانفرنس میں اکثریت نے لینن کی سربراہی میں، جماعت سے علیحدہ ہو کر بالشویک گروہ کی بنیاد ڈالی۔ اقلیت جو منشویک کہلائے پلخانوف کے زیر قیادت ہی رہے۔ یہ گروہ اعتدال پسند تھا اور انقلابی اور انتہا پسندی کے بجائے آئینی طریقوں سے تبدیلیوں کے لئے کوشش کرتا رہا۔

ضمیمہ ۵

انقلابات روس

الیگزنڈر سوم کے مرنے پر نکولس دوم زار روس ہوا، لوگوں کو نئے زار سے بڑی توقعات تھیں اور ان کو امید تھی کہ آمریت کا خاتمہ ہو جائے گا لیکن جلد ہی ان کی امیدوں پر پانی پھر گیا اور نئے زار نے آمریت جاری رکھنے کا اعلان کر دیا۔ رد عمل کے طور پر ہر سو انتہا پسندی اور انقلابی خیالات تیزی سے پھیلنے لگے۔ ۱۸۹۶ء میں پیٹرزبرگ میں تیس ہزار مزدوروں نے ہڑتال کر دی۔ اشتراکی انقلابیوں کے لئے یہ بڑی خوشی کا دن تھا کیوں کہ اس ہڑتال نے ثابت کر دیا کہ عوام اقتصادی مطالبات کے لئے کوشاں ہیں۔ ۱۸۹۸ء میں سوشل ڈیموکریٹ پارٹی قائم ہوئی جو ۱۹۰۳ء میں، لندن کی کانفرنس میں دو گروہوں، بالشویک اور منشویک میں بٹ گئی۔ ملک میں بیشمار خفیہ جماعتیں قائم ہو گئیں، آمریت اور شخصی حکومت کے خلاف ردعمل بڑھتا گیا۔ دس سال کے عرصہ میں (۱۸۹۴ء-۱۹۰۴) سیاسی مجرمین کی تعداد نو سو سے پانچ ہزار تک پہنچ گئی۔

فروری ۱۹۰۴ء میں جاپانیوں سے شکست کھانے کے بعد حکومت کی حالت نازک

ہوگئی اور ملک میں انقلابی تحریکوں کی حوصلہ افزائی ہوئی حب الوطنی کے جذبات بھڑک اٹھے اور جولائی ۱۹۰۴ء میں روسی وزیر اعظم پلیہو (PLEHVE) کو بم سے اڑادیا گیا۔ ۸ستمبر کو بہت پس وپیش کے بعد نکولس نے نیا وزیر اعظم مقرر کیا جس کے تقرر پر لوگوں نے خوشی کا اظہار کیا۔ پیٹرز برگ میں آزاد خیال رہنماؤں نے نکولس کو شخصی اور شہری آزادیاں بحال کرنے کا مطالبہ پیش کیا، زار پس وپیش میں رہا، وقت تیزی سے گذر رہا تھا، عوام کے جذبات برانگیختہ ہوچکے تھے۔ ۹ رجنوری ۱۹۰۵ء اتوار کا دن تھا، کئی ہزار مزدور پادری گیپن (GAPON) کی قیادت میں (IKONS) مقدس گیت گاتے ہوئے زار کے "قصر سرما" کے باہر جمع ہوئے تاکہ وہ زار کو عرضداشت پیش کرسکیں، زار نکولس محل میں موجود نہیں تھا اور محافظ فوج نے نہتے مزدوروں پر گولی چلادی، تقریباً ہزار سے اوپر لوگ ہلاک ہوگئے، وزیر اعظم نے احتجاجاً استعفےٰ دے دیا۔ چند امرا قتل کردیئے گئے لیکن زار اب بھی قطعی فیصلہ کرنے سے قاصر رہا اور صرف اتنا وعدہ کیا کہ وہ جلد ہی قابل اعتماد اور لائق افراد کو نئے قانون بنانے کے لئے مشورہ کے واسطے طلب کرے گا۔

عوام کے جذبات شدت اختیار کر رہے تھے، متعدد وفود نے زار سے آئینی اصلاحات کی درخواستیں کیں لیکن کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ امن پسند دستور ساز جماعتوں اور انقلاب پسندوں میں پھوٹ پڑگئی۔ سوشلسٹ کی طاقتوں میں تیزی سے اضافہ ہونے لگا ۶ر اگست کو زار نے پارلیمنٹ (دوما) کے انتخابات کی منظوری دیدی جس میں کسانوں کو ۴۳ فیصدی، جاگیرداروں کو ۳۴ فیصد

اور شہریوں کو ۲۳ فیصد نمائندگی دی گئی۔ چونکہ اس ڈیوما کے اختیارات بہت محدود تھے لہٰذا ہر طرف غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ اکتوبر میں سوشلسٹوں نے ٹراٹسکی کی قیادت میں انقلابی سوویٹ (پنچایت، کونسل) قائم کر کے عام ہڑتال کا اعلان کر دیا جس نے تمام کاروبار اور زندگی کو معطل کر دیا انقلاب شروع ہو چکا تھا۔ ملک میں ہر طرف، ہر شعبہ زندگی اور ہر محکمہ میں اجتماع، ہڑتالیں اور ہنگامے شروع ہو گئے۔ ہر جماعت اور گروہ کا مطالبہ تھا کہ عام رائے شماری کے ذریعہ جمہوری حکومت کا قیام کیا جائے۔

۱۷ اکتوبر کو زار نے اس مشہور منشور پر دستخط کر دیئے جس کی رو سے تمام شہری آزادیاں بحال کر دی گئیں اور ڈوما کو قانون نافذ کرنے کا اختیار دیدیا گیا۔ ان اصلاحات میں کاؤنٹ وٹ (CO-UNT WITTE) کا بڑا ہاتھ تھا جو اب وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ وٹ درمیانہ روش کے صلح کن سیاستداں تھے لیکن حالات بہت بگڑ چکے تھے اور ان کے لئے مختلف جماعتوں سے تعاون حاصل کرنا تقریباً ناممکن ہو چکا تھا۔ عوام ابھی تک زار کی طرف سے مشکوک تھے۔ سوشلسٹ انقلابیوں نے پیٹرزبرگ کے مزدوروں میں سوویٹ قائم کر کے تقریباً متوازی حکومت قائم کر رکھی تھی۔ لینن اور ٹراٹسکی "پائیدار انقلاب" کا پرچار کر رہے تھے، کسانوں کے مسائل بھی حد کو پہونچ گئے اور جب وٹ نے اصلاحی اقدامات اٹھائے تو امرار طبقہ بھی ان سے بگڑ گیا۔ حالات حکومت کے قابو سے باہر ہوتے جا رہے تھے۔ ۳ دسمبر کو پیٹرزبرگ کے سوویٹ ممبران کو گرفتار کر لیا

اور حکومت نے سختی سے انقلابیوں کو کچل دیا۔ بالآخر ڈوما کے انتخابات منعقد ہوئے پادریوں، طالب علموں فوجیوں اور خانہ بدوشوں کو ووٹ کا حق نہیں تھا۔ جس میں کیڈٹ پارٹی کو بھاری اکثریت سے کامیابی ہوئی۔ اپریل ۱۹۰۶ء میں دوما کا پہلا اجلاس ہوا۔ اس سے قبل وٹ مستعفی ہو چکے تھے اور زار نے اجلاس سے چند روز قبل "بنیادی قانون" نافذ کر دیئے جس نے دوما کے اختیارات کو پھر محدود کر دیا زار کو اختیار مل گیا کہ وہ ہنگامی حالات میں دوما کی منظوری کے بغیر قانون نافذ کر سکتے ہیں۔

پہلی ڈوما (۱۰ مئی۔ ۲۱ جولائی ۱۹۰۶ء) کی زندگی بہت مختصر ثابت ہوئی۔ نمائندگان "بنیادی قانون" کی تنسیخ چاہتے تھے اور اس کی جگہ آزاد خیال قوانین نافذ کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے عام معافی، مالیہ پر اختیار، جاگیروں کی ضبطی، کارخانوں میں اصلاحات اور آئینی تبدیلیوں کا مطالبہ کیا لیکن حکومت نے ان کے مطالبات کو تسلیم نہیں کیا اور کچھ عرصہ بعد یک لخت ڈوما کو برخواست کر دیا۔

انقلابیوں کی سرگرمیاں از سر نو شروع ہو گئیں اور برخواست شدہ نمائندگان فن لینڈ کے شہر وائی بورگ میں اکٹھے ہوئے تاکہ نئے انتخابات منعقد ہونے تک اپنی کارروائیاں جاری رکھ سکیں۔ حکومت نے سخت اقدامات اٹھائے اور ساتھ میں ہی چند زرعی اصلاحات نافذ ہوئیں جن سے حکومت کو زراعت پیشہ طبقہ کی ہمدردیاں حاصل ہو گئیں۔

دوسری دوما (۵ مارچ۔ ۱۶ جون ۱۹۰۷ء) دوسری دوما انتخابات بھی زار کے حسب تمنا نہیں ہوئے اور حالانکہ کیڈٹ پارٹی

کی اکثریت گھٹ گئی لیکن سوشلسٹوں کو نمایاں کامیابی ہوئی۔ یہ ڈوما پہلے سے بھی زیادہ شدت پسند تھی اور بہت سی اصلاحات کے مطالبے کئے گئے چنانچہ یہ دوما بھی برخواست کر دی گئی۔

تیسری دوما (۱۴ر نومبر ۱۹۰۷ء - ۲۲ر جون ۱۹۱۲ء) اس دفعہ زار نے اپنی مرضی سے انتخابی قانون میں ردوبدل کر دیا انتخابی حلقوں کی نئی تنظیم ہوئی، قومی اقلیتوں کی نمائندگی کم کر دی گئی۔ جاگیرداروں اور امرار کی نمائندگی بڑھا دی گئی۔ تیسری دوما جس کا نومبر ۱۹۰۷ء میں اجلاس ہوا زیادہ تر اعتدال پسند اور قدامت پسند نمائندگان پر مشتمل تھی۔ حالانکہ یہ دوما عوام کی صحیح معنوں میں نمائندہ نہ تھی مگر روس کی تاریخ میں پہلی دفعہ ایک نمائندہ حکومت قائم ہوئی جس نے قومی اور بین الاقوامی معاملات میں نمایاں کردار ادا کیا۔ حالانکہ اس کے قانون ساز اختیارات محدود تھے مگر پھر کئی ترقی پسندانہ اصلاحات نافذ کی گئیں جن میں سب سے زیادہ قابل ذکر عام تعلیم کا منصوبہ ہے جس کو ۱۹۲۲ء تک مکمل ہونا تھا۔

تیسری دوما نے اپنی پوری زندگی (۱۹۱۲ - ۱۹۰۷ء) گذاری اور اس کے بعد چوتھی دوما (۲۸ر نومبر ۱۹۱۲ - ۱۱ر مارچ ۱۹۱۷ء) قائم ہوئی جس کے دور میں پہلی جنگ عظیم چھڑی۔

یکم اگست ۱۹۱۴ء کو روس، آسٹریا اور جرمنی کے مابین جنگ چھڑ گئی۔ یہ جنگ ایک ایسے نازک مرحلہ پر شروع ہوئی جبکہ ملک کو جاگیردارانہ نظام، صنعتی ترقی، جمہوریت کے قیام، طبقاتی کشمکش اور تعلیم وغیرہ کے مشکل مسائل کا سامنا تھا۔ جنگ میں روسیوں کو خاطر خواہ کامیابیاں نہیں

ہوئیں اور بے شمار سازو سامان اور جانیں ضائع ہوئیں۔ ۱۹۱۶ء کے آخر تک روس کی حالت بڑی نازک ہوگئی تھی۔ عوام میں بداطمینانی پھیل رہی تھی، حکمران طبقہ بالکل ناکارہ تھا اور ملک کی دولت اور ذرائع ضائع ہو رہے تھے۔ فوج کے پاس گولہ بارود اور اسلحہ جات کی کمی تھی بھاری صنعتوں کے لئے جرمنی اور یورپ سے خام مال آنا بند ہوچکا تھا اور تربیت یافتہ کاریگر مفقود تھے۔ حکومت اور عوام میں تعاون اور رابطہ ختم ہوچکا تھا اور حکومت کا خزانہ خالی ہو رہا تھا۔

جنگ نے اندرونی خلفشار کو مزید ہوا دی اور اس دوران جو وزیر اعظم اور حکام مقرر کئے گئے وہ قدامت پسند اور بددیانت ثابت ہوئے۔ اور ان کی کمزوریوں سے حکومت کے مخالفین کو تقویت پہونچی۔ مزدوروں اور کسانوں کا زور بڑھ گیا اور دوما نے مغربی یورپ کے طرز پر جمہوریت قائم کرنے کے مطالبے شروع کردیئے۔ نومبر ۱۹۱۶ء میں دوما میں کیڈٹ پارٹی کے سربراہ نے حکومت زار پر بدعنوانیوں اور بدنیتی کا الزام لگایا۔ دسمبر میں راسپوٹین کے قتل سے کشیدگی اور بڑھ گئی۔ فروری ۱۹۱۷ء میں روٹی کی کمیابی کی وجہ سے پیٹرزبرگ میں فسادات شروع ہوگئے اور دن بدن ہڑتالیں ہونے لگیں۔ دوما نے زار سے بارہا عوامی حکومت مقرر کرنے کی درخواست کی لیکن کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔ نوبت یہاں تک پہونچی کہ جب فوج کو بلوائیوں پر گولی چلانے کا حکم دیا گیا تو انہوں نے اس کو ماننے سے انکار کردیا اور اپنے افسروں کو ہلاک کر ڈالا۔ زار نے دوما توڑدی اور حکومت مستعفی ہوگئی۔ ہڑتالیوں اور بلوائیوں نے "روٹی" کے ساتھ ساتھ سیاسی تبدیلیوں کا مطالبہ بھی

شروع کر دیا۔ زار روس تخت سے دست بردار ہو گیا اور اس کو مع خاندان کے گرفتار کر لیا گیا۔ ڈیوما کے ترقی پسند گروہ نے عارضی حکومت قائم کر لی۔ پرنس لوف (PRINCE LVOV) وزیر اعظم اور سوشل انقلابی پارٹی کے رہنما کرینسکی (KERENSKY) وزیر انصاف مقرر ہوئے۔

نئی حکومت کے زیادہ تر ارکان متوسط طبقہ سے تعلق رکھتے تھے اور ان کو روس کے عوام کی حمایت حاصل نہ ہو سکی، یہ لوگ میانہ روی سے کام لیتے ہوئے دوران جنگ اقتصادی اور معاشرتی اصلاحات نافذ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ شروع سے ہی انتہا پسند قوتیں جو تعداد میں بے شک کم تھیں، لیکن حقیقت میں عوام الناس سے قریبی رابطہ رکھنے کی وجہ سے بہت طاقتور تھیں۔ مختلف سوویٹ انتہا پسند قوتوں کی نمائندہ تھیں۔ انہوں نے ظاہرا حکومت سے کوئی تعرض نہیں کیا بلکہ اپنی اصلاح و تنظیم میں مصروف رہے اور خفیہ حکومت کے نظم و نسق کی بنیادوں کو کھودتے رہے۔ انہوں نے صلح کا مطالبہ کیا اور کسانوں کو زمینوں پر اور مزدوروں کو کارخانوں پر قبضہ کر لینے کے لئے اکسایا۔ اپریل میں جب جرمن ہائی کمانڈ کی مدد سے لینن روس میں داخل ہو گئے اور مئی میں ٹراٹسکی امریکہ سے لوٹ آئے تو انتہا پسند انقلابیوں کی اصل جد و جہد شروع ہوئی۔ لینن نے عارضی حکومت پر فرانس اور انگلستان کا پٹھو ہونے کا الزام لگایا اور مطالبہ کیا کہ حکومت اور ملک تمام تر صلاحیتیں انقلابی کاموں پر صرف کی جائیں۔

سوویٹ نے مطالبہ کیا کہ "بغیر الحاق اور بغیر تاوان کے" جنگ کو فی الفور ختم کیا جائے۔ مئی میں وزیر خارجہ نے استعفٰی دے دیا۔ جنگ

کے محاذ پر روسی افواج کو شکست فاش ہوئی، اندرون ملک اقتصادی حالت بد سے بدتر ہوگئی، اشیاء کے نرخ بہت بڑھ گئے اور مختلف اقوام یعنی پولش یوکرمین اور فن باشندوں نے اپنے حقوق کا مطالبہ شروع کر دیا۔ ملک میں سیاسی بحران پیدا ہوگیا اور کیڈٹ پارٹی کے وزراء نے استعفٰے دیدیا حکومت میں ابھی تک صرف منشویک وزراء تھے مگر وہ زیادہ موثر نہیں تھے اور کسی قسم کا اصلاحی پروگرام نافذ نہ ہوسکا۔

بالشویکوں نے جو انتہا پسند سوویٹوں میں اقلیت میں تھے، ان حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کی۔ عوام کے انقلابی جذبات کا صحیح تجزیہ کرتے ہوئے انہوں نے فسادات اور ہڑتالیں منظم کیں اور بالآخر عوام کو شورش پر اکسایا۔ حکومت نے فوری اقدام اٹھائے۔ لینن روپوش ہوگئے اور ٹراٹسکی کو گرفتار کرلیا گیا۔ پرنس لوف مستعفی ہوگئے اور ان کی جگہ کرینسکی وزیراعظم ہوئے۔

کرینسکی وطن پرست اور قابل انسان تھے لیکن ان میں اتنی بڑائی اور عظمت نہیں تھی کہ وہ انقلاب کے رخ کو موڑ سکتے۔ ان کو فوج کی حمایت بھی حاصل نہ تھی جو جنگ سے عاجز آچکی تھی اور صلح کے کوئی آثار نظر نہیں آتے تھے۔ جرمن افواج پیٹرز گراڈ (پیٹرز برگ) کی جانب بڑھ رہی تھیں کرینسکی کو نہ تو سوویٹ کا تعاون حاصل ہوسکا اور نہ ہی وہ مدافعت کا خاطر خواہ انتظام کرسکے۔ ستمبر میں ان کی شخصیت اور اقتدار کو مزید دھچکہ لگا جبکہ جنرل کارنیلوف (GEN. KORNILOV) نے حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش کی۔ یہ کوشش ناکام ہوگئی اور اس سے انقلابی عناصر کو مزید فائدہ پہونچا۔ ایسے حالات میں عارضی حکومت کے لئے کسی قسم کا اصلاحی کام

کرنا تقریباً ناممکن تھا مگر پھر بھی بہت کچھ ہوا ستمبر میں روس کو جمہوریہ قرار دیدیا گیا، قوم پرستی کے مسئلہ کا جائزہ لیا گیا اور پولش اور فن عوام کو آزادی دی گئی حقوق نسواں، عام رائے شماری اور شہری آزادیوں کے سلسلہ میں قوانین بنائے گئے۔ لیکن سب سے اہم مسائل یعنی جنگ بندی اور زرعی اصلاحات پر توجہ نہیں دی گئی۔ فوجی حالت ابتر ہو چکی تھی اور مملکت کی سالمیت خطرہ میں تھی۔ یہ حالات بالشویک عناصر کے لئے بڑے موزوں اور مناسب تھے۔

سیاسی تنظیم یا قوت کے استعمال کو بالشویک کامیابی کی وجوہات قرار نہیں دیا جا سکتا۔ انہوں نے نہ صرف انقلابی رجحانات کا درست تجزیہ کیا تھا بلکہ وہ روسی عوام کے دو اہم ترین مطالبات یعنی جنگ بندی اور زمینی مسئلہ کا سامنا کرنے اور حل کرنے کو بالکل تیار تھے۔ ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے انہوں نے مزدور پیشہ، فوجیوں اور کسانوں میں حکومت کے خلاف مہم چلائی ادھر کرینسکی سیاسی حقائق سے پردہ پوشی کر رہے تھے۔

ستمبر کے آخر میں انتخابات سے فوراً قبل ہڑتالیں اور زرعی فسادات شروع ہو گئے بالشویکوں نے اس افراتفری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے زمین، بینک اور کارخانوں کو قومی ملکیت میں لے لینے کا وعدہ کیا اور سب سے بڑی بات یہ کہ انہوں نے صلح کا وعدہ کیا اور اس لائحۂ عمل پر انہوں نے سوویٹ انتخابات میں اکثریت حاصل کر لی۔ ٹراٹسکی پیٹروگراڈ سوویٹ کے صدر منتخب ہوئے۔ حکومت کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ بالشویکوں سے تعاون حاصل کرنے کی کوشش

کرے۔ بالشویک لیڈروں نے اپنے "سرخ محافظ" دستے قائم کر لئے اور مسلح افواج میں مزید بداطمینانی پھیلانی شروع کر دی۔ ہزاروں فوجی فرار ہو گئے اور کسانوں نے زمینوں پر قبضہ کر کے قتل و غارت گری شروع کر دی۔

اکتوبر میں لینن پٹروگراڈ واپس آ گئے جہاں دارالحکومت کی حفاظت کا بہانہ کر کے انہوں نے "فوجی انقلابی کمیٹی" کی تنظیم کی جس نے جنرل اسٹاف کے اختیارات سلب کر لئے۔ انہوں نے پٹروگراڈ کے قلعہ اور دوسرے اہم مقامات پر قبضہ حاصل کر لیا۔ اس کے بعد انہوں نے مسلح بغاوت کی تیاریاں شروع کر دیں۔ کرینسکی نے اب تدابیری اقدامات اٹھانے کی کوشش کی مگر پانی سر سے گذر چکا تھا۔ ۲۵ر اکتوبر کو لینن نے حکومت کا تختہ الٹ دیا اور "سوشلزم کی فتح" کا اعلان کر دیا۔

سلسلہ وار ترتیب تاریخ

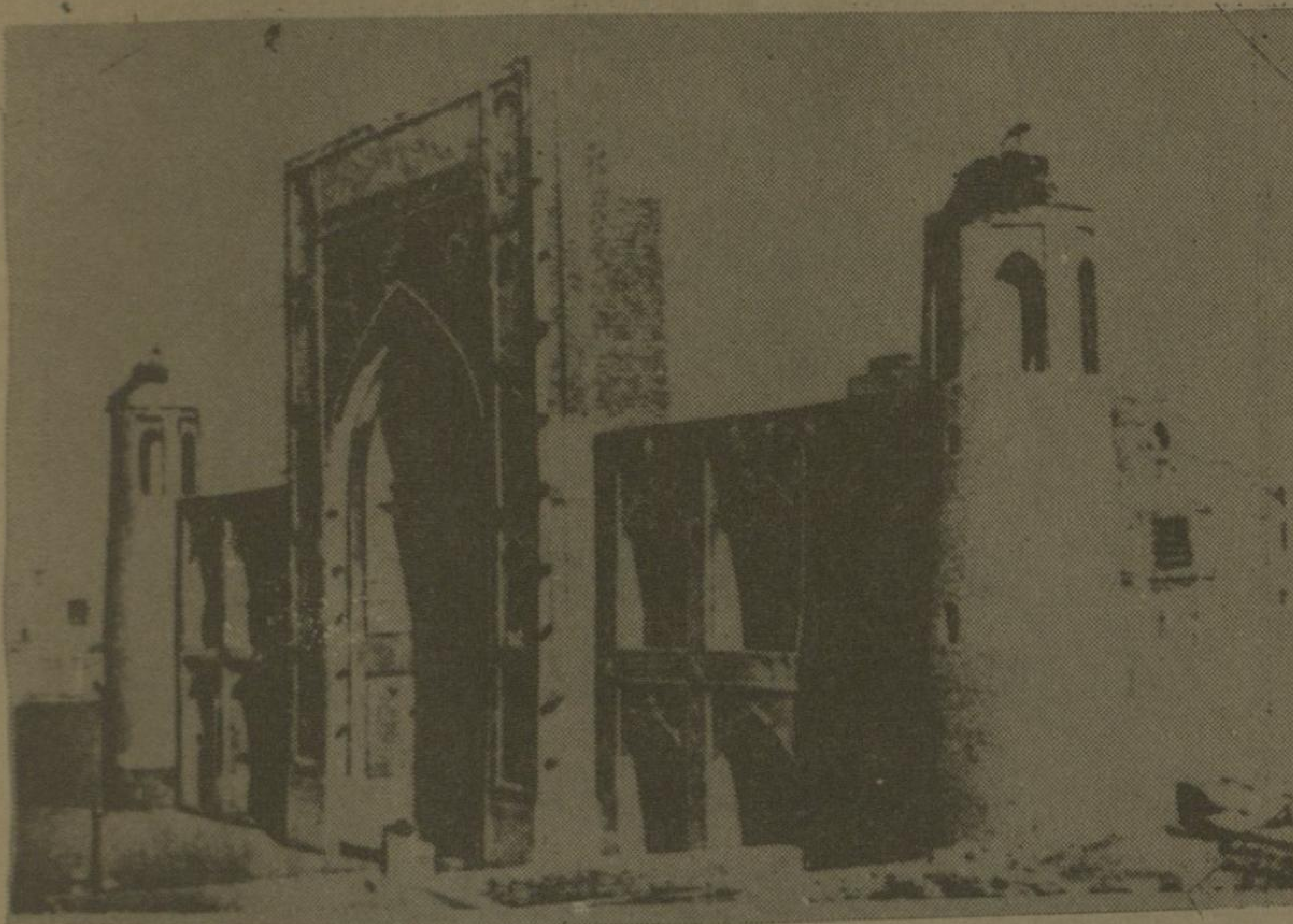
۱۵۵۲ء	قازان خانیت پر روسی قبضہ۔
۱۵۵۶ء	استراخان پر روسی قبضہ۔
۱۷۸۳ء	کریمیا پر روسی قبضہ۔
۱۸۳۰ — ۱۸۵۹ء	شیخ شامل کی قیادت میں داغستان کی جد وجہد آزادی۔
۱۸۵۹ء	شمالی قفقاسیہ پر روسی حملہ اور شیخ شامل کی گرفتاری۔
۱۸۶۵ء	تاشقند پر حملہ۔
۱۸۶۶ء	خوجند پر روسی قبضہ۔
۱۸۶۸ء	بخارا کا روسی حاکمیت کے تحت آنا۔
۱۸۷۳ء	خیوا کا روسی حاکمیت کے تحت آنا۔
۱۸۸۰ — ۱۸۸۴ء	ترکمنستان پر روسی قبضہ۔
۱۹۰۴ — ۱۹۰۵ء	جاپان کے ہاتھوں روس کی شکست۔
۱۹۰۴ — ۱۹۰۵ء	روس کا پہلا انقلاب۔
۱۹۰۴ء	باکو میں اسٹالن کے ایما پر مسلم سوشل ڈیموکریٹ

	پارٹی "ہمت" کا قیام۔
مارچ ۱۵ اگست	قازان میں علماء، صنعت کار، قانون دان اور ممتاز مسلمانوں کا ابتدائی اجتماع۔
۱۵ اگست	میلہ نزنی نوودگراڈ کے دوران "ہوٹل جرمینیا" میں پہلی "کل مسلم کانگرس" کا انعقاد۔
۱۹۰۶ جنوری	پیٹرز برگ میں دوسری "کل مسلم کانگرس" کا انعقاد اور "اتفاق" کا قیام۔
اگست	نزنی نوودگراڈ میں تیسری "کل مسلم کانگرس" کا انعقاد۔
۱۹۱۲—۱۹۱۱ء	باکو میں محمد امین رسول زادہ کی قیادت میں "مساوات" پارٹی کا قیام۔
۱۹۱۴- اگست	پہلی جنگ عظیم کا آغاز۔
۱۱ ستمبر	اسمٰعیل بے گیسپرالی کی رحلت
۱۹۱۵ء	قسطنطنیہ میں یوسف آقچورا کی قیادت میں "مجلس برائے تحفظ حقوق ترک و تاتار" کا قیام۔
۱۹۱۶ء جون	فوج میں مسلمانوں کی جبری بھرتی کا فرمان اور خوجند جزاخ میں خونریز فسادات۔
۱۹۱۷ء فروری/مارچ	پیٹروگراڈ میں بغاوات کا آغاز۔

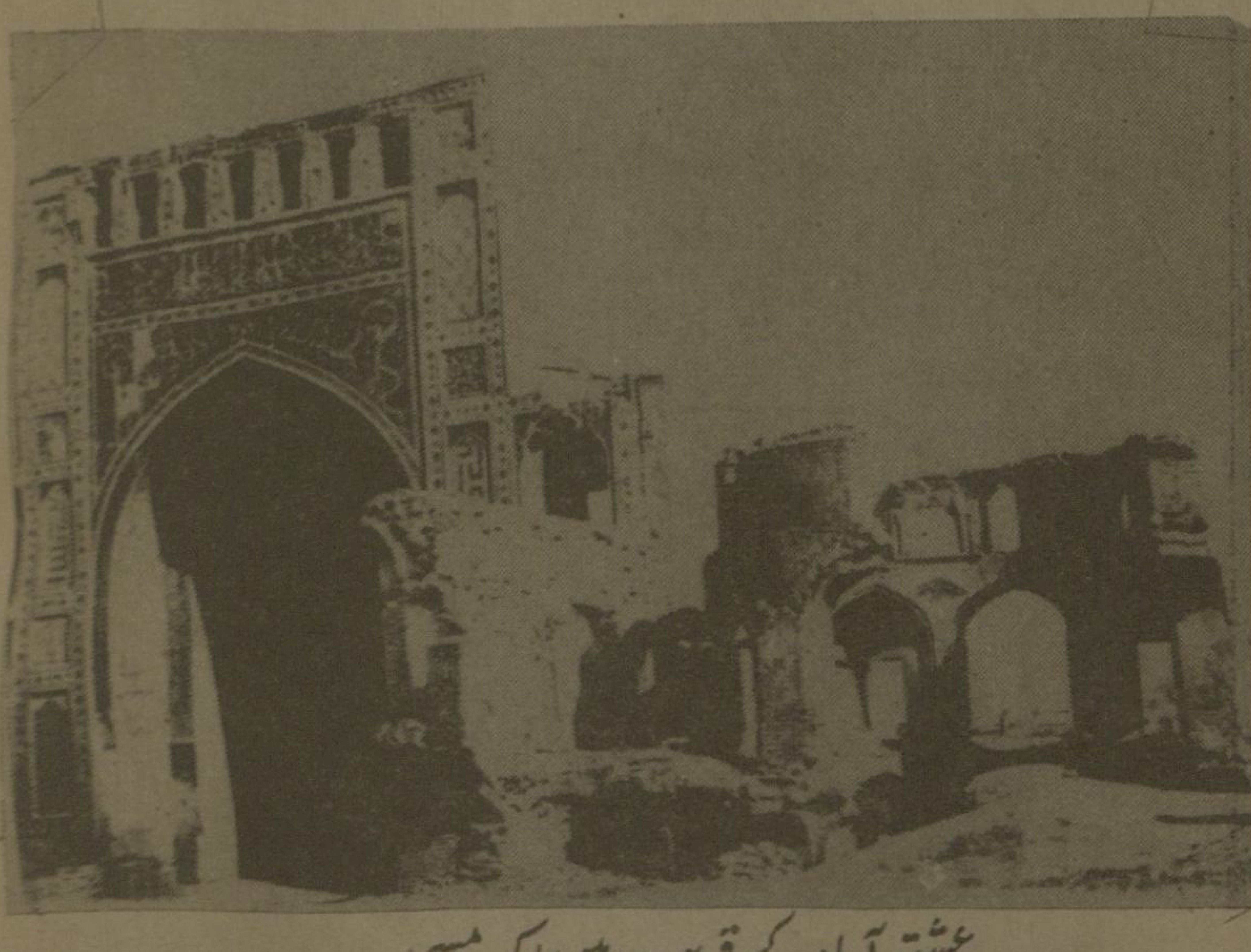
مارچ	زار نکولس دوم کی تخت سے دستبرداری۔
۷ا-۱۵ا مارچ	پٹیرو گراڈ میں دوما کے مسلمان مندوبین کی کانفرنس
۸-۱۴ر اپریل	تاشقند میں مسلمانان وسطی ایشیا کی پہلی کانفرنس۔
۷ر اپریل	باغچہ سرائے میں کریمیا کے مسلمانوں کی کانفرنس۔
۱۵ر اپریل	قازان کے مسلمانوں کی عام کانفرنس۔ "ملی مرکز" کا قیام۔
۱-۱۱ر مئی	مفتی موسیٰ جار اللہ کی صدارت میں ماسکو میں "مسلمانان روس کی پہلی کانگرس" کا انعقاد۔ نوسو مندوبین کی شرکت۔
۲۱-۳۱ر جولائی	قازان میں "مسلمانان روس کی دوسری کانگرس" دینی کانفرنس کا انعقاد۔ حربی شوریٰ کا انعقاد
۲۲ر جولائی	قازان میں "اندرون روسیا و سائبیریا کے ترکی تاتاری ملی۔ مدنی خود مختاری و" ایدل۔ اورال جمہوریت" کا اعلان۔
۳ر ستمبر	مسلمانان وسطی ایشیا کی دوسری کانفرنس۔
اکتوبر	بالشویک انقلاب۔ اوفا پر سوویٹ افواج کا قبضہ
۱۵ر نومبر	تاشقند میں مسلمانان وسطی ایشیا کی تیسری کانفرنس۔ ذکی ولیدی کی قیادت میں باشقیریا کی خود مختاری کا اعلان۔
۲۵ر نومبر	خوقند میں مسلمانان وسطی ایشیا کی چوتھی کانفرنس۔

۲۷ر نومبر	ترکستان کی خود مختاری کا اعلان ۔
۳ر دسمبر	لینن اور اسٹالن کا ترک عوام کے نام پیغام
۴ر دسمبر	اوفا میں ایدل ۔ اورال قومی مجلس کا افتتاح ۔
۶ر دسمبر	فن لینڈ کا اعلان آزادی ۔
۱۰ر دسمبر	ترکستان کا اعلان آزادی
۱۱ر دسمبر	لتھونیا کا اعلان آزادی
۱۹۱۸ - ۱۹۱۷ء	بصماچی تحریک کا آغاز
۱۹۱۸ء	
جنوری / فروری	سوویٹ جمہوریہ باشقیریا کا قیام ۔ اورن برگ پر سوویٹ افواج کا قبضہ ۔
۱۲ر جنوری	لٹویا کا اعلان آزادی ۔
۲۲ر جنوری	یوکرین کا اعلان آزادی
۱۹ر فروری	خوقند پر اشتراکی افواج کا قبضہ ۔
۲۴ر فروری	اسٹونیا کا اعلان آزادی ۔
مارچ	بخارا پر اشتراکی افواج کا حملہ اور پسپائی
۳ر مارچ	صلح نامہ برسٹ لٹوسک (BREST-LITOVSK)
۳۱ر مارچ	اشتراکیوں کے ہاتھوں مسلمانان باکو کا قتل عام
اپریل	باکو پر افواج عثمانیہ کا قبضہ
۱۵ر مئی	مسلمان اشتراکیوں کی پہلی کانفرنس
۲۸ر مئی	آذربیجان کا اعلان آزادی
۲۰ر جون	قازان میں مسلم کمیونسٹ پارٹی کا قیام ۔

نومبر	پہلی جنگ عظیم کا خاتمہ
	ماسکو میں کُل مسلمانان روس کمیونسٹ پارٹی کا اجلاس۔ ۴۶ ممبروں کی شرکت۔
۷ر دسمبر	آذربیجان کی قومی مجلس کا افتتاح
۱۹۱۹	
نومبر	مسلمان اشتراکیوں کی دوسری کانفرنس "خصوصی کمیشن برائے ترکستان" کا تقرر۔
۱۹۲۰ء	آذربیجان کی آزادی کا خاتمہ
مئی	خود مختار تاتار سوویٹ سوشلسٹ جمہوریہ کا قیام۔
۲۹ر اگست	تسخیر بخارا۔
۲۰ر ستمبر	باکو میں "عوام مشرق کی کانگرس" کا انعقاد۔
۱۹۲۴ء	ترکستان کی وحدانیت کا خاتمہ اور ازبکستان، قرغیزستان، ترکمانستان اور تاجکستان کا قیام۔



مدرسہ عبداللہ خاں بخارا

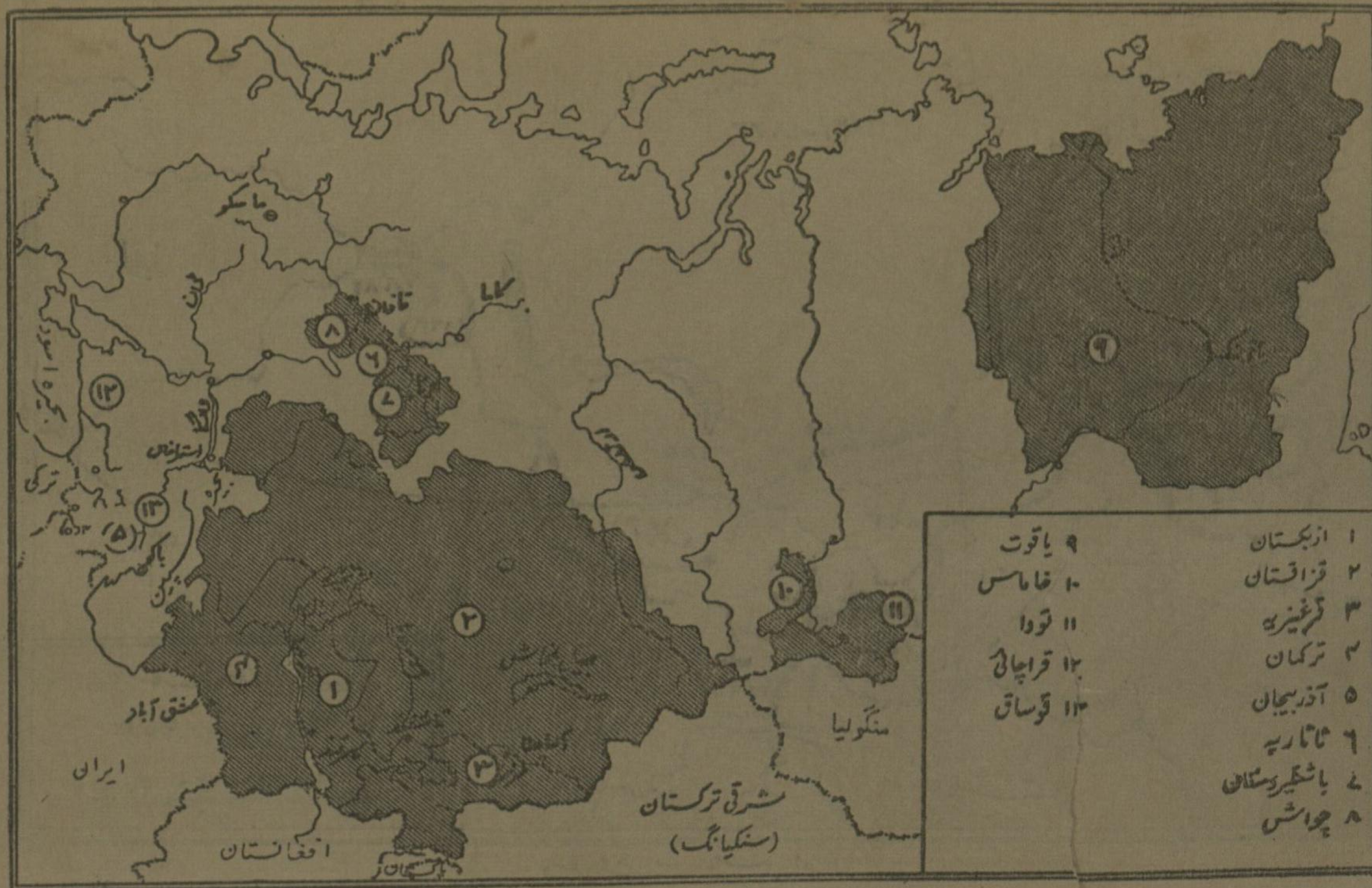


عشق آباد کے قریب میں ایک مسجد

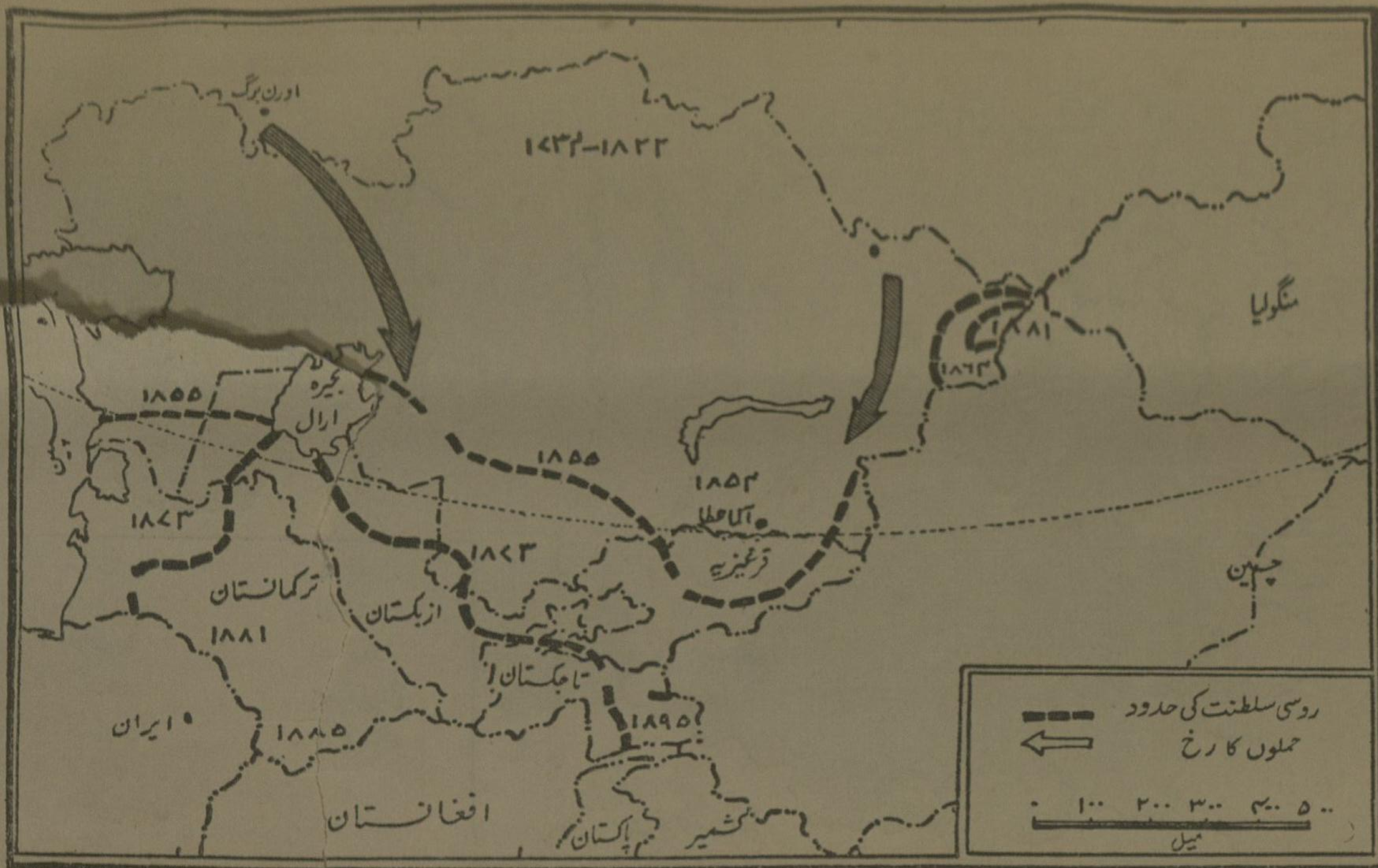
کتابیات

Abbot, A.F.	Turkey in Transition (London, 1909)
Bailey, F.M.	Mission to Tashkent (London, 1946)
Barthold, V.V.	Four Studies on the History of Central Asia (Leiden, 1956)
Birge, T.K.	Guide to Turkish Area Studies (Washington, 1949)
Blacker, L.V.	On Secret Patrols in High Asia (London, 1922)
Brun, A.	Troublous Times - Experiences in Bolshevik Russia and Turkestan (London, 1931)
Buxton, C.R.	Turkey in Revolution (London, 1909)
Caroe, O.	Soviet Empire - The Turks of Central Asia and Stalinist Russia (London, 1953)
Carr, E.H.	The Bolshevik Revolution (London, 1950)
Chokaev, M.	"The Basmaji Movement in Turkestan" The Asiatic Review (London, XXIV 1928)
Chokaev, M.	"Fifteen Years of Bolshevik Rule in Turkestan" (Jarcs. XX. 1933)
Coates, W.P. & Zelda	Soviets in Central Asia (London. 1951)
Curzon, Lord	Russia by Daylight (London, 1889)
Czaplicka	The Turks of Central Asia (Oxford, 1918)
De Quincey	Revolt of the Tartars, Essays
Gibb, H.A.R.	Whither Islam (London, 1932).
Gibb, H.A.R.	Mohamedanism (New York, 1957)
Gibb. H.A.R. & Harold Bowen	Islamic Society and the West, I-II (London, 1950-1957)
Heyd, U.	Formation of Turkish Nationalism (London, 1950)
Hostler, C.	Turkism and the Soviets (New York, 1957)
Hudson, A.E.	Kazak Social Structure (Yale University, 1938)

Torro, G.	The Soviet Union (London, 1950)
Khanykov, N.V.	Bokhara - Its Amir and its People (London, 1945)
Kirk, George	Short History of Middle East (London, 1948)
Kolarz, W.	Russia and her Colonies (London, 1953)
Lenin, V.I.	"On the Right of Nations to Self Determination" Collected Works, Vol. IV
Lorrimer, F.	The Population of the Soviet Union - History and Prospects (Geneva, 1946)
Mandel, W.	The Soviet Far East and Central Asia (American Institute of Pacific Relations, 1949)
Olbeg, P.	"Russian Policy in Turkistan" Contemporary Review, CXXII, 1922 (London)
Pipes, R.	Formation of the Soviet Union (Cambridge, 1954)
Polovtseff, A.	The Land of Timur (London, 1932)
Schuyler, E.	Turkistan (New York, 1376)
Skrine & Ross.	The Heart of Asia (London, 1899)
Stalin, J.	Marxism and National and Colonial Question (1942)
Vambery, A.	A History of Bokhara (London, 1873)
Vambery, A.	Travel in Central Asia (New York, 1895)
Vernadsky, G.	History of Russia, I-III (New Haven, 1949-1954)
Wurm, S.	Turkish People of the USSR (London, 1954)
Yan, V.	Jenghiz Khan (London)
—	Encyclopedia of Islam (Leiden, 1913-1938)
—	History of Communist Party. (Edited by Central Committee, 1938).



سوویٹ یونین میں ترک اکثریت کے علاقے



وسطی ایشیا میں روسی یلغار


THE SOVIET SOCIALIST REPUBLICS OF KAZAKHSTAN, KIRGIZIYA, TADZHIKISTAN, UZBEKISTAN AND TURKMENISTAN
50 0 50 100 150 Kilometres
50 0 50 100 Miles
International Boundaries
Boundaries of Union Republics
Boundaries of Autonomous Republics, Oblasts & Krays
Railways
Railways under construction or projected
Main roads
Canals
Sand
Towns with population over 300.000
100.000 to 300.000
50.000 to 100.000
10.000 to 50.000
under 10.000
TASHKENT Capital of Union Republics
ARAL SEA
CASPIAN SEA
KAZAKHSTAN
TSELINNYY KRAY
SOUTH KAZAKHSTAN KRAY
WEST KAZAKHSTAN KRAY
KARA-KALPAK A.S.S.R.
TURKMENISTAN
TADZHIKISTAN
GORNO-BADAKHSHAN
AFGHANISTAN
SINKIANG
ISSYK KUL
Karaganda
Tselinograd
Alma-Ata
Tashkent
Dzhambul
Frunze
Ashkhabad
Mashhad
Samarkand
Bukhara
Stalinabad
Yarkand
Aksu
Uch-Turfan
J.F. 1964
CENTRAL ASIAN RESEARCH CENTRE, 66A KING'S ROAD, LONDON, S.W.3. - 1964